بِسمِ اللّٰہِ الرَّحمٰنِ الرَّحِیم

حکمتِ فروغِ کُن

جلد اوّل

افکارِ وَاذکار

حضرت بابا محمّد عُبیدُ اللہ دُرّانیؒ

قادر نگر، پیر بابا، سوات

مولّف:

وِلیّ الدّین

حکمتِ فروغِ کُن (جلد اوّل)

طابع اوّ : ایک ہزار ۱۹۹۴

طابع : فائن بکس پرنٹرز، لاہور

ناشر: فیضِ قادر، قادر نگر، پیر بابا، سوات

پیش کش: ڈاکٹر مریم جمیلہ و نیاز مندان

پیش لفظ

قلم سرنگُوں ہے اور چشم پُرنم، ذہن میں خیالات کا ہجوم کہ اِس گنجِ گراں مایہ، حِکمتِ فروغِ کُن، کو قارئین سے کیسے متعارف کرایا جائے۔ ایک عاجزانہ سعی ہے جسے لفظوں کا جامعہ پہنا کر صفحۂ قرطاس پر منتقل کیا جارہا ہے اِس شدید احساس کے سَاتھ کہ کہیں یہ کاغذی پیرہن نقشِ فریادی بن کر نہ رہ جائے۔

زیر نظر کتاب حِکمتِ فروغ کُن، جلد اوّل، اسم با مُسمّٰی ہے کہ اسکے پڑھنے سے فرسودہ ذہن ذہنِ رسا میں بدل جاتے ہیں اور زنگ آلود دِل اور مردہ رُوحیں جِلا پاتی ہیں۔ یہ ارتقاء باطن کی ایک منفرد تفسیر ہے جسکا ہر لفظ قلبی اور رُوحانی واردات سے عبارت ہے۔ یہ کتاب بابا دُرّانیؒ کے ان کتابچوں سے مرتب ہے جو مختلف عنوانات کے تحت ۱۹۴۱ء سے ۱۹۸۶ء کے عرصہ میں شامِل ہوئے۔ اس بصیرت افروز رُوحانی مُرقع کی پہلی جلد میں ۱۵ مضامین شائع کئے گئے ہیں اور اُن کی ترتیب تاریخِ اشاعت کے لحاظ سے رکھی گئی ہے کہ رُوحانی ارتقاء کے نقوش قارئین کے دِلوں پر ثبت ہو سکیں۔ کہیں ایک آدھ جگہ مضمون کی مناسبت سے اِس ترتیب سے انحراف بھی کیا گیا ہے۔

اللہ کا احسان ہے کہ بابا دُرانیؒ کے وصال کے بعد اِس عاجز کو یہ تیسری پیشکش کرنے کی سعادت نصیب ہوئی ہے۔

باباجان کے وصال کے بعد ولی بھائی نے اپنی صحت کے پیش نظر اشاعت کا یہ کام اس عاجز کے سپرد کر دیا۔ ہر چند کہ یہ کام میری استطاعت سے باہر ہے مگر مالک کے کرم 'ولی بھائی کی ہر آں اعانت اور جمعیت کی دعاوں اور تعاون سے اشاعتِ کتب کا یہ سلسلہ جاری ہے اور انشاءاللہ آئندہ بھی جاری رہے گا۔

اس کتاب کے مصنف بابا درانی صاحب کے لیے تعارفی کلمات لکھنے جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔ آپ کے جاننے والے بہت ہیں مگر پہچاننے والے کم، آپ دنیاوی اعتبار سے علیگڑھ، انجنیئرنگ کالج کے سابق پروفیسر اور سابق پرنسپل انجنیئرنگ کالج پشاور اور ایک منفرد اور شافی ہومیوپیتھ کے بطور جانے جاتے رہے ہیں۔ رُوحانی سطح پر آپ اس صدی کے دو اولیاؤں، بابا تاج الدینؒ، اور بابا قادر کا فیضِ بیکراں سمیٹے ہوئے سالکانِ طریقت اور گدایانِ محبت کے

لیے ایک سایہ دار شجر کی طرح تھے جن کی حیاتِ مبارکہ کا مقصد احیائے اسلام رہا۔ خود آئینہ حق بنے۔ دَردِ اُمّت کی تڑپ لیے اپنے شکستہ جسم کے ساتھ ایک ازلی مسکراہٹ چہرے پر سجائے اپنے ارادتمندوں کے دِلوں کو حق اِشنا کرتے رہے۔ کبھی حلاوت کلام سے کبھی مہر نظر سے۔

یہ اللہ کا احسان ہے کہ آپ کی ذات میں، اِس مادّی دور میں بھی قافلہء حق کے لیے ایک عاشقِ رُسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم، صاحبِ وقت، صاحبِ نظر، ترجمانِ حق، اکملّیت کے مقام پر فائز ولی اللہ میسّر آئے۔ بابا دُرانیؒ سراپا مجز و نیازِ بندگی، سراپا دُعا و کرامت، سراپا خدمت و فیض، دنیا و دین کا میزان قائم رکھے ہوئے تھے کہ میزان حُسن ہے۔ یہ فیضانِ کثیر کی حد دیکھیں کہ جذب میں آکر انگریزی میں فرمایا کہ

'What ever is left of me ;Let me give it out to people.

میرا جو کچھ باقی رہ گیا ہے وُہ بھی لوگوں کو دے ڈالوں" (نعلینِ مُبارک صفحہ ۲۷) اسی خیرِ و کثیر کے جذبہ کے تحت بابا دُرانیؒ نے جذب و سلوک کی حالت میں قلبی واردات کو کتابچوں کی صُورت بخشی، زمین جب اپنے اندر کا لاوا اُگلتی ہے تو اس میں سے قیمتی جواہر اور مادّہ کا ایک ذخیرہ دستیاب ہو جاتا ہے۔ بابا دُرانیؒ ایک باہوش قلندر کے فکر و نظر کا یہ قیمتی سرمایہ کتابی شکل میں پیش کیا جارہا ہے کہ یہ ورثہ اصلاف کی رُوحانی احتیاج پُوری کرتا رہے۔ اب یہ قاری پر منحصر ہے کہ حسبِ قلبِ طیّب اِس سے روحانی پرورش کا سامان ڈھونڈ نکالے۔ اِن ارشادات میں کچھ عام فہم ہیں۔ کچھ خاصُ الفہم ہیں اور کُچھ اِس سے بالاتر کہ جہاں خِرد کا کوئی مقام نہیں، ایک بار پڑھنے سے تو صرف زبان ہی رواں ہوتی ہے، مگر بار بار پڑھنے سے قلب و نظر روشن ہوتے جاتے ہیں اور پھر قاری اپنے آپ کو اِسی بحرِ بیکراں کی موجوں کے ساتھ رواں پاتا ہے۔ اور یہی بابا دُرّانیؒ کا صدقہ جاریہ ہے۔

ظاہر کے شور میں باطن کی سرکوشیاں سُننے والوں کے لیے حکمتِ فروغ کُن پیغام دے رہی ہے ایمانِ محکم کا، عشقِ رسُولؐ کا، دردِ اُمت کا، جمعیت بندی کا اور جہاد کا۔

یہ جمعّیت کا زمانہ ہے کہ 'من و ساقی بہم سازیم' کے بغیر بارانِ رحمت کی اُمید عبس ہے یہی عمل کی متحرک قوت ہے۔ بھاری پتھر اُٹھانے کے لیے سب کہ مِل کر ہی حَیّ کہنا ہے۔ اُمّت کے غم میں بہایا ہوا ہر آنسو ابرِ رحمت کا ضامن ہے اور یہی رحمت کو دعوت دینے کا عاجزانہ طریقہ ہے کہ

؎ فرد قائم ربطِ ملّت سے ہے تنہا کُچھ نہیں

موج ہے دریا میں اور بیرونِ دریا کُچھ نہیں

اس دارالعمل کی بنیاد عشق پر رکھنی ہے۔

علم ہے ابن الکتاب عشق ہے اُمّ الکتاب

ایمان محکم ہو، سادہ بدوں جیسا فدا ہو جانے والا عشقِ رُسولؐ ہو، سر میں جہاد کا سودا ہو تو پھر بازوئے جبرُوت عطا ہوتا ہے۔ اور فتحِ مُبین مقدر بن جاتی ہے۔ یہی وقت ہے اُمتی ہونے کا نذرانہ بھی پیش کرنا ہے اور شکرانہ بھی۔

مُصطفٰےؐ برسان خویش کہ دیں ہمہ اوست

گر یہ اُو نہ رسیدی تمام بُولہبی است

ڈاکٹر مریم جمیلہ

بِسمِ اللہِ الرّحمٰنِ الرّحِیم

حکمتِ فروغ کن

تمہید

ارشاد باری تعالیٰ ہے:" جسے حکمت عطا ہُوئی اسے خیرِ کثیر عطا ہوئی"۔

اسلام کا یہ فیضانِ امر کُن دُوسرے مذہب والوں کو حاصل نہیں، اسلئے کہ یہ وہ نُور وہ دولتِ سرمدی ہے جو سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے طفیل حاصل ہُوئی اور سینہ بہ سینہ فقراء کے باطن میں چلی۔ اسی کے سہارے امرِ کُن کا اجراء اپنے اپنے زمانہ میں آمرینِ حق کے سُپرد ہوتا رہا اور اس طرح اُمت کی حیات کے قائم رکھنے کے سامان ہوتے رہے۔ امرِ الٰہی کے اجراء کا وسیلہ بننے کے لیے یہ علمِ لَدُنّی اور اذن ہی سب کُچھ ہے۔

حیاتِ قادرؒ میں ارشاد ہے کہ بابا تاج الدینؒ نے بابا قادر اولیاء کو انکی بیس اکیس سالہ جوانی کے ناگپور کے مختصر قیام کے دوران ایک بشارت میں کتابوں سے بھری الماریاں اور چابیاں دی تھیں اور فرمایا تھا کہ کھولو۔ جب قادر اولیاؒ نے قفل کھولے تو ایک الماری کتابوں سے بھری تھی اور دوسری میں دو خانے خالی تھے۔ قادر باباؒ نے محسوس کیا کہ کوئی انہیں جگا رہا ہے اور کہہ رہا ہے "جو کُچھ تُم نے دیکھا حق ہے اور یہ خالی خانے تمہیں بھرنے ہیں۔

پھر ان خانوں کو عالمِ مثال میں بھرنے بابا قادرؒ پُورے اکیس سال جذب کی کملی اوڑھ کر وجیا نگر (ہند) کے پہاڑوں میں جا بیٹھے تھے۔ اس طرح آئندہ زمانوں تک کے لیے ان منازل کی تکمیل، تائیدِ ربّی سے بابا تاجؒ بابا قادرؒ اور دُرّانی کی زندگیوں میں ہو جانا قرار پائی تھی۔

کاملین ایک ہی شمسِ حقیقتصلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تابانی لیے تھے۔

فیضِ قادر پبلیکیشنز کی اس اشاعت کے بعد بابا صاحب کے برسہابرس کی صوفیانہ نشستوں کی ڈائری (داستانِ فقر) لال کتاب اور مختلف لوگوں کے جمع کردہ ارشادات پیش کرنے کا کام ہو سکے گا جس کے لیے نہ صرف موجودہ جمعیت بلکہ اگلے زمانوں کے طالبین بھی حقدار ہونگے۔

دولتِ سرمدی اور حکمت کا یہی خزینہ بابا دُرّانی کی ذاتِ مُبارک سے امرِ کُن فیکُون کے اجراء کا ذریعہ بنا ہے۔ (ملاحظہ ہو بابا دُرّانی کی ذاتِ قادر، کُن فیکُون اور چار اسلام اور انکی اپنی حیاتِ مُبارکہ پر لکھی ہُوئی کتاب دُرِّ عینی اور اسکا تتمّہ نعلینِ مُبارک تک)

جذب وسلوکِ قلندر باہوش کی منازل سے بابا تاجؒ بھی گزرے تھے اور بابا قادرؒ اور بابا دُرّانیؒ بھی، البتّہ ان باطنی و مقاماتِ قُرب کو سُپردِ قلم کرنا دُرّانی کے ذمہ تھا۔ بابا دُرّانیؒ قلندر باہوش صاحبِ حکمت و دانش، صاحبِ علم لَدُنّی نے موجودہ اور اگلے زمانوں پر احسان فرمادیا ہے کہ حکمتِ فروغ کے ذریعے طالبین، سالکین اور مجذُوبین کی رہنمائی کر دی ہے۔

فرمایا: "کُن فیکُون کو اُبلنا ہے چشموں کی طرح لوگوں کے قلوب سے چودھویں صَدی کے جو نقشے تھے سب لپیٹ دیئے گئے۔ اب نئی دنیا بننی ہے۔ خدا کرے یہ 'اللہ بم، لوگوں کے قلوب میں پھٹے"۔

حکمتِ فروغِ کُن کی فہم و دانش خیرِ کثیر و حکمت کے لیے اس سے بہتر کوئی صورت نہ تھی کہ ان تمام منازل کو ایک کتابی شکل دیدی جاتی جو صرف ایک جذب کی حالت میں روشن ہُوئی ہیں۔

حیاتِ قادر 'منبع نُور تک رسائی ہے۔ کُن فیکُون دینِ محمدی کا باطنی نچوڑ ہے۔ 'چار اسلام' بابا دُرّانیؒ نے بابا تاجؒ اور بابا قادرؒ، دونوں بزرگوں سے ارتقائے باطنی اور فیض امرِ ربّانی حاصل فرمایا تھا۔ بابا قادر کی اگلی اکیّس سال جذب کی

زندگی اور پھر اگلے اکیس سال حکم کُن فیَکُون کا دور اس کی تفسیر ہے۔ پھر بابا قادرؒ نے بابا محمد عبُداللہ دُرانیؒ کو اپنے سایہء عاطفت میں جذب و غم اُمّت کے ایک طویل دور سے گزار کر علمِ لَدُنّی اور خیرِ کثیر کا سبق ان کی اپنی ذات میں دوہرا دیا۔ اور یہ فرما کر کہ جو تُو ہے وہی میں ہُوں' اس حقیقت پر مُہرِ تصدیق ثبت کر دی کہ تینوں منازل نبوت تک ارتقائے باطن ہے۔ اسکے بعد ذات تک رسائی کے لیے صاحبان امر کُن کی اعانت کے لیے اَن کہی باتوں کی نشاندہی بھی کر دی ہے تا کہ ان پوشیدہ خزانوں کا کُچھ اندازہ لگا سکیں جو حاملانِ نُورِ محمدی کو عطا ہوتا ہے اور اس رمز کو پالیں کہ علمِ لَدُنّی اور عطائے اذن کے بغیر اس امرِ کُن کو زمانے کا رُخ دینے کا ذریعہ بنانا ممکن نہیں۔ اللہ کا کرم ہے کہ

بابا دُرّانیؒ کی جمعیت نے بابا دُرّانیؒ کے ارشاداتِ گرامی کو حکمتِ فروغِ کُن کے عنوان سے دو جلدوں کی شکل کرنے کا اہتمام کیا ہے تا کہ یہ بیش بہا خزانہ آنے والے آمرینِ حق کے لیے دسترسِ زمانہ سے محفوظ رہے۔

ولیّ الدّینَ

فہرست

نمبر شمار	مضمون		صفحہ
۱	پیش لفظ		
۲	تمہید		
۳	باب ۱	چودھویں صدی	۱ تا ۲۲
۴	باب ۲	بیازِ بے نیاز	۲۳ تا ۴۰
۵	باب ۳	صبحِ اسلام	۴۱ تا ۶۸
۶	باب ۴	ہم کیا کریں	۶۹ تا ۸۹
۷	باب ۵	فراستِ مومن	۹۰ تا ۱۱۲
۸	باب ۶	سَالارِ زمان	۱۱۳ تا ۱۳۵
۹	باب ۷	اَموَاجُ الاسماء	۱۳۶ تا ۱۵۳
۱۰	باب ۸	نجمُ الثّاقبِ اُمّت	۱۵۴ تا ۱۷۰
۱۱	باب ۹	غمِ اُمّت	۱۷۱ تا ۱۸۰
۱۲	باب ۱۰	مِیں کیا کروں	۱۸۱ تا ۲۰۶
۱۳	باب ۱۱	رُخسارِ دوست	۲۰۷ تا ۲۲۱
۱۴	باب ۱۲	مادّیت کے دجال پر ضربِ کاری	۲۲۲ تا ۲۴۱
۱۵	باب ۱۳	فتحُ الدَّھر	۲۴۲ تا ۲۵۳
۱۶	باب ۱۴	ذہین و فطین امیر خُسرو	تا ۳۰۰
			۲۵۴
۱۷	باب ۱۵	دُعا	

باب ۱

چودھویں صدی

(ہوتا ہے جادہ پیما اب کارواں ہمارا)

چودھویں صدی ومابعد

ایک روایت ہے حضور اکرمؐ نے تیرھویں صدی تک کے حالات کی لوگوں کو خبر دی اور چودھویں صدی کا ذکر آیا تو خاموش ہو گئے۔ ایک ضعیف حدیث یہ بھی ہے کہ چودھویں صدی کے لئے فرمایا 'میں خود آئوں گا۔ مہدی آخرُالزمان کی بابت بھی لوگوں کا خیال ہے کہ تشریف لاکر اسلام میں نئی رُوح پھونکیں گے اور حرم میں اذان دیں گے۔ اگر عقائد کو باطن کی طرف سے منسوُب کریں تو کُنْ فَیَکُوْن جاری وساری ہے۔ نورِ محمدیؐ سلسلۂ جاریہ ہے اور حرمِ دل عالم میں مہدیؑ اذان بھی دے چکے ہیں۔

حضور بابا قادر اولیاءؒ (وزیانگرم جنوبی ہند) نے فرمایا لوگ کہتے ہیں کُلُّ شَیْءٍ ذَاہِقَۃُ الْمَوت۔ فقیر کہتا ہے، کُلُّ شَیْءٍ ذَاہِقَۃُ الْاِسْلَام۔ حقیقت بھی یہی ہے کہ یہ اتنا پیارا زمانہ ہے کہ آپ کے پاس اگر کوئی چیز ہے تو اس کو قبُول کرنے کے لئے بہت سے قلب تڑپ رہے ہیں۔ لوگ اس زمانہ کو بُرا زمانہ کہتے ہیں۔ بہ نسبت دو صدی پہلے کے آج بھی فاسق وفاجر مسلمان تک میں اس نامِ محبوبؐ کی لاج رکھنے کے لئے بے پناہ جوش ہے۔ یہ جوہر کسی دُوسری قوم میں نہیں۔ اس والہانہ محبت کا عبادت سے قطعی تعلق نہیں۔ یہ ایک جزبۂ لطیف ہے۔ اسی قسم کی لطافتوں پر اگر نظر رکھی جائے تو صلاحیتوں کے اعتبار سے یہ زمانہ بھی بہت بہتر زمانہ ہے۔ یہ عین اصولِ فطرت ہے کہ جتنی تاریکی زیادہ ہوتی ہے اس میں دُھندلی سے دُھندلی لو بھی شمع درخشاں دکھائی دیتی ہے۔ اس لحاظ سے آج جس کو بدترین زمانہ کہتے ہیں وہی بہترین زمانہ بھی ہے کہ آج ذرا سی حرکت 'باطن اور ظاہر کی' وہ گل کُھلاتی ہے کہ مذبذب ایمان بھی قوت پکڑتے جاتے ہیں۔ اب تقاضا ہے کہ بظاہر نام لیوا 'مسلمان کی اِصلاح کی جائے۔ یہ کٹھن بات ضرور ہے اس لئے کہ ظاہری تعلیم اور رُشد و ہدایت سے کام نہیں بن سکتا۔ وہ دور ختم ہو گیا۔ ظاہر کا خول ہی خول رہ گیا ہے۔ اور باطن بھی بالکل گل ہو چکا ہے۔ اسکی مرمت نہیں ہو سکتی۔

فقیر انُ متی کا کام

اب تو قلُوب پر روشنی کی تجلی دینے سے ہی کام بن سکے گا اور یہ کامل فقراء کا کام ہے کہ باطن سنواریں 'کیونکہ فقراءاُمت کے اعصابی نظام کی طرح ہوتے ہیں۔ یہ ٹھیک ہو جائیں تو باقی نظام خود ترتیب پا جاتا ہے۔ رہی یہ بات کہ اللہ کی مشیّت یہی ہے 'اس میں کس کو دخل 'تو دل نہیں مانتا کہ

اللہ کی مشیّت یہی ہے کہ تباہی ہو' بربادی رہے۔ اللہ کی مشیّت اور بندہ کی مشیّت میں فرق ہونا چاہیے۔ اللہ تو بے نیاز ہے صَمَد ہے۔ مگر وہ اپنے خاص احسان سے اپنے اولیاء کو نوازتا ہے۔ اسی لئے کہا جاتا ہے کہ فقراء آمِر باللہ ہوتے ہیں اور فقیر کے ساتھ امر شامل ہوتا ہے۔ امر کیا ہے کُنْ فَیَکُوْنُ۔ یہی بات ہے کہ عارف باللہ کی بسم اللہ کُن فیکُون ہوا کرتی ہے اور اُمّت کا مسئلہ کُن فیکُون کہنے والے سے ہی حل ہوتا ہے۔ یہ فقیر وہ ہوتا ہے جو انا اُمتّی کہہ سکنے کا حقدار ہو۔ جس کی جان جانِ عالم ہو۔ کم از کم اتنی بات تو ہو۔ یہ بھی اِبتداء ہے۔

جب بندہ قُمْ بِاِذْنِ اللہ کہتا ہے تو قانونِ قُدرت مقرّر ہے اس کے مطابق ہوتا ہے۔ اللہ بے نیاز ہے۔ لیکن قُمْ بِاِذْنِیْ کہدے تو اللہ بندے کی لاج رکھ لیتا ہے۔ یہ قُمْ بِاِذْنِیْہِ بسم اللہ' یہ کُن عالمِ امر کی بات ہے۔ فقیر کے ساتھ امر شامل ہوتا ہے۔ یہی ہے سب راز کُنْ فَیَکُون کا۔ غوث الاعظمؒ نے فرمایا تھا فقیر وہ نہیں جس کے پاس کچھ نہیں' بلکہ فقیر وہ ہے جس کے ساتھ امر شامل ہے۔ یعنی کُن کہے تو ہو جائے۔ فقیری آسان چیز نہیں ہے۔ فقیر وہ ہی ہے جسے وہ فقیر بنانا چاہے جسے وہ امر دینا چاہے۔ یہ اپنی کوشش اور دعوے والی بات نہیں۔ فقیر تو اسم اللہ' جسم فقیر کا مصداق ہوتا ہے۔ اسی بسم اللہ سے اس دور میں صحیح دین کی قلوب پر صرف بشارت ہی نہیں دینی بلکہ تجلی دینی ہے۔ وہ تجلی جس کے لئے کہا گیا تھا۔

وہ بجلی کا کڑکا تھا یا صورتِ ہادی

عرب کی زمیں جس نے ساری ہلا دی

آنحضرتؐ کو اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ مثال بنا دیا۔ لیکن اب اس کا اَلَمْ نَشْرَحْ ہے۔ اس کے لئے فقیر کی ضرورت ہے۔ قُلُوب کو کھول دینا صاحبِ وقت کا کام ہے۔ اور یہ وہ ہی کر سکتا ہے جس نے راستہ پورا کیا ہو۔ لہٰذا اب جو کچھ ہونا ہے عالم مِثال کے ذریعہ ہی ہو سکتا ہے، تاکہ چور دروازوں سے باطن انسانی تبدیل کیا جا سکے۔ یہ باطن کی تبدیلی ظاہری اعمال' وعظ و نصیحت' رُشد و ہدایت سے نہیں ہوا کرتی۔ اسکا تعلق عقل سے نہیں ہوتا۔ وہ تو پچھلا زمانہ تھا جب عقل کی طرف رجوع تھے۔ جیسے امام غزالیؒ وغیرہ۔

اس وقت باطن کی طرف لے جاتے تو مذہب ختم ہو جاتا۔ مگر اب قوتِ باطن بھی بڑھتے بڑھتے برابر کی سطح پر آئی ہے' اس لئے چودھویں صدی میں فقراء کا باطن کی طرف رجوع ہے۔ باطن کا راستہ عِشق اور صرف عشق سے کُھلتا ہے۔ عشق کے جاگنے کا تعلق عالم اِمر سے ہے۔ یہ مجاہدوں اور ریاضتوں والی بات نہیں۔ نہ ہی یہ طریقت والوں کا کام ہے۔ وہ تو اتنا بتاتے ہیں یہ کرو نہ کرو۔ مگر باطن کا راستہ بتانے والا کم ہی ملتا ہے۔ یہ ہی تو غوثیّت ہے کہ

یا غیاثُ المُتَغَشِّی در کشا بر جانِ ما۔

(اے پکارنے والوں کی پکار کو پہنچنے والے ہماری جانوں میں رُونُمائی کر)

یہ ہی تو عالمِ امر کی بات ہے کہ وہ توڑ دیوے یہ جوڑ دیوے۔

جانِ ما کو نئی حیات عطا ہونے کا ذریعہ چشتیہ سلسلہ میں عشق ہے۔ عشق کے ذریعے ہی باطن کی صفائی کرائی جاتی ہے۔ چشتیہ کا حساب ایسا ہے جیسا سمُندر کا ہوتا ہے۔ گندی نالیاں اس میں جائیں تو بھی کچھ نہیں۔ سب نمک ختم کر دیتا ہے۔ دوسرے سِلسلوں میں نفس سے جہاد' شیطان پر لاحول' توبہ استغفار۔ مگر شیطان سے جہاد کیا یا توبہ استغفار کرتے رہے تو یار کو یاد کرنے کا وقت کہاں۔ اور ایک شیطان کو دبایا تو دوسرا کھڑا ہو جاتا ہے۔ عشق کا معاملہ دوسرا ہوا کرتا ہے۔ عِشق کا تو یہ حال ہوتا ہے کہ شیطان بھی رسُولِ کریمؐ کے اِرشاد کے مطابق مسلمان بنالیا جاتا ہے۔ عشق کی تو یہ کیفیت ہوتی ہے کہ

بے حجابانہ در آ از درِ کاشانہ ما

(اے نورِ مُجلّی ہمارے گھر کے دروازے سے بے حجاب آ)

ساری کائنات صدقے اس بے حجابانہ در آپر۔ اللہ اِستقامت دے۔ بڑی چیز ہے وگرنہ تانک جھانک تو سب ہی کر لیتے ہیں۔ عشق کے ذریعے باطن روشن ہوا تو وصل کا راستہ کھلا۔

چودھویں صدی میں راستہ وصل سے ہی شروع ہوتا ہے۔ وصل کا راستہ یہی ہے کہ کسی کے عِشق میں اپنے کو فنا کر دو۔ یعنی اپنی بتّی کسی دئے میں ڈال دو بڑا قرب حاصل ہو جائے۔ یعنی قَابَ قَوْسَیْنِ اَوْاَدْنیٰ ہو جائے اور دونوں بتّی آپس میں مل جائیں تو پھر ایک لو دو وجود ہونگے۔ میں تُو تُو میں پھر تُو کون اور میں کون' میں غائب تُو ہی تُو۔ حقیقت ایک ہی تو ہے۔ جب لَا اِلٰہَ کر دیا تو اللہ رہ گیا۔ یہی تو ہے۔ لَا الٰہَ اِلّاللہ جب تک غیر حق باقی ہے لَا اِلٰہَ کہاں ہوا۔ کلمہ پڑھنے سے کیا حاصل' کلمہ تو ہو جانے والی بات ہے۔ وصل کا مقام ہی ولایت کا مقام ہے۔ قرب یعنی وصل ہونے کے بعد ہی نبّوت اور تبلیغ کا مقام آسکتا ہے۔ اور لَا اِلٰہَ اللہُ مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللہ کے مقام کو اپنایا جاسکتا ہے۔ اب سوچیں کہ حضورؐ کا مقام کیا ہے۔ وصل باللہ کا مقام کیا ہوتا ہے۔ نبی کریمؐ کی نبوّت وصل کے بعد حیات کی تفسیر ہے۔ اس کو سمجھیں۔ اس نکتہ کو پکڑیں۔ یوں کہنے سے کیا فائدہ کہ اتباعِ سنّت کرو۔ اسلام کو سمجھو' سوچو کہ اِدھر سے تعلق پیدا ہو۔ وصل کا راستہ بنے تو نقشے ہی بدل جائیں۔

تیرہ صدی میں اسلام کی صحیح چاشنی کو کسی نے بیان نہیں کیا۔ تبلیغ کے پیچھے تو لگ گئے مگر وصل کی بات نہ مُلّا نے چھیڑی نہ صوفی نے۔ حالانکہ یہ اتنی پیاری چیز ہے کہ بہر سُور قصِ بسمل کا قصہ ہو جائے۔ سوچو کہ جب تعلق ہی نہ ہوا تو پھر کیا بسم اللہ یا الحمد للہ۔ مجال ہے کوئی بسم اللہ یا الحمد اللہ کہہ سکے وصال سے پہلے۔

صداقتِ عِشق شرعِ باطنی کی اساس

لوگ کہتے ہیں' اُمّت کے فروغ کا راز شرع کی پابندی سے وابستہ ہے۔ اور اکملیت کے لئے شرع ضروری ہے۔ یہ حق ہے۔ مگر شرع کے لئے بھی تو یہ جاننا ضروری ہے کہ کس مقام سے۔ کیونکہ شریعت تو قالب کے لئے ہے اور طریقت قلب کے لئے۔ قلب کی دنیا تو خیر ہے ہی عشق۔ مگر قالب کی حد تک بھی خلُوص ضروری ہے۔ اسلئے فرمایا ہے کہ شریعت بغیر اخلاص رِیا ہے' بدترین گناہ ہے' حتیٰ کہ لَاصَلواۃَ اِلّاَ فِی الْحُضُوْرِ الْقَلْب'۔ عبوویّت کے

لئے یقینی شرع ضروری ہے ،لیکن مقامِ عبودیّت تو عارف سے بھی اونچا مقام ہے کیونکہ عرفان حاصل کرنا اس کے بغیر بھی ہو سکتا ہے۔مُنتہائے عبودیّت اُسوۂ حسنہ نبیٔ کریمؐ ہیں۔ یہ اکملین کا مقام ہے۔ یہ شرح باطنی یعنی قلب میں صداقتِ عشق کے بغیر حاصل نہیں ہوتا۔ شرعِ باطنی تو خیر بڑی چیز ہے' باطن کی طہارت بھی کسی کسی کے نصیب میں ہوتی ہے۔ یہ ظاہر داری سے ارکان ادا کر لینا شرع نہیں۔ بسا اوقات ہم اپنے وظیفے' اپنی نماز' اپنی قرآت میں اتنا مزا لیتے ہیں کہ ہم سمجھتے ہیں کہ اللہ کے کلام میں مزہ آتا ہے۔ حالانکہ ہم اپنی انا کی پرستش میں لگے ہوتے ہیں۔ یہ سب ظاہر داری' خود فریبی ہے۔

مُقدّم جو چیز ہے وہ اخلاق کی درُستگی ہے۔ باطن کی صفائی ہے اور یہ بغیر عشق کے حاصل نہیں ہوتی۔ عشق ہی باطن سے ماسوا اللہ کو ہٹا کر ایک رُخی عطا کرتا ہے۔ اس لئے پہلے اخلاق درست کرنے ہیں' دلوں میں عشق کی قندیل روشن کرنا ہے' بعد میں ارکان کی طرف توجّہ دینا ہے۔ یہ امر مُسلّمہ ہے کہ صدق' سچّائی' امانت' محبّت' بنیادیں ہیں اخلاق کی۔ لوگ رسولِ کریمؐ کے اخلاق ہی سے ان کی طرف رجوع تھے اور ان کی ظاہری شرع کے راستہ پر چھوڑ کر کم از کم افراد کو ٹھیک کرنا ہے۔ ان کے باطن کی صفائی ہوئی' ان کے قلب میں عشق جاگا۔ یہ ٹھیک ہوئے تو ملّت ٹھیک ہوئی اور پھر شرع پر واپسی اخلاص اور صداقت کے ساتھ ہو سکے گی۔ یہ شریعت پر جو ظاہر داری کا خول دے کر پردہ کر رکھا ہے اسکو توڑنا ہے۔ مثلاً نیک عمل' خواہ خلُوص سے کیا ہو یا نہیں کیا ہو' صرف ظاہر داری سے پُورا کر لینے کے بعد کہہ دیتے ہیں کہ شرع پر عمل کر لیا۔ مانا کہ اس طرح بھی شرعی احکام پورا کر کے سوسایٹی کو برقرار رکھا جا سکتا ہے لیکن وہ صفاتِ حمیدہ جو مقامِ محمُود تک پہنچاتی ہیں' وہ تو خالص اخلاص' ہمہ گیر محبّت اور صداقت سے ہی آسکتی ہے۔ حقیقت کے میدان میں تو یہ ظاہر داری گُناہ ہے' یعنی ہر وہ چیز جو مقصد سے فعل پیدا کرے گناہ ہے۔ اور جو قرب پیدا کرے' محبّت کا رشتہ پیدا کرے وہ نیکی ہے۔ قرب کے رشتہ میں بند ہے۔ وصل کے راستے سے آپس میں محبّت کا رشتہ آنا لازمی ہے۔ یعنی جمعیت سے محبّت ہو جاتی ہے۔ اس سے زیادہ ٹھوس ثبوت اپنے شرع کے دعووں کی صداقت کا اور کیا مل سکتا ہے۔ اِنَّمَا الْمُؤمِنُونَ اِخْوَۃٌ (آپس میں مومن بھائی ہیں) ایک روشن حقیقت بن جائے۔

حیات طیبہ کی بنیاد جمعیت

قرآن کریم کی آیت ہے۔ مَنْ عَمِلَ صَالِحاً مِنْ ذَکَرٍ اَوْ اُنْثٰی وَ ہُوَ مُومِنٌ فَلَنُحْیِیَنَّہٗ حَیٰوۃً طَیِّبَۃً وَ لَنَجْزِیَنَّھُمْ اَجْرَھُمْ بِاَحْسَنِ مَا کَانُوْا یَعْمَلُوْنَ O)مردوں اور عورتوں میں سے جس نے نیک عمل کئے اور وہ مومن بھی ہے تو اس کو ہم حیات طیبہ سے زندگی عطا کریں گے اور بہتر بدلہ دیں گے اس کے عمل کا) اس آیتِ کریمہ کا اِطلاق اگر افراد پر میزان کے ساتھ ہوتا ہے تو ملّت کے ساتھ لامحدود برکتوں اور رحمتوں کے ساتھ۔ ملت کو حیاتِ طیبّہ عطا ہونے کی بنیاد افراد کے عملِ صالح پر رکھی گئی ہے۔ یہ سچ ہے کہ جب تک اجزاء روشن نہ ہوں کُل میں روشنی کا امکان بہت کم ہوتا ہے۔ اور غالباً اسی وجہ سے تیرہ صدی تک اِلاّ زمانۂ خلفائے راشدین' جتنے بھی عالم' صوفی اور راشد گزرے ہیں وہ تزکیۂ نفس اور قربِ الٰہی کا اِطلاق صرف انفاس یعنی افراد پر کرتے رہے اور غالباً بجا کرتے رہے۔ حکم الٰہی یہی تھا۔

لیکن زندگی کا افضل ترین نظریہ جو آگ اور سختیوں میں گذرنے کے بعد منکشف ہوا ہے یہی ہے کہ صرف زندگی کے روشن پہلو پر نظر رکھی جائے' تاریکی خود غائب ہونے لگتی ہے۔ اپنے اندر جب تک نُور نہیں دوسروں کی روشنی نظر نہیں آتی۔ حُسن اور سچّائی اپنے ہی اندر ہے۔ اپنے سے باہر

نکل کر دوسروں کے آگے خوش خُلقی اور تہ دل سے جُھکیں تو خواہ تنکا بھی ہو اس میں حُسن نظر آئے گا۔ دوسروں کی اچھائیاں دیکھنے کے لئے ظن پیدا ہو جائے گا۔ یہی قدرت کا سادہ قانون ہے۔ اسلام ہے۔ اسلام کا مُنتہائے نظر ہے ہی رُحَمَاءُ بَیْنَہُمْ۔ اخُوّتِ کامل یعنی جمعیت کی خاطر عملِ صالح۔ یہ بات قوانین فطرت میں نہیں آتی ہے، کر کے دیکھنا ہوتا ہے۔ تم میری طرف ایک قدم بڑھو میں تمہاری طرف دس قدم بڑھتا ہوں۔ یہی بات ہے۔

رسُول اللہؐ نے زبانی لیکچروں سے لوگوں کو رجوع نہیں کیا۔ بلکہ محبّت سے۔ رسُول اللہؐ کے حکم پر مسلمان نتیجہ کی فکر یا صلۂ جنت کی تمنّا کے بغیر جان دے دیا کرتے تھے۔ یہ محبّت کا اثر تھا اور رسُول اللہؐ کی ذات کا' یہی وجہ تھی کہ ان کے گِرد سب کے سب 'مَیں' کی بجائے 'ہم' کہ کر دُعا کیا کرتے تھے۔ دراصل اسلام کے اصلی جوہر کا راز جمعیت ہی کے ساتھ پیوست ہے۔ مُسلِم اور مومن کے لئے یہ گناہ اور کُفر ہے کہ وہ اپنے لئے دُعا مانگے' یا عمل کرے چاہے وہ عمل دنیا کے لئے ہو یا عُقبیٰ کے لئے۔ اسلام کا مطمعِ نظر ہے ہی جمعیت سے متعلق اور قُرآنِ کریم کی جتنی بھی دُعائیں ہیں سب کی سب جمع کے صیغہ میں ہیں۔ جہاں بھی صیغہ واحد آتا ہے تو غور سے بطنِ قران پر نظر ڈالنے سے یہ ظاہر ہو جاتا ہے کہ صیغہ واحد کا صرف ان افرد پر اِطلاق ہوتا ہے جو فرد مر کر زِ جمعیت ہو۔ (انا امتی ہو)

موجودہ زمانہ کے اچھّے اچھّے فُقراء بھی میرا فراق' میری جلن' میرا مقام کہتے ہیں۔ اور اسلام کا نکتہ نظر ہے ہمارا۔ یہ رمز غوث پاک کی جوتیوں کی خاک پڑ جائے تو انسان پر کُھل جاتا ہے۔ پھر انسان یہ نہیں کہے گا کہ میں قطب بنوں گا' فلاں بنوں گا' بلکہ جمعیت کو دیکھے گا۔ اس جمعیت کو جس کے لئے رسُولِ کریمؐ نے آنسو بہائے' جس کی خاطر بھوکے رہے' پیٹ پر پتّھر باندھے۔ وگرنہ کیا رسُولِؐ خدا کے پاس کھانے کو روٹی کا ٹکڑا نہ تھا۔ یہ جمعیت کا درد' جمعیت کا غم ہی تو تھا۔ آج ہم ہیں کہ جمعیت کو نظر انداز کر کے اللہ کی آس لگائے بیٹھے ہیں۔ یہ تو ایسی بات ہے کہ شاہکار کی طرف نظر بھی نہ ڈالتے ہوئے بلکہ اس سے نفرت کرتے ہوئے پھر مُصوّر سے ملنے کی آرزو میں بیٹھے ہوں۔ حالانکہ شاہکار کے ذریعے ہی مُصوّر کی عظمت کا اندازہ ہو سکتا ہے اور مُصّور کا قرب حاصل ہونے کی تمنّا کی جاسکتی ہے۔ حدیث شریف ہے' خَیْرُ النَّاسِ مَنْ یَّنْفَعُ النَّاسِ بہترین وہ ہے جس سے لوگوں کو فائدہ پہنچے۔ یعنی اللہ کی نگاہ میں سب سے بہتر اور پسندیدہ عمل مخلوق سے محبّت کرنا ہے۔ اسی قسم کے کھلے اور واضح احکامات بالائے طاق رکھ کر اُمّت ہے کہ اپنی بخشش' اپنی نجات اور حق تک اپنی اپنی رسائی میں لگی ہوئی ہے۔ حالانکہ کسی فرد میں جب جمعیت کا درد' جمعیت کی محبّت' آجاتی ہے تو اس کی یہ کیفیت ہو جاتی' ہے کہ اگر اللہ بھی کہتا ہے اِدھر آئو تو وہ کہتا ہے ٹھہرو۔ مجھے یہ کام کرنے دو۔ یہ جمعیت کا کا درد پیدا کر کے دیکھو۔ پھر اسکی حقیقت کُھلتی ہے کہ خالق مخلوق میں ہی مل سکتا ہے۔

اب فقر میں ضرورت ہے کہ 'مَیں' کی جگہ 'ہم' کا تخیل آنے لگے۔ مسلمان یہ کرنے لگ جائیں تو قوم کا بیڑا پار ہو' قوم کا ہوا تو افراد کا بھی ہو جاتا ہے۔ جمعیت میں ہی برکت ہے۔ برکت کی تشریح کوئی کیا کرے۔ یہ اونچا مقام ہے۔ نباتات کی موجودگی بارش لاتی ہے' والی بات ہے۔ رشتہ بندھ جانے کے بعد یہ اُمّت پر فضل و کرم لانے والی بات ہے۔ کر کے دیکھنا ہوتا ہے۔ اس حساب کتاب کی دنیا' اس عِلتّ و معلُول کی دنیا اس عمل و ثمر کی دنیا سے ماوراء ایک اور دنیا ہے' جہاں سے برکات اور خلُوص کا نزول ہوتا ہے۔ اور اس کا رابطہ صرف جمعیت' جمعیت کے عمل اور ایمان پر مبنی ہے۔ یہ راز مسلمان نے کھو دیا ہے اور حالت یہ ہو گئی ہے کہ موجودہ زمانہ میں نفسِ جمعیت' جمعیت کی زندگی' جمعیت کا فروغ' جمعیت کا ایمان بیگانہ سے معلوم ہونے

لگے ہیں۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ عوامُ النّاس نے آج تک اپنی خودی سے بلند تر ہو کر نہ کبھی محبّت کی ہے نہ جمعیت کی خاطر اور عمل فی سبیل اللہ قدم اٹھایا ہے۔ کہتے تو ہیں کہ آج کل خداوند چاہے مسلمانوں کا ہو یا عیسائیوں کا یا ہنود کا وہ مادّہ ہے اور مادّہ اور شکستی پرستی کا زمانہ ہے۔ مگر کائنات اسی کی ہے' مخلوق میں جھلک اسی کی ہے۔ یوں اللہ کو ڈھونڈا نہیں ملا' مگر قسم ہے اسی ذات کی' دیکھا ہے اور ضرور دیکھا' مخلوق ہیں۔

مخلُوق، تجَلّیءِ حق کا مظہر'

یہ وحدت الوجود عقلی گُدّے والی بات ہے۔ قسم ہے اس ذات کی بغیر تعیُّن کے کام نہیں بنتا۔ وہ جو غیب در غیب ہے' اسے تو کیا دیکھ سکو گے۔ مخلوق میں اسی کی تجلّی کو دیکھو۔ نبیء کریمؐ نے بھی مخلوق میں ہی حق کی تجلّی پر زور دیا تھا۔ اور اسلام کا پہلا سبق جمعیت بندی' اُخوّت رُحماء بینھم کا دیا تھا۔ تاکہ اس طرح حق تک رسائی ہو سکے۔ یہ وہی حق کا پرتو ہے جو ہر مخلوق میں "انا" کی تجلّی دے رہا ہے یہ ہر ایک میں "انا" اسی حق کا پرتو ہے۔ اس حقیقت کو اپنی ذات پر تجربہ کر کے دیکھا جا سکتا ہے۔ کچھ اس طرح جیسے کہ سورج کی روشنی جب ہم تک پہنچی اور ہم نے اس کو پا لیا تب جا کر وہ ذاتی ہو گئی۔ بالکل اسی طرح ہر فرد کا اپنے رب سے رابطہ مخلوق سے رابطہ کے ذریعہ ہی ہو سکتا ہے۔ یہی تو بات تھی کہ معراج میں میرا رب حضورؐ نے فرمایا تھا۔ اور اس وصال کے بعد اُمتّی اُمتّی۔ یہ اُمتّی اُمتّی کی حقیقت اور اہمیت دلوں پر تجلّی دے جائے تو نئی حیات اُمّت کو عطا ہو۔ اسی تجلی کا اثر تھا کہ حضورؐ نے فرمایا کلُّ مُومِنٌ اِخوَتٌ اور سب نے قولاً نہیں فعلاً اسے سچّا کر دکھایا۔ پہلا مسلمان حضورؐ کے ہر فرمان پر آنکھ بند کر کے عمل کرتا تھا۔ اسے ارشاداتِ گرامی پر مکمّل ایمان تھا۔ وہ سپاہی کی طرح ہر حکم کی تعمیل کرتا رہا۔ اور جب تک سپاہی رہا ہر میدان میں عروج پر رہا اور جب بن گیا ظن و تخمین والا اور مشورہ دینے والا برہمن' تو اسلام کے بہتے دھارے سے علیحدہ ہو گیا۔ یہ تعمیلِ حکم' یہ عمل سوائے اسکے اور تھا بھی کیا کہ جمعیت کی خاطر' جمعیت کی بقا کی خاطر' جمعیت کے فروغ کی خاطر انہاکِ کار۔ آج پھر وہی زمانہ ہے کہ اسلام کی وہی اوّلین سادگی' وہی ایمان کی روشنی' وہی جمعیت کا خلُوص لوگوں کے دلوں میں ڈالا جائے۔ مگر کس طرح؟ طریقہ کار سوائے اس کے اور ہو بھی کیا سکتا ہے کہ بے لوث عمل' خدمتِ خلق' عمل فی سبیل اللہ کے ذریعے اُخوّت کا رشتہ باندھا جائے۔ خدمت و خلُوص کچھ لازم و ملزُوم چیزیں ہیں۔ سچّی خدمت کے بعد ہی خلُوص پیدا ہو سکتا ہے۔ وگرنہ یوں تقویٰ یا فرض سمجھ کر ظاہر داری سے عمل کر لینے سے کچھ اپنی ہی انا کی خدمت ہو جاتی ہے۔

اس لئے ارشاد باری میں پہلے عملِ صالح' عمل فی سبیل اللہ کا ذکر ہے اور ایمان ایک لازمی نتیجہ کی طرح اس سے وابستہ ہے۔ اس عمل صالح والے مومن کے لئے پھر بشارت ہے' حیات طیبہ سے نئی زندگی عطا ہونے کی' جو ظاہر ہے اس زندگی سے لطیف ہی زندگی ہے۔

ہم عمل صالح کے معنی اور پاکیزہ زندگی کے معنی یہ لیتے ہیں کہ اس سے بچو' اس سے بچو' اس قسم کا پرہیز اور تقویٰ۔ اس قسم کا 'لا' تو اپنی ہستی سے ہی انکار کرنا ہے' اور ادھر حکم ہے قدم اٹھا کر عمل کرنے کا۔ اور عمل صالح ہو بھی کیا سکتا ہے' سوائے اس کے کہ جمعیت کی خاطر انہاکِ کار ہو۔ "سِرّ وَعلانیۃً" یعنی ظاہری اور باطنی دونوں نظاموں میں خلوصِ عمل اور جمعیت بندی۔

مستقبل کے سوتے

نبی کریمؐ کے جو مقرر کردہ نقشے تھے' ان کے صدیوں بہ صدیوں مُجدّدین آکر ورق پلٹتے گئے۔ اگلے تین چار صدیوں کے نقشے' ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پچھلا سب اٹھ گیا۔ اب چشمہ ہی پھوٹتا ہے فقر کے باطنی نظام کا جس کا تعلق عالمِ ولایت سے ہے۔ جس کے نقشے حضرت بابا فریدؒ کے یہاں سے چلے تھے اور جسکی مستحکم بنیاد اس صدی میں حضرت بابا تاج الدین ناگپوریؒ نے رکھی۔ اس باطنی نظام کا علم اسی کو ہو سکتا ہے جس کی باطن تک رسائی ہو۔ نہ صرف اپنے باطن تک بلکہ باطن وجود یا کم از کم باطن ملت تک۔ یعنی انا امتی والی بات۔

امت کے احیاء کا جو درخت بابا تاج الدینؒ نے لگایا تھا اسکی پوری پرورش حضور بابا قادر اولیاءؒ نے تمام آفاتِ آسمانی و روحانی اپنے اوپر لے کر کی۔ یہ کام استغراق کے عالم میں ایک ایسی ہی ذات کر سکتی ہے جو مرکزِ عالم ہو۔ یوں اپنے اپنے زمانے میں بہت سے آئے اور کیا کچھ کر گئے۔ مگر کس کس نے امت کی خاطر اتنے ٹوکرے ڈھوئے ہوں گے اور کون کون وعدے کے ساتھ آیا اور کیا کر گیا۔ بابا قادرؒ کا ارشاد ہے کہ اب کچھ نہیں کرنا امت کو سوائے اس کے پھل کھائے۔ اب وقت آگیا ہے فتح مبین کا۔ اب عالمِ امر میں انقلاب ہے۔ اب نئی دنیا ہی بننی ہے۔ پرانی ضعیف ہو چکی ہے۔ علاج کی کوششیں بے کار ہیں۔ اس نئی دنیا کے بنانے کے لئے البتہ روپے میں سولہ آنے ادا کرنے ہوں گے۔ کل کُ کے کُل۔

چودھویں صدی میں بسم اللہ سے رفتار زمانہ کو بدلنا ہے۔ اٹکے ہوئے یوں ہیں کہ اس راز سے ناواقف ہیں۔ بسم اللہ کا اِذن نہ ہونے سے ہر عمل میں رکاوٹیں ہیں۔ اذن بڑی چیز ہے۔ یہی تو امر ہے۔ کُنْ فَیَکُوْنْ والی بات ہے۔ اسم اعظم کے متعلق تو دفتر کے دفتر لکھے گئے ہیں لیکن بسم اللہ کی گہرائی کو کسی نے نہ پکڑا۔ عارفین جو زندگی کا نچوڑ دیتے ہیں وہ یہی بسم اللہ ہے۔ جب بات بنتی ہے۔ جب اجتماعیت میں بِسم اللہ کی روح پھونک دی جائے تو پھر کیا کچھ نہیں ہو سکتا۔ یہی تو وہ حالت ہوتی ہے جس میں کن فیکون کار فرما ہو سکتا ہے اور زمانہ کو ایک نیا رُخ عطا ہو سکتا ہے۔ گویا جمعیت میں ایک انقلاب لانا ہوتا ہے۔ عالمِ امر سے۔

عالمِ امر کی بات یہ ہے کہ فقیر آمر باللہ کا تعلق عالمین سے ہوتا ہے اسی لئے وہ فقیر' فرد' جمعیت' انسانیت' خدائی کو اپنے باطنِ وجود میں سمیٹنے کے بعد حیات کو ایک نیا رخ دے دیتا ہے۔ فرد کی حد تک اس کی کار فرمائی یہ ہے کہ پیر کامل کی بسم اللہ کی پہلی ٹھوکر سے عشق میں قیام پاتا ہے۔ چوتھے آسمان پر پہنچ جاتا ہے۔ اس کے بعد دوسری ٹھوکر کن فیکون' ساتواں آسمان' روح میں قیام' انا رُوحی پکار اٹھتا ہے۔ پھر تیسری ٹھوکر اسم ذات کی' جس کے ذریعے غیب تک رسائی ہوتی ہے۔

یہ فرد کی حد تک عالم امر میں انقلاب نہیں تو اور کیا ہے۔ کہاں مرشدِ کامل کی یہ شان اور کہاں وہ زمانہ کہ پہلے گھسائی کرتے تھے۔ پھر برتن صاف کئے جاتے تھے اور پھر قلعی۔ اب تو یہ زمانہ آگیا ہے کہ ذرا سا نور ڈال دیا' تاریکی خود بخود غائب یا تیزاب ڈال دیا اور آبِ رواں سے دھو کر چمکا دیا۔

اللہ اللہ کہاں وہ پہلے کی سختیاں کہ فنا سے منزل شروع کرتے تھے اور تیس' تیس' چالیس چالیس برس لگ جاتے تھے اور کہاں یہ بات کہ اب منزل ہی بقا سے شروع ہوتی ہے۔ یہی تو ہے وصل والی بات۔ تھوڑا سا نُور ڈال دیا اور نورٌ اعلیٰ نُور بنا دیا۔

پہلے لوگ مُجاہدے کر کے نفس اور عقل کے پھندوں سے نکلنا چاہتے تھے۔ پھر مقامِ قلب اور مقامِ رُوح تک پہنچنے کی کوشش کرتے تھے۔ یہ لمبا راستہ تھا۔ اب یہ راستہ ہے کہ برکتِ بسم اللہ خدمت کرو۔ وقت کا دھارا احیاءِ زندگی میں ہے' شدّتِ عمل میں ہے۔ صرف ایک دُکھے ہوئے دل کی دُعا لے لو تو بیڑا پار ہے۔ بسم اللہ کا اذن ملنے کے بعد کسی پر محبّت سے ہاتھ رکھ دیا جیسا کہ یتیم کے سر پر یا مسکراہٹ ہی دے دی۔ تو یہ کرتے کرتے انسان پھیلنے لگتا ہے۔ کائنات کو سمیٹنے لگتا ہے۔ بس یہ دل سے چاہنا ہوتا ہے۔ اسی امر بسم اللہ کی شدّت سے بڑے بڑے کام فردِ' اُمّت اور انسانیت کے لئے کئے جاسکتے ہیں۔ مگر ہو تو ایسی فقیری۔ تلوار کی دھار سے بھی تیز والی بات۔ اس طرح کائنات کو سمیٹ لیتے ہیں' اتنی برکت ہوتی ہے کہ دوسرے بھی کثیر تعداد میں یہ کرنے لگ جاتے ہیں خواہ مخواہ حد تک ہی سہی۔ اسی محبّت اور خدمت سے انسان میں بے نیازی آنے لگتی ہے اور اس کو وُسعتوں میں پھیلنا آجاتا ہے۔ اس بے نیازی سے وہ ہر آرزو سے گذر جاتا ہے اور اس کی ہر آرزو پوری ہوتی ہے۔

اقدامات و نصبُ العین

یہ تو رہی فرد کی حد تک کی بات اور جب جمعیت میں یہ ہونے لگ جائے اس کی حیاتِ طیبّہ کے کیا کہنے۔ اب مقرّرہ نقشوں کے مطابق ہی احیاء دین ہونا ہے۔ چودھویں صدی کے جو نقشے ہیں ان میں پہلا قدم لاہے مسلمان کو شاہین سے تشبیہ دیتے ہیں۔ جو خود شکار کرتا ہے۔ اور زندہ گرم خون کو اپنی غذا بناتا ہے۔ گدھ مُردار کھاتا ہے۔ ماضی مُردار ہے چاہے وہ اپنے گناہ ہوں یا عملِ صالح۔ مومن کی نگاہ اپنے آگے ہوتی ہے۔ میدانِ جنگ میں اپنے رفقائ اور اولاد کی نعشوں کو پھاندتا ہوا آگے نکل جاتا ہے۔ اسے مڑ کر دیکھنے کی مہلت کہاں۔ منزل پیش نظر ہے اور والہانہ انداز سے وہ آگے بڑھتا ہے۔ گناہوں کے توبہ کی مہلت کہاں' اپنے کردار کے جائزے کی اسے فرصت کہاں۔ نفس سے جہاد انسان اس وقت کرے جب تاریکیاں حائل ہوں۔ مگر جب شمس حقیقت آنکھوں کو خیرہ کر رہا ہو تو اور کوئی چیز اسے کیا نظر آئے گی۔ کیسا نفس سے جہاد' جب وہ سما گیا تو یہ خود ہی کہاں اور کیسا نفس۔

یہ ایک مشہور نفسیاتی بات ہے جو روز مرہ زندگی میں زندگی کے ہر پہلو میں ہم دیکھ سکتے ہیں کہ جو جس کا تصور کرتا ہے وہی اس کا انجام ہوتا ہے۔ ہم اپنے گناہوں کے تصوّر میں گھرے رہے چاہے وہ صورت توبہ استغفار کی ہی کیوں نہ ہو۔ گناہ ہم سے چھوٹ نہیں سکتے۔ جو بیمار اپنی بیماری کے خیال میں ہر وقت مشغول رہتا ہے اس کے لئے نہ کوئی دوا نہ کوئی دُعا' اسکو اس کی بیماری سے جدا کر سکتی ہے۔ تصوّرِ عِشق کی جِلا ہے۔ اور عشق کے راستہ کو اللہ بھی کبھی توڑنا نہیں چاہتا۔ چاہے وہ عشق ظلمت سے ہو یا بیماری سے یا تباہی سے۔ ہم اپنے بزرگوں کے کارہائے نمایاں پر خوش ہوتے ہیں' اپنی ملّت کے گناہوں پر روتے ہیں۔ یہ دونوں ہی ماضی میں مُردار ہیں۔ مومن مجاہد کی نظر آگے ہوتی ہے۔ مستقبل پر۔ پیچھے مڑ کر صرف وہ دیکھتا ہے جس کے دل میں خوف ہو۔ اور جس کے دل میں یقین ہو' اس کو مڑ کر دیکھنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ چودھویں صدی کے مشن کا یہی ہے کہ پیچھے مڑ کر مت دیکھو۔ پتھر کے ہو جاؤ گے' زندگی کھو بیٹھو گے۔

دوسرا قدم اِلاّ اَللّٰہ عمل صالح ہے' بے لوث عمل' جس کی اگر عالمِ اسباب میں جزا ہے تو عالمِ امکان میں جزائے احسن۔ ایمان اور احسان ایک ہی سکّے کے دو پہلو ہیں۔ احسان وہی کر سکتا ہے جس نے عشق کی غربت کی چادر اوڑھ رکھی ہو۔

دوسرا قدم یہ ہے کہ بسم اللہ کہہ کر کوئی بھی ایسا کام کو جس سے تمہارا انفرادی حیثیت سے کوئی دور کا بھی تعلق نہ ہو۔ کوئی خیرات بھی کی تو تحتُ الشّعور میں یہ بھی گمان نہ آئے کہ اس کا اجر ہو گا یا یہ کہ وہ غریب دُعا دے گا۔ ایک دفعہ کر کے دیکھو۔ عمل کی برکت سمجھائی نہیں جاسکتی۔ موڑ سے پرے کیا ہے۔ تم دیکھ نہیں سکتے قدم اٹھاؤ تو آنکھیں کُھل جاتی ہیں۔ سارے اس موڑ پر رکے ہوئے ہیں۔ یہ موڑ وہ ہے جہاں پر انفرادیت ختم ہو جاتی ہے۔ انفرادیت کے تنگ و تاریک راستے کی بجائے جمعیت کے گلزار اور آگے سمندر' اور آگے آسمانوں کی وُسعتیں بغیر حجاب درو دیوار پیش آتی ہیں۔ یہ بھی ایک نفسیاتی تجربہ ہے کہ سچّی خوشی جو ہر کسی کا دل چاہتا ہے کبھی بھی اپنی خاطر عمل کرنے میں آج تک کسی کو نصیب نہیں ہوئی۔ چاہے وہ عمل فوری ہو یا دور رس' ایک خوشی کی پھریری ضرور ہوتی ہے۔ مگر بعد میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک پردہ تھا' ایک دھوکہ تھا۔ جو انبساط اور زندگی کے چشمے قلب میں ابلنے لگتے ہیں' وہ صرف ایسے قلب جانتے ہیں جو بے لوث عمل کرتے ہیں۔ یہ تو رہا فرد کی حد تک۔

اور سبحان اللہ جمعیت کی برکت یوں ہے کہ اللہ تعالیٰ جب کسی مرکز کے دل میں کسی عملِ صالح کا خیال ڈالتا ہے اور وہ اپنے کسی دوست کے سامنے اس خیال کو پیش کرتا ہے' تو محض اس لئے کہ اس کی نیّت میں خلُوص ہے' دوسرا دوست بغیر کسی تامل کے فوراً لبیک کہتا ہے۔ دوست کے معنی یہی ہیں۔ حضرت عمرؓ اسی طرح نبیء کریمؐ کے ہر قول پر جوش کے ساتھ بغیر کسی ہچکچاہٹ کے لبیک پکار اٹھتے تھے۔

یہ نیّت کی برکت ہوتی ہے۔ اور جب دو سے چار ہو جائے تو فضا میں ان کے ایمان کی خوشبو اور ان کے جوش کی لہریں' موجزن ہو جاتی ہیں اور سارا عالم چاہے اس پیغام کو سنا ہو یا نہ سنا ہو اپنا لیتا ہے۔ اور اس میں خوبی یہ ہے کہ ہر ایک یہ خیال کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ خیال اپنے کرم سے مجھ میں ڈالا۔ یہ خلُوص کی برکات ہیں۔ ایک حدیثِ قُدسی ہے کہ خلُوص بندگی کے ان اسراروں میں سے ہے جو میں اپنے بندوں کو عطا کرتا ہوں' جن سے مجھے محبت ہے۔ یہ سِر یہ اسرار کے رمز صرف عمل سے آشکار ہوتے ہیں۔ جہاں تک جمعیت کے عمل کا پہلو ہے اس فکر کی کوئی ضرورت ہی نہیں کہ آج کل ہم میں یہ برائیاں ہیں اور یہ نقائص ہیں۔ حاشا غور سے دیکھو تو ذرّہ ذرّہ کے قلب میں حق بے چین ہے کہ یہ 'مَیں' کا حجاب اٹھّے اور آشکار ہو اور 'مَیں' کا حجاب اٹھنے کا طریقہ نفس سے جہاد نہیں بلکہ فرد کو ملت میں ضم کر دینا ہے۔ سوچو' معراج کے متعلق سوچو' عشق کی انتہا کو سوچو۔ بظاہر یہ انفرادیّت کی بھی انتہا ہوتی ہے مگر نبیء کریمؐ کا جب آمنا سامنا ہوتا ہے تو وہ وصل کے طالب نہیں ہوتے۔ ہوتے ہیں تو اسی رُوپ میں کہ ملّت کے حجابات اٹھیں۔ ان کی بخشش ہو۔ میرا وصل کوئی معنی نہیں رکھتا۔

جب تک کہ جیسے کسی فرد کے لئے نصبُ العین موجود نہ ہو تعیّن راہ نہیں ہو سکتی اسی طرح جب تک کہ ملّت کے آگے ایک بیّن نَصبُ العین نہ ہو جس کا ان کو نہ صرف یقین ہو بلکہ جس کو عقل کی آنکھ بھی دیکھتی ہو' تعین مشکل ہے۔ اس ملت کا نصبُ العین غلبہ اسلام تھا۔ کیا اس ملت مرحُومہ کا نصبُ العین آج بھی یہی ہے؟ غلبہء اسلام کے کیا معنی ہیں۔ کیا اس کے معنی ملک گیری' کیا اس کے معنی افراد کی جاہ و حشمت' کیا اسکے معنی تسخیر فطرت ہیں۔ نہیں نہیں انبیاء کے بعد تکمیل انسانیت کا مقام رَضِیَ اللہُ عَنْہُ اس کی رضا کو ڈھونڈنا اسکی رضا کو پانا ایک مومن اور مسلم کی جستجو ہو سکتی ہے۔ جب تیری رضا اور میری رضا کا امتیاز اٹھ جائے تب ایمان کی تکمیل ہوتی ہے۔ غلبہء اسلام یہ ہے کہ ساری وہ کثافتیں جو ہمارے ارتقاء اور ترقی کے لئے

اللہ تعالیٰ نے تشکیل کی ہیں ان میں الجھنے کی بجائے ان میں سے راستہ ڈھونڈیں اور اسی پر چلیں۔ رکاوٹیں نہ ہوں تو شِدّتِ عمل کیسے نصیب ہو سکتی ہے اور باطن کی سوئی ہوئی خوبی و اخلاق کی صلاحیتیں کہاں جاگ سکتی ہیں۔

اس شِدّتِ عمل اور ایمان کی جزاء حیاتِ طیبّہ سے زندگی عطا ہونا ہے اور احسن بدلہ ملنا ہے۔ اس کے اعمال کا "سُبحان اللہ" جمعیت کا بے لوث عمل بخشش و نجات کے چکروں سے تو یوں ہی آزاد ہے' اسی لئے بہت جلد یہ عمل جمعیت کے ایمان کا ذریعہ بن جاتا ہے' اور اس کی جزا ملتی ہے' جمعیت کو حیات طیبہّ سے زندگی عطا ہونا۔ لہٰذا وعدۂ فرقان غلط نہیں ہو سکتا اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ کُنْتُمْ مُؤمنینَ (تم ہی سربلند ہو گے اگر تم مومن ہو) پر ہر امتّی کو ایمان رکھنا چاہیے۔ احیاء اسلام کے لئے چند سالوں میں نئی چیزیں ظہور میں آئیں گی۔ پاکستان سے چین تک تمام علاقے میں اسلام پھر سے اٹھے گا۔ افریقہ اور امریکہ کی سیاہ فام نسلوں کو قدرت کے خزینہ سے وہ حصہ عطا ہو گا جو ان کے لئے مخصوص ہے۔ ازبکستان کے باشندوں' وزیریوں اور آفریدیوں جیسی پاک خون والی قومیں قدرت کی منظورِ نظر بن چکی ہیں۔ آگے کی تاریخ یہیں سے بننا ہے۔ لال قلعہ دہلی پر سے سبز جھنڈا بلند ہو گا۔ آگے کی صدی اور مابعد اہم زمانہ ہے۔ ایٹم بم کی بابت بھی بتایا جاچکا ہے کہ یہ سب پُھس پھسا کر رہ جائیں گے جیسا کہ موسیٰؑ کے ڈنڈے کے آگے جادوگروں کے سانپ۔ بات یہ بھی ہے کہ پہلے اُمتیں اور قومیں پوری کی پوری مٹ جاتی تھیں لیکن رحمتہ للعلمین کے آنے کے بعد اب ایسا نہیں ہونا۔ اب ایٹم بم سے بھی کُلی طور پر تباہی نہیں ہو سکے گی۔ غرض اب فتح مبین ہے۔ سب کے لئے کچھ ہو گا' بھلا ہو گا۔ نئے رنگ' نئی آن' نئی زندگی' حیاتِ طیّبہ سے پھر دین مُبین اٹھے گا۔ اور چالیس سال کے عرصہ میں پھر سے دین مُبین الیوم اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ کے نیزہ پر بلند ہو گا۔

کُلَّ یَوْمٍ ھُوَ فِیْ شَاْنٍ

فَبِاَیِّ اٰلَاءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبَانِ

احیائے امّت' مَشِیّتِ حق

ہمارے تمام کردار و اعمال مَشِیّتِ حق کے تابع ہیں۔ مشیت کی تلاش کریں' مَشِیّتْ کو سمجھتیں تو راستہ کھلا نظر آنے لگے گا۔ یہ کیفیت حال سے متعلق ہے۔ حال ہی میں اللہ کی نشانیاں نظر آسکتی ہیں۔ جن پر غور و فکر کرنے کے لئے بار بار قرآنِ پاک میں تاکید ہے۔

قلب ہی عرشِ الٰہی ہے۔ جب الم نشرح ہو جائے تو ایک ہی حق جلوہ فرما نظر آتا ہے۔ اگر یہ عادت ڈال لیں کہ احساس رہے کہ اس پر چیز کو اللہ کیسے

دیکھتا ہو گا تو سب تفرقہ مٹ جاتا ہے۔ ہر چیز سے محبّت ہو جاتی ہے۔ مَشِیّتْ کو دیکھ کر اس کے ساتھ عمل کرنے کا لُطف آنے لگتا ہے۔ مَشِیّتْ تو ہے ہی رحمتِ عالم۔ مَشِیّتْ تو بے تاب ہے کہ انسان سے "میں" کا پردہ ہٹے اور حق تک اس کی رسائی ہو۔ پھر جمعیت کے لئے رحمت کی بے تابی کا کون اندازہ لگا سکتا ہے۔ یہ معراج کا نکتہ ہے۔ اُمتّی اُمتّی والی بات ہے۔ لوحِ محفوظ سے اوپر کی بات ہوتی ہے یہ رحمت لِلّعالمین' اس مقام سے لوح محفوظ کے لکھے کو بھی بدلا جاسکا ہے۔ مشیّتِ حق تو لَوْلَاکَ مَاخَلَقْتُ الْاَفْلَاکَ کا پیغام دے رہی ہے۔ مشیّتِ حق نظر نہ آسکے تو مشیر حق پر ہی کم از کم انسان اعتماد کر لے تو بات بن

جاتی ہے۔ مشیر حق وہی ہو گا جو امر باللہ رکھتا ہو۔ جو مشیر رسولؐ ہو۔ انا اُمتّی کا مقام رکھتا ہو۔ جسکی جان' جانِ عالم ہو۔ ایسے مرکز کے گِرد خود نشر حق ہونے لگتا ہے کیونکہ وہ سوائے حق کے کچھ نہیں بولتا۔ وہ خود بندہ ہیچدان ہوتا ہے۔ فنا کا مقام حاصل کئے اور حق سے واصل' حق کے ساتھ بقاء کے لئے۔ اس کی حَیَاتُ اَلْحَیَات سے منسلک ہوتی ہے۔ ایسی ذات جب درمیان میں آجاتی ہے تو مخلوق خود جمع ہونے لگتی ہے۔ لائحۂ عمل خود بخود بننے لگتے ہیں۔ اور راستے کھلنے شروع ہو جاتے ہیں۔ ایسی ہستی کی ہر بات پر لوگ آمنّا و صدّقنا کہنے لگ جاتے ہیں۔ اس کے قلب سے جو بات نکلتی ہے ہدایت لئے ہوتی ہے۔ دوسرے قلوب خود اس کی تصدیق کرنے لگتے ہیں۔ اس لئے کہ وہ سوائے حق کے کچھ نہیں ہوتا۔ حق میں دُوئی کہاں۔ ایسے مرکزِ حق کے باوجود میں پائیداری ہوتی ہے کیونکہ اس کے پیچھے کوئی اور ہاتھ کام کرتا ہے' مشیّتِ حق' امر باللہ۔

صاحبِ حق کی احتیاج اور کار فرمائی

چراغ جتنی روشنی دیتا ہے اس کے گرد اتنا ہی اجتماع ہوتا ہے۔ سورج نکل آئے تو مخلوق فیض یاب ہونے لگتی ہے۔ یہ خود بخود ہو جاتا ہے۔ اجراء حق کے لئے احیاء اُمّت کے لئے صاحبِ حق کی ضرورت ہوتی ہے۔ اُمّتِ مُسلمہ کا سارا عالم تابع فرمان ہو سکتا ہے۔ کوئی اٹھے تو امر اور صداقت کے ساتھ' ایمان کے ساتھ۔

یہ چھوٹی چھوٹی جماعتوں کی جھوٹی ملّمع کاری جو نظر کو خیرہ کرتی ہے اس میں صداقت نہیں۔ کہاں امر باللہ کی بات کہاں انسانی کاوش' خواہ کتنی ہی صداقت اور انہماک کے ساتھ کیوں نہ ہو۔ جس کام کے پیچھے مشیّتِ حق نہ ہو اس کی بساط کیا۔ مومن تو حق کی مشیّت کو تلاش کرتا ہے۔ نہ کہ اپنی بنائی ہوئی راہوں پر حق کو چلانے کا خواہش مند ہوتا ہے۔ ان چھوٹی جماعتوں کا دائرہ عمل محدود ہوتا ہے۔ اپنی مختصر جماعت کے نظریوں اور نفسا نفسی سے ہٹ کر اَنَا اُمتی والی بات' یا رحمت لِّلعالمینی شان ان جماعتوں میں نہیں ہوتی۔ ان کا لائحۂ عمل بہت نچلی سطح پر ہوتا ہے اور صرف دنیاوی زندگی سے متعلق۔ ایسی جماعتیں کوئی مستقل پیغام دنیا کو نہیں دے سکتیں۔

احیاء امّت کے لئے یہ جاننا ضروری ہے کہ عالمِ مثال میں جو کچھ بھی ظہور میں آتا ہے وہ عالم امر کی کار فرمائیاں ہیں۔ ایک دنیا کا نظام ہی کیا' لا تعداد باطن کے میدان ہیں' قلب و رُوح کے میدان ہیں جن میں عالمِ امر کے سہارے سے کام کرنے کی ضرورت ہے۔ البتہ عالمِ امر سے تعلق پیدا کرنے کے لئے مَشِیّتِ حق سے نسبت قائم کرنی ہوتی ہے۔ اِنّا فَتَحْنَا کا پیغام اگلی صدیوں میں اسلام کے لئے ہمیشہ کھلا ہے۔ اسلام تو جائے امن ہے۔ کیا افراد کے لئے' کیا جماعت کے لئے اور عالمین کے لئے اسلام کی وُسعتیں لا محدود ہیں۔ اب بھی عالم امر میں مملکت باطن میں ایسے ہزاروں میدان ہیں جن میں موجودہ مسلمان نے قدم ہی نہیں رکھا اور اپنی مختصر اور محدود ظاہری زندگی کو سدھارنے میں ہی ساری کاوشیں ختم کر دیں۔ وہ بھی صرف دنیاوی سطح پر اور بہت مُبتَذل طور پر حالانکہ دنیا کو دنیا کے طریقوں سے ہی اعلیٰ طور پر' صداقت اور انہاکِ کار سے سنبھالنے سے دوسری قومیں کہیں عام ظاہر کی زندگی میں کہیں سے کہیں پہنچ چکی ہیں۔

اسلامی امّت کے احیاء کی بات تو دونوں جہانوں کی سرداری کا سودا ہے۔ ظاہر و باطن کا سودا ہے۔ مشیتِ حق تو ہے کہ امّتِ محمدیہؐ کو پھر سے سرداری عطا ہو۔ لیکن قوموں کا اٹھنا انسانی قوانین اور کوششوں سے باہر کی بات ہے۔ کیونکہ زندگی سے سرچشمہء زندگی پیدا نہیں ہوتا۔

عمرؓ نے بھی شعاعیں بنائی نہیں بلکہ جب ظاہر بین نگاہوں سے سورج چھُپ گیا تو پھیلی ہوئی شعاعوں کو ایک جگہ جمع کر دیا تھا۔ عمرؓ بننا اپنے بس کی بات نہ تھی البتہ جو منتخب ہو چکا ہو وہی عمرؓ بن سکتا ہے۔ اپنی کوشش یا انسانوں کے کہہ دینے سے عمرؓ نہیں بنتا۔ لیکن کیا جب تک عمرؓ نہ بھیجا جائے کچھ نہ کیا جائے۔؟ کیوں نہیں سطح کا فرق ضرور ہو گا مگر صداقت سے کوئی چیز کی جائے تو اللہ صلہ ضرور دیتا ہے۔ جمعیت کے ہر عمل میں برکت ہے۔ صلحِ کُل کا نقشہ کوئی ایک گروہ پیش کرے تو مخلوق خود جمع ہونے لگتی ہے۔ برکت کی تشریح کی نہیں جاسکتی' یہ کر کے دیکھنا ہوتا ہے۔

افراد میں ملّت کے احیاء کی تڑپ بلاواسطہ نہیں ہوتی۔ یہ بھی اسی مشیّتِ حق کے تحت ہے۔ جو احیاء اسلام کے لئے حق کی طرف سے مقرر ہو چکی ہے۔ انشاء اللہ چالیس یا زائد سال میں دینِ متین پھر سے سربُلند ہو گا۔ لہٰذا بسم اللہ کہہ کر جو بھی قدم اٹھائے اس کی کشتی الحیات کے سمندر میں تیرنے لگے گی۔ اور اس صداقت کی وجہ سے دوسرے بھی اسی طرح کثیر تعداد میں یہ کرنے لگ جائیں گے اور سارا بیڑا بحرِ حق میں موجزن ہو جائے گا۔

مگر اس کا سارا راز امرِ بسم اللہ میں ہے۔ یہ حاصل ہو جائے تو کائنات میں صرف ایک باایمان شخص کوئی قدم اٹھائے تو اس کے ایمان کی خوشبو سے دو سے چار اور پھر کثیر تعداد میں خلقت اس پیغام کو اٹھانے لگ جاتی ہے۔

اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ کا وعدہ کھلا ہے۔ وعدۂ فرقان غلط نہیں ہو سکتا یہ امّت بنائی ہی اس لئے گئی ہے کہ خیرِ اُمّت کا لقب اسی پر صادق آئے۔ اور قائم ہی اس لئے رکھی گئی ہے کہ اس کے ذریعے منشائے الٰہی پورا ہو جائے گا۔ جب محبوبؐ کو اپنا لیا ہے تو اس کی امّت کو بھی اپنا لیا گیا ہے۔ وگرنہ بغیر محبوبؐ کے امّت کی اپنی حقیقت کچھ نہ تھی۔ یہ رمز جب امّت نے پالیا اور اس کے محبوبؐ کا دامن پکڑ لیا اور شِدّتِ عشق کے ساتھ پکڑ لیا' حقیقتِ محمدیؐ کو نہ صرف سمجھ لیا' بلکہ اپنا لیا' تو زمانہ ہی پلٹ جائے گا۔ یہ فراق کا طویل دور وصال کی دائمی لذّت سے بدل جائے گا۔ چودھویں صدی میں راستہ وصل سے ہی شروع ہو گیا ہے۔

باب ۲

نیازِ بے نیاز

تاریخی پس منظر

چودھویں صدی کی بابت مختلف مذاہب کی تقریباً ایک جیسی روایات ہیں۔ کچھ اس زمانہ کو 'کَل جُگ' تاریک زمانہ کہتے ہیں اور کچھ اسکو آخری زمانہ بتاتے ہیں۔ اس لئے کہ عام رجحانِ خلق بہ ظاہر مذہب سے ہٹا ہوا ہے اور عوامُ الن۔ ّاس تک کا یہی خیال ہے کہ دنیاوی زندگی کی تمام آلائشوں نے بلائے آسمانی بنکر انسانیت کو جکڑ رکھا ہے' جس کا لازمی نتیجہ عذابِ الٰہی کی شکل میں رونما ہو گا۔

اس میں شک نہیں کہ اس صدی کا ظاہر خول ہی خول رہ گیا ہے اور اسلام جو دین مُبین تھا اور دنیا کے لئے روشنی بن کر آیا تھا، آج ایک ماضی کی یاد بن کر رہ گیا ہے۔ ظاہر دار مذہب پرستوں کا یہ حال سب پر ظاہر ہے کہ وہ مذہب کا مقدّس لباس اوڑھ کر دراصل اپنی انا کی پرستش میں لگے ہوئے ہیں۔

دیکھنے والی آنکھوں نے صدیوں پہلے دیکھ لیا تھا کہ کن نقشوں کے تحت حیاتِ انسانی رواں ہے اور چودھویں صدی تک دنیا کے ہر گوشہ کا کیا نقشہ ہو جائے گا۔ ان خیالات نے گذشتہ چند صدیوں میں اتنی وُسعت اختیار کر لی ہے کہ بیشتر تعداد بنی نوع کی یہ یقین رکھتی ہے کہ اس دور میں دنیا پر بڑی تباہیاں آئینگی۔ چنانچہ کئی سو سال پہلے بزرگانِ دین بھی یہی کہتے چلے آرہے تھے اور موجودہ زمانہ کے مجذُوبین نے بھی یہی خبر دینا شروع کر دی تھی کہ تباہی آنے والی ہے۔ دنیا کے مختلف ممالک کے نجومیوں نے ستاروں اور سیّاروں کا حسب لگا کر متفقہ طور پر ی بھی بتا دیا تھا کہ ۴ فروری ۱۹۶۲ء کو سورج گرھن ہو گا' آٹھ سیّارے ایک ہی بُرج میں جمع ہو جائینگے جیسا کہ چھ ہزار سال قبل مہار بھارت کے وقت ہوا تھا اور اسکے علاوہ یہ سیّارے ایک لائن میں بھی ہونگے جیسا کہ پچیس سال قبل طُوفانِ نُوحؑ کے وقت ہوا تھا۔ گویا تمام ظاہری اور باطنی نظامِ حیات اس بلائے عظیم کا منتظر تھا جو دنیا پر آنے والی تھی۔ یہی کچھ نوشہء تقدیر تھا اور یہی لوحِ محفوظ کا لکھا تھا کہ دنیا کی آبادی کے سات میں سے ایک بچے' اور وہ بھی اس لئے کہ پھر سے حق کا بول بالا ہو اور اس امّت کا' جس کو بہترین امّت فرما دیا ہے' پھر سے علم بلند ہو۔

کون اندازہ لگا سکتا ہے اس تباہی کا جس کی لپیٹ میں پوری دنیا کی دنیا ہو۔ اس گردش میں تو اچھے' بُرے سب ہی پس جاتے ہیں۔ اس کے تصوّر سے رُئواں رُئواں کانپ اٹھتا ہے کہ اس تباہی اور مکمل تباہی کی چکّی میں پسنے کے بعد ہی صدیوں کی سوئی ہوئی باطنی قوتیں بیدار ہو سکتی ہیں اور پھر سے حیاتِ انسانی کو صحیح رُخ عطا ہو سکتا ہے' تاکہ انسان حق کی طرف متوجہ ہو۔ یہ تو ہے قضائے مُبرم' نوِشتہء تقدیر' لوحِ محفوظ کی بات۔ لیکن رحمتً لِّلعالمین کی شان کچھ اور ہوا کرتی ہے۔ یہ لوحِ محفوظ سے بھی اوپر کی بات ہے' یہ معراج کا راز ہے۔

تمام قوموں کی مقدّس کتابوں میں یہ ذکر ہے کہ قہر و غضبِ الٰہی کو ٹھنڈا کرنے اور رحم و کرم کے طلب گار ہونے کے لئے بڑے بڑے پیمانوں پر نذر اور نیازیں پیش کی گئی ہیں اور قربانیاں دی گئی ہیں۔ یہ طریقہ زمانہء قدیم سے چلا آرہا ہے گو اس کا نفاذ صرف انفرادی زندگیوں تک محدود ہو کر رہ گیا ہے۔ مومنین کی بات دوسری ہے وہ بلائیں ٹلنے نہ ٹلنے کے لئے اتنے فکر مند نہیں ہوا کرتے جتنے کہ یار کو منانے کے لئے۔ یہ امّت کی خاطر ہوا کرتا ہے' اور یہ رَحمَتہ لِلعَالَمِیْن کی لاج کا سوال ہوتا ہے۔ تصرُّفِ رَحمَتہً لِلعَالَمِیْن ہی سے ۱۵ دسمبر ۱۹۶۱ء کو پشاور کی سرزمین کو ایک مرکز' ایک نشان بنا کر نیازِ بے نیاز پیش کی گئی جس کا ذکر ذیل میں درج ہے۔ اس نیاز کی اہمیّت تو باطن میں رسائی رکھنے والوں پر ۱۵ دسمبر ۱۹۶۱ء کے بعد ہی ظاہر ہو چکی تھی

البتہ ظاہر بیں آنکھوں کو یہ نقشے اس وقت ظاہر ہونگے جو مختلف ابتلائوں میں سے محفوظ گذرنے کے بعد تقریباً چالیس سال یا زائد کے عرصے میں دینِ مُبین پھر سے اَلْیَومَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ کے نیزہ پر بلند ہو گا۔

مرکزِ رحمت

تاریخ شاہد ہے کہ جب کبھی سوئی ہوئی حقّانی قوّتوں کو انسان میں بیدار کیا گیا ہے تو تازیانہء قضاو قدر کو حق نے استعمال کیا ہے کہ اس کے اپنے اس کی رحمت کے طالب ہو کر اس کی طرف لوٹیں۔ بہ ظاہر جلالی طاقتیں اس لئے چھوڑ دی جاتی ہیں کہ رحمت کو اپنی طرف رجوع کرنے کے لئے اُخوّت کے رشتہ میں بندھ کر قدّوسی جماعت' ایک مرکز پر جمع ہو جائے اور اپنی عاجزی سے رحمت کو اپنے اندر سمو لے۔

دنیا کی تاریخ کو دیکھئے بڑے بڑے مشاہیر عالم' دانستہ یا نادانستہ طور پر اسی راہ میں کوشاں رہے' اور اسی راہ میں کام آئے کہ حق کا بول بالا رہے۔ پیغمبروں کی امّتوں کے ورق گردانئے تو یہی بات واضح ہو گی کہ تمام کی تمام مشیّتِ حق یہی رہی ہے کہ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیہِ رَاجِعُوْن (ہم اسی کے ہیں' اس کی جانب رجوع ہیں) کی تکمیل کسی صورت ہوتی رہے۔

تمہیں حق کی کیا تلاش ہو گی جو خود حق کو تمہاری تلاش ہے۔ طُوفانِ نُوحؑ بھی آیا مگر اپنوں کو بچالیا گیا تا کہ جس حق و باطل کی معرکہ آرائی کے لئے اس دنیا میں انسان کو بھیجا گیا تھا' اس کا سلسلہ منقطع نہ ہو۔ یاد کرو وہ رات جب ایک مٹھی بھر جماعت کا سردار سربسجود تھا کہ اگر یہ مٹھی بھر جماعت مٹ گئی تو تیرا نام لینے والا دنیا میں کون رہے گا اور پھر وہ دن جب ۳۱۳ کی مختصر جماعت کو کثرت پر غالب کر دیا گیا۔ پھر حُسینؑ نے معہ اپنے تمام قافلہ کے سر دیا کہ ذبحِ عظیم قبول ہو اور رُوحِ کربلائی مردہ جانداروں کی رُوحوں میں سما کر ملّت کے نخل کی آبیاری تا قیامت کرتی رہے۔

معراج، آخر وہ کیا راز تھا کہ مکمّل قرب ہو جانے کے وقت بھی نہ ہوش گئے نہ معشوق حقیقی سے مل کر مدہوشی طاری ہوئی بلکہ اِدھر سے اُمتی امتّی اور اُدھر سے بخش دی کی صدا بلند ہوئی۔ لَوْلَاکَ مَاخُلِقَتْ (اگر تم نہ ہوتے تو میں کائنات کی تخلیق نہ کرتا) جس کے لئے ساری کائنات بنائی گئی ہو جو رَحْمَۃٌ لِّلْعَالَمِیْن کے لقب سے نوازا جائے جس پر اللہ اور اس کے فرشتے درود بھیجیں اور مومنین کو جس پر درود بھیجنے کا حکم ہو وہ اپنی انفرادی حیثیت کا تصوّر بھی کیسے کر سکتا ہے۔ وہ نہ صرف رحمتِ عالم ہے بلکہ خود عالمین اس سے ہیں اسی میں ہیں۔ خوش نصیبی ہے کہ اس کا علم چودھویں صدی میں بھی بلند ہے' اور تا ابد رہے گا۔ وہ صاحبِ تاج و معراج و بُراق و عَلم، خود زندگی کی تابندگی میں ایک سلسلہء جاریہ کی طرح پابند ہے اسی کے طفیل بلا' وبا' قحط' و مرض' والم دفع ہوتے ہیں۔ بات اتنی سی سمجھ لیں کہ محمدؐ ہم میں موجود ہیں تو پھر سرمایہء حیات' کُنْتُ کَنْزاً مَخْفِیاً سے علیحدہ معلوم نہ ہو گا۔

چودھویں صدی اور اس کارجحانِ شیطنت عبد کو معبود سے جدا کرنے کا سامان بن گیا ہے۔ مگر محبّتِ عظیم خود بے تاب ہے کہ اپنے گم گشتہء منزل کو پھر سے راہ دکھائے۔ ایک طرف جلالی شان کا مظہر ہے کہ ہر ہست کو نیست کر دینے پر آمادہ ہے اور دوسری طرف رحمتِ عالم کی کملی پھیلی ہے کہ جو بھی اس میں آجائے امان میں رہے۔ جلالِ اور جمال اپنی آب و تاب سے مقابل میں صفر آرا ہیں اور وہ بے نیاز ہے۔ اَللّٰہُ اَحَدُ اللّٰہُ الصَّمَدُ۔

اسلام کے نام لیوائوں کا یہ حال ہے کہ جیسے جذام میں مبتلا ہیں۔ یہاں تک کہ ہڈیاں بھی گل چکی ہیں۔ لیکن ہیں نام لیوا کس کے ؟ ہیں کس کی امّت؟ خواہ نام کے لئے ہی ہوں۔ وہی سبق جو معراج کے واقعہ سے رحمتِ عالم نے دیا۔ اب کوئی اٹھے تو اُمّت کا بیڑا پار ہے۔ ایسے افراد اور ایسی جماعت جو رحمانی قوّتوں کو اپنے اندر جذب کر لیں' مرکزِ رحمت بن سکتے ہیں۔ یہ جماعت یا فرد ہی ہو سکتا ہے جو اَنَا اُمّتی کہہ سکے اور جس کی جان جانِ امّت ہو۔ یہی نسبتِ مُحمّدیؐ والی ہستی ہو گی۔ اسی میں مُحمّدؐ جلوہ گر ہونگے اور یہی محمدؐ سے ہو گا کہ فرمایا تھا حُسینؑ مجھ سے ہے اور میں حسینؑ سے۔ یہ مقامِ محمدیؐ والا عبد ہی عبد اللہ ہو سکتا ہے۔

نیازِ بے نیاز کیا ہے ؟ ایک نیاز مندی۔ ہر فرد کی طرف سے نہیں بلکہ صاحبِ مقام 'اَنَا اُمّتی کی طرف س اور محمدیؐ وسیلے سے رحمتِ عالم ہی جلال کو ٹھنڈا کر سکتی ہے' وگرنہ جلال وہ آگ ہے کہ انفرادی حیثیت سے اگر اولیاء بھی سامنے آئیں تو جل کر ختم ہو جائیں۔ جماعت کی برکت کے کیا کہنے۔ قربان جائیں اس زندہ جاوید محمدؐ کے جس نے عبودیّت کا راستہ سکھایا جس نے انسان کو اس کی انفرادیت کے محدود دائرہ سے نکال کر 'اُمّت کی وسعت میں لا ملایا۔ کہ اس کا سونا جاگنا، اس کی زندگی، اس کی قسمت 'امّت کے بے پایاں سمندر میں گھل مل جائے اور وہ بخشش و نجات کے چکر سے نکل کر عبدیّتِ کامل' مقام محمود تک پہنچ جائے۔ رحمتِ عالم کی کمی کے سایہ میں ہونا ایسا ہی جماعت کے لئے کہا گیا ہے جو لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ کے حصار میں ہو۔ پھر ایسی جماعت جاذبِ رحمت کیونکر نہ ہو' اور اس کی نیاز مندی کیوں کر قبول نہ ہو۔

نیاز کا طریقہ 'غریبوں' مسکینوں' قیدیوں' معذوروں کو کھانا کھلانا اس کی ربُوبیّت کے اظہار کا بہترین طریقہ ہے۔ عبد اور معبود کا تعلق قائم رکھنے کی کڑی ہے۔ بھوکا پیٹ بھر جانا وہ تسکین کُن بات ہے جو دُعا کے عین مترادف ہے۔ نہ اس کے لئے الفاظ کی ضرورت ہے نہ شکریہ کی۔ شُکر بالاخر اسی رب کا ہوتا ہے جو شہ رگ سے بھی قریب ہے' اور جو اس خاموش ذریعہء تشکّر و سکون سے مسرور ہوتا ہے۔ یہی سچا تشکّر ہے۔ اس لئے کہ انسان جھوٹ بول سکتا ہے لیکن پیٹ جھوٹ نہیں بول سکتا۔ یہی ذریعہء تشکّر جلال کی آگ کو ٹھنڈا کر دیتا ہے۔

جب انفرادی زندگیوں میں اس طریقہ کو مُستحسن بتایا گیا ہے' تو اجتماعی حیثیت سے اس کی بے بہائی کا کون اندازہ لگا سکتا ہے۔ اور خصوصاً اسوقت جب کہ اُمّت کا سوال ہو اور سوال پیش کرنے والا روحِ مُحمدیؐ کے تصرّف میں ہو۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہی دافع بلاء و قحط و مرض و الم ہیں۔

بشارتیں

بشارت میں پہلے سے دکھلا دیا گیا کہ ایک سُرخ رنگ چالیس سالہ ہیکل عورت سامنے سے آتی ہے لیکن حق کو سامنے دیکھ کر پھر واپس چلی جاتی ہے۔ جَاءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا۔ (حق آیا باطل گیا باطل دفع ہونے والا ہی ہوا کرتا ہے)۔

یہ بلا واپس جاتی ہے تو نظر آتی ہے کہ اس کی چھاتیاں اسکے کاندھوں کے پیچھے پیٹھ پر پڑی ہیں۔ یعنی رَبُوبِیّت اس کے پیچھے ہے۔

ایک اور صاحب نے دیکھا کہ جنگ کا سا سماں ہے لیکن کچھ لوگ ایک جگہ جمع ہو کر ذکرِ حق میں مشغول ہیں اور ان کے گرد کچھ سرخ پوش بیوگل والے لوگ فرشتوں کی طرح حفاظت کے لئے کھڑے ہیں۔

کسی نے دیکھا کہ تاریک بادل یکایک آتے ہیں۔ لیکن کچھ عرصہ بعد رحمت کی بارش ہونے لگتی ہے گویا طرح طرح سے اپنے بندے کو تسکین دی کہ نااُمید نہ ہو رحمت ضرور آئے گی۔ وہ فکر مند تھا کہ تقدیر کا لکھا کچھ اور تھا۔ آمرین حق اس کے منتظر تھے اور سالکین اپنے کو بے بس سمجھ کر راضی بہ رضا تھے۔ اور عوام اپنے اس تخیل میں مست کہ

موت ہے اس قدر قریں مجھے نہ آئے گا یقیں'

یوں ہر بادی سے انفرادی طور پر اللہ کے بندوں میں سے ایک بھی نہیں ڈرتا۔ وہ بھی بے نیاز ہوتے ہیں لیکن یہ اُمّت کا سوال تھا۔ یہ مٹھی بھر جماعت کی بربادی کا سوال تھا۔ رحمتِ محمدیؐ کو جوش میں آنا ہی تھا۔ عالم امر سے ایک اور اُونچا مقام بھی تھا جہاں لوحِ محفوظ کے لکھے کو بدلا جا سکتا تھا۔ یہ وہی سمجھ سکتا ہے جس کے ہاتھ میں مُحَمَّد صلی اللہ علیہ وسلم کا دامن ہو۔ خیالی طور پر نہیں بلکہ اتنا اپنا لیا گیا ہو کہ اس کا مصداق ہو کہ حسینؑ مجھ سے ہے اور میں حسینؑ سے۔

جمعہ ۶ رجب ۱۳۸۱ھ ۱۵ دسمبر ۱۹۶۱ء ایک یادگار دن ہے اُمّت کے لئے اور خصوصاً اس خطہ کے لئے جس کی حیا کو' تہذیب کی دسترس سے بچا کر' پہاڑوں کے دامن نے صدیوں تک حجاب میں رکھا ہے' کہ اسکی پاکیزہ صورت کی رُونمائی اس وقت ہو' جب منشائے قدرت اپنی محبُوبیّت کے لئے اس کو منتخب کرے۔

غیبی امداد

اُمّت کے درد رکھنے والوں کی بے قراری کو دیکھ کر خود رحمت عالم نے فرمایا کہ ''آنے والی گردش ایام سے کیوں متفکر ہوتے ہو۔ دس ہزار غریبوں' یتیموں' معذوروں قیدیوں کو کھانا کھلاؤ'' دل نے گواہی دی کہ ان میں سے ایک ایک کا دس ہزار گنا اجر وہ مجموعی صورت اختیار کرے گا کہ یہی عمل جاذب رحمت اور دافع بلا کا ذریعہ ہو جائے گا۔ درود و سلام خدا' فرشتوں اور مومنین کے تجھ پر۔ تجھ سے زیادہ امت کے لئے بے قرار کون ہو سکتا ہے۔ تجھ سے زیادہ رحمت عالم کون ہو سکتا ہے۔ تجھ سے زیادہ نیاز مندی کون کر سکتا ہے۔ جب تیری رضا شامل حال ہو' تو ارادہ اور خلوص کے چند قدم آگے ہی عمل کے دروازے خود بخود ایک خوبصورت منظر کی طرح کھلتے چلے جاتے ہیں۔ ادھر تیرے بندے کی زبان سے تیرا حکم لوگوں تک پہنچا اور اِدھر آمنّا و صدّقنا۔ یقین والے' ضعیف الاعتقاد' اور مُنکر' سب کے سب تیرے نام کے تصرف سے اپنی نیاز مندی پیش کرنے کے لئے کمربستہ ہو گئے۔

مالدار، متوسط، غریب، سب ایک صف میں آراستہ ہو گئے۔ ساری اونچ نیچ مٹ گئی۔ روپیہ فراہم کرنے کا جہاد عجب شان بے نیازی سے ہوا۔ ایک فرد نے ہی تمام اخراجات اٹھانے کا کفیل بننا چاہا اور تیرا بندہ تیری رحمت کے احسان سے سر بہ سجود تھا۔ لیکن جماعت کی شرکت برکت کے لئے ضروری تھی اس لئے ایک ایک پیسہ بھی آنکھوں سے لگا کر قبول کیا گیا اس میں اندھے معذوروں نے، مزدوروں اور غریبوں نے، عورتوں اور بچوں، جوانوں، بوڑھوں نے، آرزومندی سے اپنی اپنی رقمیں پیش کیں۔ ہر قوم اور ہر طبقہ کے انسانوں نے اس عظیم کام میں شرکت کو اپنی سعادت سمجھا۔

کچھ شاندار مثالیں ایسی بھی ہوئی کہ اپنے گھر سے سب کچھ دے ڈالا یہاں تک کہ جہیز کے زیور بیچ کر بھی اپنے خلوص کی نذر پیش کر دی۔ اور خوبی یہ کہ سب کچھ اس طرح ہوا جیسے کہ کسی کلدار مشین کو چلا دیا گیا ہو کہ یہ کام صرف چند انسانوں کی کوشش سے مختصر عرصہ میں خاطر خواہ طور پر پورا ہوا۔ اور غالباً صرف دو سو تین سو آدمیوں نے ہی اس آواز پر لبیک کہی۔ لیکن یہ ان کے دل کا خلوص، ان کے ایمان کی روشنی، ان کی حیا کی چادر تھی، جس نے ہزاروں کے عیبوں کو ڈھانک لیا۔ اتنا ضرور ہوا کہ اس روپیہ جمع کرنے کی مہم اور نیاز کے انتظامات میں اچھا بُرا ایسا چھان کر علیحدہ کر دیا گیا کہ جیسے کہ حق کی چھلنی سے ایمان اور ظُلمت چھان کر علیحدہ کر لی جاتی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ اسی قسم کے مواقع پر ہی کھرے کھوٹے کی تمیز ہوتی ہے اور ایسے ایسے نقشے نظر آتے ہیں کہ انسان میں اپنی بے بضاعتی، اپنی کوتاہی، اپنی کم نظری اور کا احساس ہوتا ہے، اور اسے صاف نظر آنے لگتا ہے کہ کس لئے اللہ نے لوگوں کے دلوں کا حال جاننے والی ذات صرف اپنی ذات کو کہا ہے۔

روپیہ فراہم کرنے، اجناس خریدنے، کھانا پکوانے اور تقسیم کرنے کے سلسلہ میں لوگوں نے ایسے انہماک سے کام کیا کہ کبھی اپنے ذاتی کام میں بھی اتنی ذمہ داری محسوس نہ کی تھی۔ آخر وہ کونسا جذبہ تھا جس نے ذاتی آرام چُھڑا کر انہماک کار عطا کیا۔ اجتماعی ذمہ داری بھی عجب کیفیت کا مظہر ہوتی ہے۔ سب ہی لیڈر، سب ہی خادم، سب ہی مُخلص، سب ہی صادق۔ نہ عمر کی کمی زیادتی، نہ اقتصادی اونچ نیچ، نہ عِلم و کم عِلمی کا فرق، نہ بُزرگی کی تقدیس، سب کے سب ایک ہی گھاٹ، سب کے سب ایک ہی صف میں حضوری دل سے رجوع اِلاّ اللہ۔ یہ ہوتی ہے جماعت کی برکت، یہ ہوتی ہے عملِ صالح کی برکت۔ اس میں انفرادی پہلو کا شائبہ تک نہیں رہتا۔ ایسے لوگ مئے وحدت سے سرشار ہوتے ہیں، اور مقامِ احدیّت میں ہوتے ہیں، آپس میں بھی اور اپنے رَبّ کے حضور میں بھی۔ ۱۳ دسمبر ۶۱ء بدھ کی صبح سے دُنبے کٹنے شروع ہوئے، مذبح کا اس وقت کھولدیا جانا بھی امداد غیبی سے ممکن ہوا تھا۔ اور یہ امداد غیبی تو تمام نیاز کے دوران میں ہر کام، ہر قدم، ہر خیال ہر عمل پر شامل حال تھی۔ شام تک مذبح کا یہ عالم تھا کہ بُقعہء نور، کسی نے کبھی اس کا تصوّر بھی کیا ہے کہ مذبح بھی بقعہء نور ہو سکتا ہے۔ حقیقت یہ تھی کہ صف در صف پاکیزگی سے گوشت رکھا ہوا اس کا ظاہری ثبوت تھا۔ قصابوں کے چہرہ پر دمک اسکی نشانی تھی۔ تمام کارکنان کی پیشانی کی بشاشت اس بات کی دلیل تھی۔ خود قصابوں کا کہنا ہے کہ ہم نے بارہا قربانیاں کی ہیں لیکن نذر کے لئے یہ کام کرنا تائید غیبی سے متاثر ہو کر ممکن ہو سکا ہے۔ وگرنہ اس عظیم کام کے کرنے کی ہمّت نہ پڑتی۔ یہ ہوتی ہے نیاز کے جانوروں کی اہمیت، یہ ہوتی ہے قلب مومن کی کیفیت۔ یہ چھری اٹھا کر جانور کو حلال کرنا خود اپنی جانوں کو حلال کرنا ہوتا ہے۔ خود اپنی صداقتِ ایمان سے نذر میں شامل ہونا ہوتا ہے۔ سُنّت خلیل اللہ کی تکمیل کوئی آسان کام نہیں۔

۱۴ دسمبر ۶۱ء جمعرات کی صبح سے جناح پارک میں نیاز پکانے کا کام شروع ہوا۔ قناعتیں' شامیانے اور چھولداری شام تک لگا دیئے گئے۔ بجلی کی روشنی کا انتظام کر دیا گیا۔ میونسپلٹی کی پانی کی گاڑی سے پانی پہنچانے کا سامان کر دیا گیا۔ یہ اور پانی کی بہم رسانی ۱۴ دسمبر کی صبح سے لے کر تمام دن اور تمام رات جاری رہی۔ یہ پانی کا انتظام بھی بذاتِ خود ایک مہم تھی وگرنہ وہاں دور دور پانی نہ تھا۔ اور پھر اس مقدار میں جس کی کہ ضرورت تھی۔ بظاہر یہ بھی ناممکن یا سخت دُشوار بات تھی۔ مگر واہ رے بے نیازی کہ جب رحمت کے چشمے سے ننھے اسماعیلؑ کو پانی دے سکتا ہے تو یہ چشمہ تو تا قیامت خشک ہونے والا نہ تھا۔ یہ تو اللہ کی سُنت جاریہ تھی۔ پھر اس بار بھی یوں کیسے نہ ہوتا کہ جیسے پانی کے چشمے جاری کر دیئے گئے ہوں۔ اگر پانی کی بہم رسانی کا سلسلہ ٹوٹتا تو وقت پر نیاز تیار ہونا ناممکن ہو جاتا۔ پانی لانے میں رکاوٹیں ضرور پڑیں۔ آخر بی بی ہاجرہ کی سُنّت ادا ہونی تھی۔ اس لئے یہاں بھی یہ ہوا ہے کہ تقریباً ایک ایک گھنٹہ گاڑی اپنے بوجھ کی وجہ سے جناح پارک کی نرم گیلی زمین میں دھنس دھنس گئی اور صورتِ حال یہ ہو گئی کہ اس کا نکالنا ناممکن سا نظر آنے لگا۔ لیکن فضل ربی' تائید غیبی دونوں بار شامل حال رہی۔ اور بہ ظاہر سخت دُشواری کسی نہ کسی طرح دُور ہو گئی اور پانی کا سلسلہ ٹوٹنے نہ پایا۔ یہ رکاوٹوں کا آنا اور خود بخود ہٹ جانا' کچھ ایسا ہی سماں ہوتا ہے جیسا کہ اندھیرا چھٹ کر روشنی آئے' باطل ہٹ کر حق آ جائے اور یہ بین نشانی اس بات کی ہوتی ہے کہ تائید غیبی شامل حال ہے۔ پھر خود دیکھو اس کام کی برکت اور اہمیت جس میں خود حق کی رحمت کے دریا کی روانی میں' ہمارا وجود یا مشاہیر اور آمرین تک کا وجود ایک کشتی کی طرح ہوتا ہے کہ خود دریا کی رو اسے بہا کر لئے جا رہی ہے۔ کشتی والوں کو یہ کہنے کا حق کب حاصل ہوتا ہے کہ انکی کوشش سے کشتی چل رہی ہے۔ اور یہ تو ایک فضول بات ہو گی کہ کشتی کے اندر جو مخلوق ہے کہے کہ وہ دریا چلا رہی ہے۔ اپنے نفس کے خول میں بند کشتی آنکھ دیکھ بھی کیا سکتی ہے' لیکن جنکی نگاہ میں وُسعت ہے' جو اس نظارہ کو باہر سے دیکھتے ہیں وہ بحر حق مرضیء حق کے سوا کچھ نہیں دیکھتے۔

۱۴ دسمبر کی رات بھی ایک اہم رات تھی۔ اسکی اہمیّت وہ جانے' جو نیاز بے نیاز کی اہمیت سمجھتا ہو۔ یہ سر دھڑ کی بازی ہوتی ہے۔ اور اپنے سر دھڑ کی ہوتی تو خیر تھی۔ یہ تو مٹھی بھر جماعت کے سر دھڑ کی بازی تھی۔ یہ اُمّت کے مستقبل کی بازی تھی۔ یہ ایک ڈوبی کشتی کو ترانے کی بازی تھی۔ یہ اُمّت کے جذام سے گلے ہوئے جسم اور ہڈیوں میں پھر سے جان آنے کی بازی تھی۔ یہ تو ایسا ہی دشوار کام تھا جو پیرانِ پیر کو کرنا پڑا تھا اور محی الدینؒ کہلائے۔ پھر اس عظیم کام میں روح محی الدینؒ کیسے شامل حال نہ ہوتی۔ یوں جناح پارک کے دو مختلف کونوں میں اسی شام دو مجذوب یہ کہتے پائے گئے کہ سب کچھ بے کار کر رہے ہیں۔ سب مرینگے۔ سب تباہ ہوں گے نوشتہء تقدیر نہیں بدلتا عذابِ الٰہی ضرور آئے گا۔

کون سمجھ سکتا ہے اسکا حال جو رحمت پر امید باندھے بیٹھا ہو۔ کون گن سکتا ہے اس کے نازک دل کی دھڑکنیں۔ کون دیکھ سکتا ہے کانٹے کی نوک پر شبنم کے قطرہ کی بے تابی۔ یہ تو وہ وقت ہوتا ہے کہ پیغمبرؑ بھی کانپ اٹھتے ہیں پکار اٹھتے ہیں کہ اللہ کی مدد کب آئے گی۔ یہ تو وہ وقت ہوتا ہے کہ رات بھر سجدۂ نیاز مندی ہوتا ہے۔ ناامیدی کے سمندر میں امید کے نازک تار باندھے جاتے ہیں۔ جلال کی آگ کو عجز کے آنسوئوں سے بجھایا جاتا ہے۔ یہ شب بدر ہوتی ہے' شب عاشورہ' شب طوفانِ نوحؑ' ہر چیز ساکت' ہر سانس ذاکر۔

ادھر پس پردہ یہ منظر معبود کی بارگاہ میں عبد مکمل عبدیّت میں عفو و درگزر کا طالب' رحم و کرم کا جویا' روٹھے کو منانے کی مہم میں سرگرداں ادھر سربام یہ منظر کہ ہزاروں کے لئے کھانا پکنے کی مہم درپیش۔ نہ انتظام کا کسی کو تجربہ نہ کسی میں صلاحیت۔ مگر اپنوں کی ایک چھوٹی سی جماعت

حاضری کے لئے تعینات۔ ان کے لئے یہ موجودگی ایک تقریب' ایک جشن' ایک فرض۔ خوشنصیب ہوتے ہیں ساتھی' کہ انکی صداقت یہ قبول ہو جاتی ہے۔ نہ انکے لئے عمل اور بے عملی کا حساب کتاب' نہ تقدیس و تکذیب کا عذاب ثواب۔ وہ تو ایک چادر کے سائے میں ہوتے ہیں۔ عشق کا جام پئے' دنیا ومافیہا سے ماوراء۔ کرتا وہی ہے جسے کہتے ہیں کہ غیب میں ہے۔ اور ہوتا وہی ہے جسے کہتے ہیں کہ تائید غیبی سے ہو رہا ہے۔

بیانِ نیاز' رحمتوں کا نزول

جمعرات کے دن سے تمام شام اور شام رات نیاز پکتی رہی۔ وہ قطار در قطار دیگوں کی ترتیب اور باورچیوں کا مسلسل انہماکِ کار' جیسے ایک مہم سر کرنا تھی۔ وقت اور انسانی کوشش کی دوڑ شانہ بہ شانہ جاری تھی۔ سچ ہے جماعت کی برکت بھی عجب چیز ہے۔ باورچی' ماشکی' مسالچی' منتظم' سب کے سب ایک ہی سلسلہ میں بندھے ہوئے۔ رات کے دو بجے ہی سماں دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ گرم دیگوں سے نکلتے ہوئے بخارات اور چولھوں سے دھوئیں کی آڑ میں باورچی ایسے نظر آتے تھے گویا کہ کسی دوسری دنیا سے آئے ہوئے فرشتے۔ تمام دن اور تمام شام کام کر چکنے کے بعد دو بجے رات بھی انکے بازو ایسے تیزی سے دیگ چلانے میں لگے تھے' جیسا کہ تازہ دم انسانوں کے منتظمین میں سے کچھ نے تقریباً تمام رات اپنے پیروں پر کھڑے اور چلتے گذاری تھی اور کچھ ایک جگہ بیٹھے جشن کی رات منا رہے تھے۔ انکی وابستگی کے لئے ایک قلندر خدا جانے کہاں سے آوارد ہو گئے تھے۔ فرماتے تھے' پنڈی سے ریل سے اتر کر آیا ہوں' اور راستہ بھول کر اِدھر آ گیا ہوں۔ رات بھر محفل گرم رکھی۔ لوگ جاگتے رہے اور جاگتے لوگوں کے سہارے باورچی اپنے کام میں تمام رات بغیر آرام کئے منہمک رہے۔ یہ قلندر دُعا کے وقت تک موجود تھے۔ پھر یکایک غائب۔ بغیر اطلاع کے جیسے آئے تھے' ویسے ہی روانہ ہو گئے۔ جس خیمہ سے دُعا پڑھی جا رہی تھی اس میں ہزاروں کے مجمع میں خدا جانے کیسے پہنچ گئے تھے۔ ان کا تمام طرز بتاتا تھا کہ کہ کوئی صاحب خدمت ہونگے۔

رات گزری، نور کا تڑکا ہوا۔ رحمتوں کا نزول شروع ہوا۔ پہلی نشانی یہ کہ ایک سفید ریش بزرگ سفید لباس میں ملبوس پو پھٹتے ہی کھانا پکنے کا منظر دیکھنے آئے تھے اور قناتوں کے دروازے پر کھڑے کھڑے رہ کر واپس چلے گئے تھے۔ ایسا معلوم ہوا کہ حق خود اپنے لئے انتظام دیکھنے' اپنے بندوں کی محبّت میں انہی کا سا روپ لے کر تشریف لائے تھے۔ مرغانِ سحری رب کی حمد میں نغمہ سرا ہوئے۔ اذان کی صدائے اللہ اکبر بلند ہوئی اور قادری علم ایک درخت پر بلند کر دیا گیا۔

علم کا بلند ہونا معمولی بات نہیں ہوا کرتی۔ یہ حکم سے ہوا کرتا ہے اور حکم کیا ہے؟ کُنْ فَیَکُوْنْ۔ اسی کی برکت سے رحمتوں کی چادریں طبق در طبق کھلنے لگیں' تاریکی کے پردے ہٹنے لگے' اور انوارِ رحمت کا مشرق سے لے کر مغرب تک نزول ہونا شروع ہوا۔ جو درخت کل تک ایک معمولی درخت تھا' اب اس علم کی برکت سے شجر مبارکہ' زیتونہ' لاشرقیہ ولاغربیہ بن گیا تھا۔ ایسا کہ جس کی مثال اس وقت صفحہء ہستی پر کہیں بھی موجود نہ تھی۔ یہ ہوتا ہے علم کا بلند کیا جانا۔ علم بلند ہوتے ہی ملائکہ' اجنا شہدا' مجاہدین کے شانہ بہ شانہ صف آرا ہو جایا کرتے ہیں۔ انسان گروہ در گروہ' قبیلہ در قبیلہ اس علم کے سایہ میں آنا شروع ہو جاتے ہیں۔ پاک رُوحیں اور اولیائے کرام کی ارواحِ مقدّسہ اسی عَلم کے سایہ میں آن کھڑی ہوتی ہیں۔ قادری عَلم کا بلند ہونا اور قادری چادر کا اُوپر پھیلا ہونا' پھر انکے سایہ کی مشرق سے لیکر مغرب تک وُسعت تو وہی دیکھ سکتے ہیں جنکی باطن کی آنکھ کھلی ہو۔ ظاہر بیں

آنکھوں سے صرف تائید نظر آسکتی ہے۔ماحول کی دلکشی سے ‘موسم کی ساز گاری سے ‘لوگوں کے خلوص اور دیانت اور شوق سے ‘ہزاروں کے مجمع میں ترتیب و تنظیم قائم رہنے سے ‘اور کھانے اور نیاز میں برکت سے۔ یہ اور اسی قسم کی متعدد تائیدیں اس بات کا ثبوت بن جایا کرتی ہیں کہ باطن میں اس واقعہ کی کیا اہمیت ہے۔

دمِ سحر قلعہ بالاحصّار اور اس کے دامن میں جناح پارک میں نیاز کی جگہ کا جن آنکھوں نے نظارہ دیکھا وہ گواہی دے سکتی ہیں کہ اس نظارہ میں کیا دلکشی تھی‘ کیا کیف تھا‘ کیا نشانی تھی۔ بارش کا نہ صرف امکان بلکہ خطرہ تھا۔ لیکن صبح سویرے ‘خورشید نے اپنے مسکراتے چہرے سے ضُوافشانی کی اور لوگوں نے خلوص کے ساتھ ترتیب سے کھانا کھلانے کے لئے فرش آراستہ کرنے شروع کر دئے۔ گویا کہ نماز کی تیاری ہوتی ہو یا جشن کا اہتمام ہوتا ہو۔ مختصر سی جماعت نے دریاں کاندھوں پر اٹھا اٹھا کر پھیلانا شروع کر دیں۔ نہ اپنے کپڑوں کا خیال نہ پوزیشن کا‘ نہ اس بات کا کہ کون مُنتظم بن کر حکم دے‘ اور کون کارکُن بنے‘ سب ہی منتظم ‘سب ہی کارکن‘ نیت جو سبکی ایک تھی۔ ارادہ جو سب کا بلند تھا۔ ترتیب و تنظیم کا یہ منظر کہ ساڑھے آٹھ بجے باوردی پولیس کے لوگ آپہنچے جو دروازوں‘ قناتوں اور ریلوے لائین کی کھلی طرف جگہ جگہ تعینات کر دئے گئے اور 9 بجے تک اندرونی انتظام اور تقسیم کے لئے سول ڈیفنس کے لوگ وردیوں میں اور بہت سے والینٹر کارکن بیج لگائے ترتیب اور قرینے سے اپنی اپنی ڈیوٹیوں پر ایستادہ ہوگئے۔ لائوڈ اسپیکر والے چھوٹے خیمے کے قریب ایک شامیانہ کارُکنان اور منتظمین کے لئے نصب تھا جس سے کنٹرول ہیڈ کوارٹر کا کام لیا گیا۔

کھانے اور نیاز کی تقسیم کی یہ خوبی کہ نہایت عمدہ چاول‘ اصلی گھی دُنبہ کے گوشت اور میوہ میں پکائے گئے۔ اور صبح صبح کچھ دیگیں دارالمساکین‘ دارالیتیٰ اور پاگل خانے بھیج دی گئیں‘ اور کچھ مختلف مزارات اور مستند مجذوبین کے پاس۔ قید خانے کے حاکم اعلیٰ نے ناعاقبت اندیشی سے نیاز کے کھانے کا قید خانہ میں لایا جانا ممنوع قرار دیا۔ اُمّت کے کام میں رکاوٹ کا وہ ذمہ دار ہوا یا پھر وہ صاحب خدمت جس نے اپنے تصرف سے اس دنیاوی حاکم کو ایسا کرنے پر لاشعوری طور پر مجبور کیا۔ یا پھر دونوں۔

تقریباً 9 بجے دوردتاج کے مختصر وِرد کے ساتھ ساتھ لائوڈ اسپیکر کے ذریعہ جناح پارک سے نیاز میں شرکت کے لئے صلائے عام دی جانے لگی اور ایک لائوڈ اسپیکر ٹانگہ میں گشت پر روانہ ہوگیا کہ نیاز کی اطلاع لوگوں کو کرے۔ یوں دو ایک دن قبل مقامی اخباروں اور ریڈیو سے مقامی خبروں میں اس کی نشرواشاعت کی جاچکی تھی۔ جناح پارک کا مشرقی دروازہ لوگوں کے اندر آنے کے لئے کھول دیا گیا اور نیاز کھانے والوں کی آمد شروع ہوئی۔ لوگوں کو قرینے سے صف بستہ دریوں پر بٹھایا گیا۔ اور کارکنان نے ایک لائن بنا کر کھانے کی قابیں کھانے والوں تک پہنچانا شروع کیں۔ ایک کل دار مشین کی طرح یہ عمل جاری ہوگیا۔

مگر جیسے ہی پہلی صف کے آگے کھانا رکھا گیا دُور جناح پارک سے باہر ریلوے کے قریب بجلی کے کھمبے میں ایک زبردست شعلہ نکلا۔ یہ نشانی تھی باہر باطل قوتوں کی موجودگی کی۔ مگر ان کی بے بسی ظاہر تھی۔ 9 بجے اس بجلی کے خراب ہونے کا اثر اس وقت پڑا جب دُعا کے لئے لائوڈ اسپیکر کی ضرورت پڑی۔ مگر تائید غیبی سے گشت پر گیا ہوا لائوڈ اسپیکر عین وقت پر آپہنچا اور دُعا وقت پر کی جاسکی۔

کھانا شروع ہوا۔ یہ بھی عجب پُر لُطف نظارہ تھا۔ دل فرطِ خوشی سے اچھل رہا تھا۔ وہ نیاز جس کی تیاری کئی دن سے تھی یوں رحمتوں کے سایہ میں جاری تھی۔ ایک لُوے لنگڑے ٹیڑی آنکھوں والے بھی پہلے ریلے میں جناح پارک میں آئے۔ مگر کوئی کھانے کی فرمائش کرتا تو بھاگتے۔ روپیہ پیسہ دیتا تو بھاگتے۔ بالآخر لوگوں نے انکا پیچھا چھوڑ دیا۔ اور تمام نیاز کے دوران میں شامیانے کے قریب بیٹھے رہے۔ نیاز کے دوران ایک سفید کتا اس خطہ پر پایا گیا۔ یہ بیشتر وقت ایک جگہ موجود رہا۔ اور ایک بھورا اور ایک سیاہ جو تھوڑی دیر کے لئے کسی کے ساتھ آئے تھے۔ اس کھلی جگہ میں عام کتوں کا لنگر خانے یا کھانے کی جگہ یا پارک کے کسی حصہ میں نہ ہونا عجب بات ضرور تھی اور زیادہ عجب بات یہ تھی کہ مکھی کا نہ نام نہ نشان۔ سنا ہے حضرت صابرؒ تشریف فرما تھے اور یہ کرم ان سے مانگا گیا تھا کیونکہ کلیر شریف میں میلے کے دوران میں خاص علاقے میں مکھی کا نام نشان تک نہیں ہوتا۔

نیاز کا کھانا لگاتار کھلایا جاتا رہا۔ نہ آنے والوں کا تانتا ٹوٹا نہ کھلانے والوں کی ترتیب' نہ کھانے کی مقدار۔ عجب ہوتی ہے برکت کی شان۔ جو کھانا آٹھ دس ہزار لوگوں کے لئے پکایا گیا تھا چودھ پندرہ ہزار نے کھایا بھی اور ساتھ بھی باندھ باندھ کر لے گئے۔ مگر واہ رے شانِ کرم کہ جو آیا وہ بغیر انتظار کے کھاتا گیا۔ ہر قسم کے لوگ کھانا کھانے آئے بُڈھے' جوان' بچے عورتیں' پھٹے پرانے کپڑوں والے' اور سفید پوش بھی اور آخر میں تو رحمت کا یہ عالم کہ پڑھے لکھے لوگ کاروں میں اور بیرونی سفارت خانوں کے لوگ معہ اپنے خاندانوں کے آئے۔ یہ نظارہ پشاور کی تاریخ میں کسی نے کب دیکھا تھا۔ تعجب بھی تھا' حیرت بھی اور دلچسپی بھی۔ یہ ہوتی ہے رحمت کہ لوگ جوق در جوق آتے ہیں تماشہ دیکھنے اور خود تماشہ بن جاتے ہیں۔ برکتوں اور رحمتوں کے زیر اثر یہ بھی ہوا کہ لوگ منتیں کر کے تھوڑے چاول تبرکاً گھر لے جانے لگے گویا کہ نیاز ایک متبرکّ تقریب تھی۔ اور نیاز کا کھانا دافعِ بلا و وباء و قحط و مرض و الم۔

اللہ اللہ دل سے دعا نکل جائے تو ہر مادی چیز میں بھی سما جاتی ہے۔ اللہ کے نام بسم اللہ سے کوئی چیز شروع کی جائے تو برکت کے دروازے کھل جاتے ہیں۔ کوئی بسم اللہ کہہ کر کے تو دیکھے۔ یہ بسم اللہ تو اسم اللہ سے منسلک کرا دیتی ہے۔ اور لفظ اللہ نقش کو نقاش سے' صفات کو ذات سے' عبد کو معبود سے جوڑ دیتی ہے۔ بسم اللہ کہہ کر بندہ خود اس اللہ بن جاتا ہے۔ عارف باللہ کی بسم اللہ تو کُن ہوا کرتی ہے اس بسم اللہ کی برکت اور کشائش سے دل ہل جاتا ہے اور انسان دائمی تشکر میں اپنے کو دائمی سجود و عبودیّت میں پاتا ہے۔

اور یہ تو جماعت کی عبودیّت' جماعت کے عمل کی برکت تھی۔ خلُوص عمل ہی کا نام تو برکت ہے۔ چنانچہ عبد صالح جو عمل کرتے ہیں اس میں حکمت الٰہی عمل کرتی ہے اور برکتوں کا نزول ہوتا ہے۔ اسی کا اثر تھا کہ روپیہ دینے والے انتظام کرنے والے' کام کرنے والے' کھانا کھانے والے سب کے سب شکر گذار تھے کہ شرکت کی سعادت نصیب ہوئی۔ جماعت اور حق کی شرکت' ہاتھ میں ہاتھ آنے کی بات ہے۔ جب ہاتھ میں ہاتھ آ گیا' تو اپنے بس کی بات نہیں ہوتی بلکہ اس کی مرضی پر عمل ہوتا ہے۔ اور اندرونِ قلب گواہی دیتا ہے کہ یہ کام کروایا جا رہا ہے میں خود نہیں کر رہا۔ اس میں سو فیصدی عمل بھی ہوتا ہے اور توکل بھی۔ یہ تو دو بتّی ایک لو والی بات ہوتی ہے۔ ہاتھ میں ہاتھ ہو' لو سے لو' لگی ہو' تو ساری چیزیں خود بخود ہوتی ہیں۔

سوچ کر ایک قدم بھی نہیں اٹھانا ہوتا۔ پتّہ پتّہ دم ساز ہوتا ہے۔ ایمان' محبّت' عجز اور خلوصِ عمل ہو تو رحمت کے در کھل جاتے ہیں' خدائی ساتھ ہوتی ہے۔ اس لئے کہ جوشِ عمل ہی میں تو ایمان کا ظہور ہے اور ایمان محبّت کا نام ہے۔ عاشق مجبور ہوتا ہے مطمعء نظر کی صرف والہانہ بڑھنے سے

اور اس کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ جو ہوتا ہے سو ہوتا ہے۔ یہ ہے توکل الی اللہ کا راز پھر ایسے پر برکتیں نازل کیسے نہ ہوں۔ ایسے پر فضل کے دروازے کشادہ کیسے نہ ہوں۔ جب جماعت میں خلوصِ عمل آجائے تو پھر فیض اور برکت کے چشمے پھوٹنے لگتے ہیں اور اس یک رنگی کے عالم میں حق خود ہی مختلف روپوں میں آشکار' خود نظارہ ساز' اور خود تماشہ ہوتا ہے۔

نیاز کے دوران خدا جانے کس کس رُوپ میں کون کون آیا۔ اور پھر کیسے نہ آتے' یہ تو کون و مکان میں ایک ارتعاش پیدا کر دینے والی تقریب تھی۔ رُوحیں متاثر کیسے نہ ہوتیں' جب کہ خود قدرت متاثر تھی' جبکہ نوشہء تقدیر بدلے جانے کے سامان کئے جارہے تھے۔ جبکہ امّت کو سرِ بازار لاکر کھڑا کر دیا گیا تھا۔ جبکہ وہ امّت بھی موجود تھی جو پیران محی الدینؒ نے زندہ کی تھی۔ امّت کے مشاہیر' امّت کے درمیان موجود تھے۔ امت کا سردار خود امّت کی صف میں آن ملا تھا۔ اس نظارہ سے تو ارض و سماو کونین لرزہ براندام تھے۔ امّت اور امّت کے سردار کا فریادی ہونا معمولی بات نہیں ہوتی۔ عرش ہل جاتا ہے' فرشتے کانپ اٹھتے ہیں' جبرئیل بے قراری سے اس فریاد کی پیام رسانی کرتے ہیں' دعائوں کے ایلچی بنتے ہیں۔

دُعا

بارہ بجے دُعا کا وقت بھی آپہنچا۔ بارہ بجنے سے دس منٹ قبل اّمت نے بہ آواز بلند درود و سلام کے بعد السلامُ علیک یارسُول اللہ۔ السلامُ علیک یا رسُول اللہ۔ اسلامُ علیک یَارَسُول اللہ بار بار کہنا شروع کیا۔ پھر بہ صَد منّت وزاری بہ صَد تضَرُّع' رحمتِ عالم کو پکارنا شروع کیا۔ یارحمۃ لِلّعالَمین' سیہ روز' سیہ بخت' فریادی زیر آسمان نالہ کناں تھے۔ آنسوئوں کی جھڑیاں بندھی تھیں۔ رحمتِ عالم کو پکارنے تھے' اور جسم و جان کانپتے تھے۔ دل تو دل' زمین سے تا عرش لرزہ تھا۔ خود رحمت عالم کا امّت کے لئے بے قراری کا اندازہ وہی لگا سکتا ہے' جسے وَمَاارَسَلنٰکَ اِلّارَحمَۃً لِلّعَالَمِین کے معنی آتے ہوں۔ جسکی سمجھ میں معراج کا نکتہ آگیا ہو۔ پھر ایسے میں رحمت عالم کا اُمّت کے ساتھ ہونا تعجب کی بات نہ تھی اور یہ نیاز تو رحمت عالم کے حکم سے ہی کی گئی تھی۔ لوگو! اندازہ لگائو اس وقت کا جب پکارنے والی اُمّت کے ساتھ اُمّت کا راعی بھی شامل ہو جائے' اور ابر گاہ الٰہی میں دُعا کی جارہی ہو کہ اُمّت کے دن پھیر دے' گناہوں کو نہ دیکھ' خطائوں کو درگزر کر' اپنے محبوبؐ کے صدقے میں اُمّت کی لاج رکھ۔ ارحمنا' ارحمنا' ارحمنا۔ جب کون و مکان ہلا دیئے جائیں' جب عرشِ اعظم کے پائے ہل جائیں' جب فرشتے' انبیاء اور ارواحِ مقدّسہ بے قرار ہو جائیں تو ارحم الرّاحمین کیسے نہ رحمت کا وعدہ کرے۔ نوشتہ تقدیر کیونکر نہ بدلے۔

نوشتہ تقدیر بدلا تو قلوب اور ماحول پر اس کا اثر کیوں نہ پڑتا۔ دلوں پر شادمانی کامرانی سُرخروئی کی کیفیت' شگفتہ چہروں پر سکون کی نشانی' نیاز کی جگہ سے تمام سامان کا ترتیب سے اٹھنا اور ہر چیز کے اختتام پر ہلکی ہلکی پھوار'

سُبْحَانَ اللہ وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ

کُلَّ یُومٍ ھُوَ فِیْ شَانٍ

کُلُّ مَنْ عَلَیْھَا فَانٍ O

وَّيَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُوالْجَلَالِ وَالْاِكْرَامِ O

باب ۳

صبح اسلام

بشارت سورۃ الکوثر

الاسلام

اسلام دین فطرت ہے فطرت میں نمو ہے' فروغ ہے' ارتقاء ہے انسانی وجود میں حیات اسی لئے ہوئی ہے کہ نمُو' فروغ' ارتقاء کی تکمیل ہو سکے۔ زندگی کا تقاضا یہی تھا اور اس کے اظہار کے یہی ذرائع۔ جسم میں رُوح بھی پھونکی اور یہ امر ربی انسانی نمُو' فروغ اور ارتقا کا ضامن ہوا۔ انسان میں کُلَّ یَومٍ ہُوَ فِی شانٍ کا اظہار اسی کے طفیل ہے۔ اس کی اعلیٰ والطف صفات کو دوام اسی کی روشنی میں ہے۔

کُلُّ مَن عَلَیہَا فَانٍ O وَّیَبقٰی وَجہُ رَبِّکَ ذُوالجَلَالِ وَالاِکرَامِ O اسی حیات روح اور صفات ذاتیہ کی بقائے دوام کی طرف اشارہ تھا۔ جس کی تجلی انسانی وجود کے ذریعہ ہو سکی۔ انسان ہی مرکز وجود تھا' انسان ہی احسن التقویم' انسان ہی خالق کا عظیم شاہکار' محبوب ترین مخلوق۔ ساری مخلوق پر اس کو شرف و فضیلت بخشی گئی۔ مخلوق و ملائک پیدا کرنے کے بعد فرمایا' میں زمین میں اپنا ایک نائب بناؤں گا اور ساری زندگی اسی کے تابع کر دی گئی۔ سب کو کُن سے پیدا کیا مگر انسان کو خصوصی انداز میں وجود دیا۔ ارشادات ہیں اسے خود حق تعالیٰ نے اپنے دست قدرت سے بنایا۔ احسن التقویم تخلیق کی اس میں اپنی روح پھونکی اسے فطرت پر پیدا کیا۔ لَقَدکَرَّ مُنَا بَنِی آدَمَ فرما کا شرف و فضیلت بخشی۔ خلیفتہ اللہ کے لقب سے نوازا۔ سب انسانوں کو ایک ہی راہ توحید پر گامزن کیا گو انہوں نے بعد میں مختلف راہیں اختیار کر لیں۔ ''جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے سب کو تمہارے کام پر لگا دیا ہے میں نے تمہارے لئے دین اسلام پسند کیا۔ جنّ و انس کی تخلیق ہی اس لئے کی کہ میری عبادت کریں۔''

دیکھا جائے تو انسان کے وجود سے پہلے ملائک بھی اس کی حمد و تقدیس میں طبعاً لگے تھے' عبادت پر مجبور تھے۔ ذرّہ ذرّہ اس کی تسبیح کر رہا تھا۔ مگر انسان میں فطرتاً شوق کا جذبہ دے کر آزادی بھی بخش دی۔ قابلیتِ اصلاح و فساد پر اختیار دے دیا تاکہ اس کی اندرونی لگن کا اندازہ اس کے اختیاری عمل سے لگایا جا سکے۔ اور یہ بھی دیکھا جا سکے کہ وہ کس طرح فساد کے مادہ کو روکتا ہے اور کس طرح اپنی قابلیت اصلاح کا ارتقاء کر کے اسے مجموعی رنگ میں نسل انسانی کے ارتقاء کا ذریعہ بناتا ہے۔ خلقت کے ساتھ اس کا یہ اخلاص ہی کُلّی طور پر اسے خالق کی مرضی و منشاء کے ساتھ مطابقت پیدا کرا سکتا تھا' تاکہ جو کچھ کرے عبادت کے طور پر کرے اور اس کے کیف سے لطف اندوز ہو کر اپنے شوق کو جلا دے سکے۔ اس رنگ میں اس کی ساری زندگی' عقائد' اخلاق' معاملات' معاشرت سب ہی جُزوِ عبادت کہلائے۔ فطری قدرتی صلاحیتوں سے کام لیتے ہوئے میزانِ حق و باطل رکھنا انسان کے اختیار میں دیا گیا۔ اسے اپنا امین اور نائب بنایا۔ آئین و شرع سے سجایا۔ اپنی تمام صفات سے نوازا۔ حکمت و عظمت' تخلیق و تعمیر عطا کی گئیں۔ تاکہ نائبیت خدائی شان کے اظہار میں فرق نہ آئے۔ ساتھ ہی ہوشیار بھی کر دیا کہ نفس و خواہش کے شیطانوں سے راہ کھوٹی نہ کر لینا کہ کہیں خدائی وقار میں فرق آ جائے۔ حق کی محبّت انسانوں کے دلوں میں کچھ ایسی قائم کرا دی کہ جب انہیں آیات یاد دلائی جاتی ہیں ''تو سجدہ میں گر پڑتے ہیں۔'' اپنے پروردگار کی حمد و ثنا کے ساتھ تسبیح و تقدیس کرتے ہیں۔ رات کو جب سوتے ہیں تو ان کے پہلو بستروں سے آشنا نہیں ہوتے۔ امید و بیم کے عالم میں کروٹیں بدل بدل کر اپنے پروردگار سے دعائیں مانگتے رہتے ہیں گویا ان کی ساری عبادت یہ ہوتی ہے کہ خدا کے امین ہوتے ہیں۔ ان کی روح میں ایک فطری تڑپ ہوتی ہے جو روح کی اپنے اصل کے لئے تلاش ہے۔

اس تجسس کو بڑھاؤ' تیز تر کرو۔ یہ ذاتِ حق کی تڑپ ہے۔ یہ تڑپ مادّی سطح تک رہ گئی یا نفسانی سطح پر بھجا دی گئی تو فروغ و اِرتقاء کی طرف عروج ختم ہو جاتا ہے۔ البتہ جس نے اس فطری جذبہء تجسس و انہماک کو قائم کر لیا وہی قائم الصلواۃ ہو جاتا ہے کیونکہ قائم الصلواۃ ہونا یہ بھی تو ہے کہ اپنی

فطری صلاحیتوں کو عملی رُخ دے کر مختلف سطحاتِ نفسانی، قلبی و روحانی میں قیام عطا ہونے لگے اور بتدریج ارتقائے باطن کی راہ کھلتی چلی جائے۔ اور کتاب کا کھلنا بھی باطن میں ہی ہوا کرتا ہے۔ ہم نے کتاب کو بھی طاق میں، یا ذہن میں، یا زبان میں محدود کر دیا۔ حالانکہ کتابِ فطرت کی کشادگی تو عمل میں ہے۔ اسی کے مطابق عمل پیرائی اسلام ہے۔ لہٰذا قرآن پڑھنا نہیں بلکہ ہونا ہے۔ جاننا ہو جانا ہے۔ یہ ہو جانا فطرت کے مطابق عمل پیرائی میں مضمر ہے۔ تمہاری تقدیر، تمہاری صلاحیتیں تمہارے لئے آسان کر دی گئیں۔ تب ہی تو تمہارے اعمال طیب ہوئے، فطری رُجحان کے مطابق ہو گئے۔ تمہارے لئے قدرتی اور آسان ہو گئے۔

اب غور طلب بات یہی ہے کہ ہمیں نہ صرف یہ کہ اسلام کو صحیح طور سے سمجھنا ہو گا بلکہ انسانی زندگی کے ہر شعبہ میں اسے حیاتِ انسانی کا مدد و معاون، رہنما و ہمسفر، مُصلح و خیر خواہ بنانا ہو گا۔ اسلام کے ہر پہلو کو اسی پیمانے سے عمل پیرا کرنا ہو گا کہ اس سے فطرتِ انسانی کی نشو و نما، فروغ اور اِرتقاء ہو۔ اگر ایسا نہیں تو یہ اپنی کم فہمی ہو گی نہ کہ اسلام کے اصولوں کی خامی۔ جاننا ہے کہ دین نہ کتاب میں ہے، نہ آئین میں، نہ اصول میں، دین تو عمل پیرائی میں ہے ایک اندازِ فکر و عمل میں ہے جو جمعیت کی خاطر ہوں۔ اسلام کے اصول تو انسان کی خدمت و فلاح کے لئے ہیں کیونکہ انسان خود شاہکارِ خداوندی ہے۔ اس سے افضل، اس سے محبوب ترین شے اور کونسی ہو سکتی ہے جب اپنا ہی نمونہ بنا کر انسانوں کو اس دنیا میں بھیجا تو اس سے زیادہ پیارا کون تھا۔ اس پیار و محبت کی شدّتِ خداوندی کو اپنا کر اگر مصلحین، مفکرین، مُعلمین، خاکمین ہی کیا، پورے کا پورا معاشرہ ایک توحید فکر میں ہو جائے تو راہیں کشادہ ہونے لگیں۔ ہر فکر، ہر تخیل، ہر عمل کے پیچھے یہی دُھن اور لو لگ جائے تو پھر نہ کج روی آنے پائے گی نہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہنا ہو گا، نہ قسمت و تقدیر کی شکایت رہے گی۔ مرضیءِ الٰہی کے ساتھ راضی بہ رضا رہنا۔ یہ نہ ہو گا کہ جو ہوتا ہے ہونے دو، بلکہ خود دستِ قدرت بن کر قدرت کی اعانت اسی انسان کو کرنا ہو گا۔ اسے یہ ضرور دیکھنا ہو گا کہ کونسے عمل اس کے اپنے نفس کے تقاضوں کے تحت ہیں اور کونسے مرضیءِ الٰہی کے تحت۔ انسان جب فکر و احتیاط کرے گا تو خود غرضی، حرص و ہوا، خود پرستی، جاہ طلبی، زر اندوزی وغیرہ سارے کے سارے شیطانی اور مُشرکانہ عمل نظر آنے لگیں گے۔ اور ان کے مقابلے میں اعلیٰ اقدار، جیسے بے لوث خدمت، ایثار، خلوص، محبّت، صداقت، دیانت، امانت، سخاوت، رحمت، عین مرضیءِ الٰہی نظر آنے لگے گی۔ اس طرح امر ربی کے اظہار اور عمل پیرائی کا ذریعہ یہی وجودِ انسانی ہو گا۔ نفس، قلب، روح کی سطح پر اس کے ذریعہ انسان اپنے عروج کی طرف قدم رکھے گا۔

مختصراً یوں سمجھ لیں کہ جو عمل اپنی ذات کے لئے نہ ہو وہ بے رِیا ہو گا اور جو فلاحِ عام کے لئے ہو وہ عین حق۔ یہی تخیل، یہی نظریہ انسان میں بچپن سے لے کر بُڑھاپے تک عمل آرائی کرتے کرتے بار آور درخت کی تمثیل بن جائے گا کہ انسانیت ہر آن اس کے سائے اور پھل سے مستفیض ہوتی رہے گی۔ یہی وہ عمل صالح ہے جس سے حیات طیّب ہو جاتی ہے۔ دستِ قدرت بن کر ہی انسان حَیُّ و قَیُّوم تک رسائی کر سکتا ہے۔ خدائی صفات پر عمل پیرا ہوتے ہی ان صفات سے متصف ہو کر عارِف باللہ کہلا سکتا ہے۔ یوں اگر انسان اپنے لئے پاکی، طہارت، عبادت، ذکر، اذکار مجاہدے کر کے بھی اپنی 'مَیں' سے نہ نکل سکا تو یہ کس قسم کا عمل صالح ہوا۔ اسی فریب سے تو اس کو نکلنا ہے۔ اس خود اعتنائی اور جھوٹی تسلی سے تو اس کی راہ کھوٹی ہوتی ہے۔ جس میں یہ جمود آ گیا اس کی تو موت ہو گئی۔ اس میں سے تو وہ شدّتِ حیات، وہ بے چینی وہ تڑپ ختم ہوئی جو عشق و محبت کی نشانی ہے۔ اس جمود اور

ان زنجیروں سے تو صرف ایک جست ہی انسان کو آزاد کرا سکتی ہے۔ وگرنہ انسان اپنی دنیا و عُقبیٰ کی فکر میں سوائے خود غرضی کے اور کیا کرتا رہتا ہے۔ سوچو کہ اللہ کو نہ تمہاری نماز کی ضرورت ہے' نہ ریاضتوں' نہ ذکر و افکار' نہ مجاہدوں کی' یہ تو ہر حال میں تم اپنے ہی لئے کر رہے ہو۔ خالصتاً اللہ تو صرف وہی اعمال ہوں گے جو اس کی مخلوق کے لئے نیک دل سے کئے جائیں۔ بھوکے کو کھانا' ننگے کو کپڑا' بیمار کو دوادارو' ناخواندہ کو علم' دردمند کو ایک میٹھا لفظ۔ یوں انسان بھی تمہارا دیا کھانا کھا کھا کر کہاں تک ارتقاء کر سکتا ہے۔ مگر محبّت' خلوص' رفاقت' ہم سفری کر کے تم اس کی تکالیف بھی گھٹا سکتے ہو اور اس کے وہم و گمان کو یقین اور ایمان میں بدل سکتے ہو۔ اسے خود اعتمادی دلا کر' اسے خود عمل پیرا کرا کے اس کی مُردہ صلاحیتوں کو بیدار کرا سکتے ہو۔ یعنی مادِی اور جسمانی سطح پر بھی ہاتھ پیر' دل و دماغ کی کوششوں سے وہ خود نفس پرست بن سکتا ہے۔ مگر تم اسے جیسے ہی اجتماعی فلاح کا رنگ دے دو گے تو اس نفس کے جال سے نکال کر کم از کم لطیفہء نفس کے مقام تک تو لا کھڑا کرو گے۔ اور جب اسے اعلیٰ اقدار سے روشناس کرا دیا' اس کے دل میں محبّت کا کوئی کانٹا اٹکا دیا تو پھر قلب کی سطح پر اسے لے آئو گے۔ محبّت کا فطری جذبہ ہر انسان میں موجود ہے۔ اسکے سہارے باطنی خوابیدہ صلاحیتیں اور بھی شدّت سے بروئے کار آجاتی ہیں۔ اس کا ہر عمل محبوب کے لئے ایک نذرانہ بن جاتا ہے۔ کیونکہ عاشق کو نہ مانگنا آتا ہے' نہ اپنے لئے سودا کرنا' نہ حرص و طمع میں لگے رہنا اس طرح نفس و مادہ پرستی کی دنیا سے بلند ہو کر اگر ہم دیکھیں تو اسلام پیامِ امن و سلامتی ہے۔ اسلام جمعیت بندی اور فلاحی معاشرہ کو ترتیب اور فروغ دیتا ہے۔ اسلام رحمت عالم ہے۔

اسلام دین فطرت

اسلام کو دین فطرت کہتے ہیں۔ انسان سے ہٹ کر دیکھیں تو نباتات و حیوانات کی زندگی میں نمو بھی ہے' حیات بھی' فروغ بھی اور اِرتقاء کی دھیمی چال بھی' جو صدیوں میں طے ہوتی رہتی ہے۔ ساری مخلوق ایک دوسرے سے رابطہ میں ہے' ایک توحیدی کیفیت میں ہے۔ انفرادیت کی انفرادیت ہے اور اجتماعیت کی اجتماعیت اور گروہ بندی بھی۔ ایک دوسرے کی مدد و معاون بھی ہے اور بظاہر برسرپیکار بھی۔ مگر یہ سب کچھ زندگی و حیات کا سہارا بنی ہوئی ہے۔ سب کچھ التحیات میں ضم ہے۔ تھوڑا سا تفکر کریں۔ یہ جمادات' ان نباتات و حیوانات کو دیکھیں تو ایک سلسلہ حیات ان میں جاری ہے۔ ایک نظامِ فطرت ان کے پیچھے کارفرما نظر آرہا ہے۔ اور عجب یکتائیت توحید میں' نمو' نشو و نما' تولید' سلسلہء نسل' اِرتقاء' اجزا کا پریشان ہونا' عناصر میں ظہور' ترتیب' موت' حیات کس خوبی سے جاری ہے اور کیسے اجتماعی انداز میں۔ یہ اجتماعی انداز ہی توحید فطرت ہے۔ حیات کو دیکھیں تو نہ کوئی چیز فنا ہو رہی ہے نہ کسی شے کو بقائے دوام ہے۔ شکلیں اور صورتیں بدل رہی ہیں۔ حیات کو بقائے دوام ہے۔ کار آمد کو بیکار اشیاء کی جگہ دی جارہی ہے۔

انسان کی بھی اس سطح ارضی پر یہی حالت ہے۔ انفرادی اجسام میں بھی یہی کیفیت ہے اور اجتماعی طور سے نظام عالم میں بھی۔ اندر دیکھو' باہر دیکھو حیات ہی حیات ہے۔ موت عارضی ہے۔ ایک شکل سی بدلنا ہے اور حیات کو دوام ہے۔ سب شے فنا ہو رہی ہے۔ اور وَجۡہُ رَبِّیۡ کو بقاء ہے۔ سب غیر حق کی فنا ہو رہی ہے۔ بے کار اشیاو کی فنا ہے اور وجہُ رب کو بقا ہے۔ روح امر ربی ہے۔ اس کو بقا ہے۔ زندگی کی ہر روز نئی شان ہے ہر لمحہ نئی آن۔ کیسے جمادات' کیسے نباتات' کیسے حیوانات۔

تو پھر انسان جو اَحْسَنُ التَّقْوِیْم ہے' جو قدرتِ کاملہ کا شاہکار ہے' خود قدرتوں سے نوازا ہوا ہے' صفات سے آراستہ کیا ہوا ہے' نائب حق ہے' اس کی کیا شان نہیں۔ قومیں آئیں فنا ہوئیں۔ تاریکی سے نکلیں' روشنی میں آئیں' پھر تاریکی میں چلی گئیں۔ عروج بھی ہوا زوال بھی۔ مگر انسانیت پر کیا فرق پڑا۔ ناخوب کی جگہ ہمیشہ خوب کو ملتی رہی۔ ہر انسان کے اپنے وجود' جسم' جان' قلب' روح میں یہی فطرت کا اصول اب بھی جاری و ساری نظر آتا ہے جو صدیوں پہلے تھا۔ بچہ اب بھی جہاں پیدا ہوا' اسلام پر پیدا ہوا۔ پوری امن و سلامتی کا پیکر' پورا نائب بن کر فطرت کی معصومیت اور سادگی لئے۔ اپنے اندر جو فطری صلاحیتیں ہیں ان کو بغیر توڑے موڑے ان کے تحت زندگی گذارتا ہے۔ اندر باہر یکتائیت توحید میں ہوتا ہے۔ اسلام کا پہلا سبق توحید ہے۔ اس کی عملی تصویر دیکھنی ہو' تو یہی بچہ تو ہے جو کتنا ہی لاچار سہی' معصوم بھی ہے' مختار بھی ہے' نمودِ فروع کی شان بھی لئے ہے اور اپنے ارتقائی مدارج کی طرف فطرتاً گامزن بھی ہے۔ یہی ہے جو زندگی و تابندگی کا ایک زندہ پیکر بنا ہوا ہے۔ تو جب تک یہ فطری نمود' یہ فروغ یہ کُلَّ یَوْمٍ ھُوَ فِیْ شَانٍ کا انداز انسان میں نہ ہو' وہ کیسے خلیفۃ اللہ اور اَحْسَنُ التَّقْوِیْم کا مصداق ہو' کیسے دین فطرت کا شاہکار ہو' کیسے توحید ذاتی و صفاتی پر عمل پیرا ہو۔ اس فطری توحید کو تو انسان نے بڑا ہو کر برقرار رکھنا تھا جو قدرت نے اسے پیدا ہونے پر عنایت کی تھی اور جس کا اظہار اسکی بچپن کی زندگی تھی۔ وہ اپنی ضروریات کی طلب میں شدّت کی یک رُخی' وہ اپنے جذبات میں شدّت کی ہم آہنگی' کہ مانگے تو پورے وجود کے ساتھ' ہنسے تو پورے وجود کے ساتھ' کسی دُھن میں لگ جائے تو پورے وجود کے ساتھ' محبّت کرے تو پورے وجود سے' نفرت کرے تو پورے وجود سے۔

مگر واہ رے معاشرہ' کہ بڑا ہوتے ہوتے اس کی اس توحید کو کچل کے رکھ دیتا ہے اور بے راہ روی' دھوکہ بازی' دُوئی پر اس طرح اسے مجبور کر دیتا ہے کہ اندر کچھ باہر کچھ اور پھر کہلوانا چاہتا ہے کہ کہو اللہ ایک ہے۔ سوچو کہ وہ اپنی فطری سادگی اور توحید کھو چکا ہے۔ وہ کیا جانے اس ایک کہنے اور اس ایک ہونے کا لطف۔ جوان ہوتے ہوتے وہ حق بینی' حق عملی' حق گوئی تو اس کی ختم ہو چکی ہوتی ہے۔ گویا جب بنیادِ دین ہی خام کر دی تو پھر کونسی عمارت ارکانِ دین کی اس پر صحیح بن سکتی ہے۔ وائے افسوس کہ اعلیٰ اقدارِ زندگی سکھانے کے نام پر اس معصوم کا یہ رنگ کر دیا جاتا ہے۔ اس ستم رسیدہ سے تو کہیں زیادہ فطری آزادی میں نباتات' حیوانات پل بڑھ رہے تھے۔ معاشرہ مُتمدن ہو تو صحیح باغبانی' صحیح گلہ بانی کے انداز بھی تو یہی ہوتے ہیں کہ پودا یا جانور اپنی اصلیت بھی نہیں کھوتا اور ایک تہذیب میں آجاتا ہے جو اس کی نشو و نما' فروغ اور اِرتقائی منازل کی طرف ترقی کرا کر اس کی اعانت کرتی ہے۔ اسلام بعینہ یہی کچھ انسان کے ساتھ کرنا چاہتا ہے۔ اسے توڑ مروڑ کر' مار پیٹ یا ذلیل کر کے نہیں بلکہ شفقت کے انداز میں اسے تہذیب و شائستگی عطا کرتے ہوئے اس کی فطری صلاحیتوں کو جلا دے کر اس کی نشو و نما' فروغ اور اِرتقاء کی راہ پر گامزن کرا کے رجوع الی الحق کرانا چاہتا ہے۔ اسلام کی ساری تعلیمات' اسلام کے سارے ارکان اگر اسی نظریئے کے تحت نہ ہوتے تو پھر ذاتِ حق کو انسان کے لئے یہ پیغام بھیجنے کی کیا ضرورت تھی۔ نگاہِ بصیرت سے دیکھیں کہ اصل قرآن تو انسانِ کامل ؐ ہے جو اپنی زندگی میں قرآن کی عمل پیرائی پیش کرتا ہے۔ اور جو کاغذ لکھا ہے وہ تو نورانی عکس ہے۔ حیاتِ دین' شعلہء عشق تو اپنے اندر ہوتا ہے۔ یہ لافانی چیز رُوح کی طلوعِ فجر ہے۔ فَنَفَخْتُ کے طفیل یہ ہر ایک کے قلب و روح میں فطرتاً جاگزیں ہے۔ اسے محبت کی دہائی دے کر اپنے مرکز عشق سے ہم آہنگ کریں تو پھر قرآن وارد ہونے لگے گا۔

اہمیت محبوب

مگر ہمارا محبوب ہے کہاں۔ سوچو کہ ذاتِ خدا تک کیا پہنچو گے۔ تم جب تعین میں ہو تو تعین میں ہی اس مرکز عشق' ذاتِ محبوب کو پکڑو۔ لاتعین ذاتِ حق تک تو خیال یا دل سے بھی رسائی نہیں ہو گی۔ جب اپنی غلط فہمی سے نکل کر دین کی روشنی آنے لگے گی تو دیکھو گے کہ حقیقت میں ہمیں اپنے وجود سے زیادہ محبوب شے کوئی نہیں۔ کیا خدا' کیا محبوبِ خدا اور یہی تو خود غرضی اور نفس پرستی ہے۔ صداقت سے اپنا محاسبہ کرے کہ اس خود پرستی سے کیسے نکلے۔ اور جب لاتعین یعنی ذاتِ حق سے محبّت کا دعویٰ کرے تو اس میں صداقت کیسے آئے۔ سوچے کہ ایک تخیلی دھوکہ اپنے کو دینے سے کیا حاصل۔ آخر ہم کیوں نہیں محبوب مان لیتے اسی ذاتِ مبارک کو جو خود ذات یاری کا محبوبؐ ہے۔ کیا خدا اسے بھی بہتر کوئی محبوب ڈھونڈ سکو گے۔ کیا خدا کی جو مرضی ہے' جو محبّت کی خواہش ہے' اس سے رُوگردانی کرتے ہوئے اپنے لئے اس محبوبؐ کو چھوڑ کر خدا کو ہی محبوب کہتے رہو گے۔ شیطان نے بھی تو یہی کیا۔ وہ اَرْحَمُ الرّٰحِمِیْن تو خود تمہیں اپنے محبوبؐ کی طرف رجوع کرا رہے ہیں' کہ ان کی جس نے اطاعت کی ہماری ہو گئی' انہیں جس نے چاہا اس نے ہمیں چاہا۔ مومن ہو ہی نہیں سکتے جب تک انہیں اپنے سے' اپنے ماں باپ' آل اولاد سے زیادہ نہ چاہو۔ تو کیا اللہ کی نشاندہی کے باوجود بھی تم اپنا رُخ ادھر نہ کرنا چاہو گے جدھر اس نے خود تمہارا رُخ پھیرا ہے اور ان کی طرف رجوع ہونے کو شرک گردانو گے۔ ارے یہ تو وہ ذاتِ گرامی ہے جن کی اُمّت میں ہونے کی تمنا انبیاء نے کی' جن پر اللہ اور ملائک درود بھیجتے ہیں۔ اس ذاتِ مبارک تک پہنچو۔ ان تک رسائی علم کلام سے نہیں' مجاہدوں اور ریاضتوں سے نہیں' زہد و تقویٰ سے نہیں' بلکہ سیدھی سادھی محبّت سے ہے۔ بس عاجزی کو ہاتھ سے نہ دو۔ سیدھا سادھا دامن پکڑ لو۔ سیدھا سادھا کلمہ پڑھ لو۔ ایسا کلمہ جو محبوبؐ کا کلمہ ہوتا ہے' کہ اسی کی یاد اسی کا دھیان' مگر تم تو اسے شرک سمجھتے ہو۔ تم آج تک یہ فیصلہ ہی نہیں کر پائے کہ اللہ کو چاہو گے یا اس کے حبیبؐ کو' ذاتِ حق تک اپنی رسائی کرو گے یا مظہر حق تک۔ تم اپنے اندر جھانکو۔ کیا تمہاری حقیقت حق نہیں۔ تو پھر مظہر کامل سے زیادہ اکملیت کے انداز میں اس حقیقت کو اور کہاں پائو گے۔ ان کی محبّت کو بھی تو اپنے ہی اندر پائو گے۔ حقیقت ایک ہی تو ہے۔ جان لو کہ باطن کے راہ کھلنے کے لئے محبّت کا دوام ضروری ہے۔ جسمانی و مادی محبّت عمر کے ساتھ ختم ہو جاتی ہے۔ عشق کو دوام اسی وقت ملتا ہے جب مرکز حُسن کو دوام ہو۔ اسلام اسی مرکز حسن کی طرف انسان کو رجوع کرتا ہے۔ پھر اسی حسن لولاکیؐ کی تابناکی میں مومن کی زندگی اپنے محبوبؐ کے لئے پائیدار ہوتی جاتی ہے۔ اس کا سونا' جاگنا' چلنا' پھرنا' کمانا' خرچ کرنا' سب محبوبؐ کے نام پر ہوتا ہے۔ عاشق عاجز ہوتا ہے۔ عجز رحمت کو سموتا ہے۔ ایسے پر رحمتوں کے انوار کی بارش ہوتی ہے۔ ایسا ہی انسان احسن التقویم ہونے کا عملی ثبوت اپنی زندگی سے پیش کرتا رہتا ہے۔ محبوبؐ کے نام پر اسے ساری خلقت سے محبّت ہوتی ہے۔ محبّت کا جذبہ تو ہوتا ہی اس انداز میں ہے جیسا کہ ایک روشنی جو بلا تخصیص سب کے لئے ہو۔ محبت اعلیٰ اقدار کو بیدار کرتی ہے۔ یہ اعلیٰ اقدار انسان کے اپنے وجود میں تھیں جن کی عمل پیرائی محبّت کی تجلی کے بعد' زندگی کے ہر شعبہ میں پڑنے لگی۔ اب ایسے کا ہر کام عبادت ہو گیا۔ خالصتہً فی المحبوب ہو گیا۔ خالصتہً للہ ہو گیا۔ بالآخر یہ رحمت کی طلب میں خود رحمت بن گیا۔ خوب فیصلہ کر لو کہ اس رحمت کو اپنے عیب میں پانا ہے۔

ایمان بالغیب

تم اپنے ہی وجود کو دیکھو۔ نہ تم اپنی خواہش سے پیدا ہوئے' نہ تم اپنی موت کا وقت مقرر کر سکتے ہو۔ پھر بھی زندہ رہنے کی جو فطری شدّت تم میں ہے وہ رحمت بن کر سخت سے سخت بیماری میں تمہاری اعانت کرتی ہے۔ تم اپنے وجود میں اسی شفا' اسی رحمت کو آتے دیکھتے ہو۔ جب بصیرت آجائے

تو مرنے کے بعد بھی اس اندر والی ''میں'' کو یقین ہے کہ ختم ہونے سے رہی۔ اسی ''میں'' کو جب محبوب مل جائے تو اپنی فطری اور قدرتی رنگ میں انسان اپنے وجود تک کو بھول کر محبوب کے لئے جی رہا ہوتا ہے۔ اب اپنے غیب میں محبوب بسا ہوتا ہے' جو حقیقت ہے۔ ایسے انسان کو مار دو' ٹکڑے کر دو' مگر اس محبوب سے علیحدگی نہیں ہو سکتی۔ محبوب جان ہی میں تو ہے۔ جسے بصیرت ہو تو دیکھتا ہے کہ یہ اپنے اختیار کی بات کب تھی۔ گویا اس نے اپنے کو چاہا۔ ایسی محویّت کی حالت میں ظاہری جسم کی خواہشات اور عقل کی طلب سے انسان پاک ہوتا ہے۔ پاکی اور طہارت تو عشق ہی میں ہے۔ لہٰذا ادھر سے عاجزی اور اُدھر سے رحمت کی بارش۔ صداقت عشق کے صدقہ اٹھالیا جاتا ہے۔ تب مقامِ جبروت حاصل ہوتا ہے۔ محبوب نے نواز لیا ہوتا ہے۔ انا رُوحِی کی کیفیت نصیب ہوتی ہے۔ تب معلوم ہوتا ہے کہ 'میں' اس جسم کو لئے پھر رہا ہے۔ کوئی اور 'میں' جو اس جسم کو سنبھالے ہوئے ہے اور جسے میں جسم والی 'میں' سمجھ رہا تھا وہ تو بچپن سے لے کر بڑھاپے تک اپنی صورتیں بھی بدلتی رہی' تصوّرات بھی' تخیلات بھی۔ وہ مادی 'میں' نشو و نما پذیر بھی تھی اور انحطاط پذیر بھی۔ مگر اس اَنا رُوحِی والی 'مَیں' کو قیام ہے۔ یہ 'میں' تجلی ہے اس رحمت کی جسے رحمت عالم کہتے ہیں۔ یہی 'میں' میرے غیب میں ہے اس لئے مَنْ عَرَفَ نَفْسَہٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّہٗ کہا گیا تھا۔ اسی لئے ایمان بالغیب اسلام کا بنیادی پہلو قرار دیا گیا تھا۔ متقی' پاک یعنی عاشق لوگوں کی نشانی بتائی گئی تھی کہ عشق ہی نفس و مادہ و جسم کی طلبوں اور جھوٹی ''مَیں'' کے جنجالوں سے نجات دلا کر حقیقتوں سے رُوشناس کرا سکتا ہے۔

ایسوں ہی کے قلوب پر قرآن نازل کیا جاتا ہے۔ بطن قرآن' اندر والی ایسی زندہ حقیقت ہے کہ ایک اَن پڑھ عاشق تک اس کے ایسے رمز کھولتا ہے جس سے تشفی ہو۔ سوچیں کہ محبّت ہو اور پھر دو زندہ آدمیوں میں ملاقات ہو تو کیسے محبّت سے باتیں کرتے ہیں' نہ زمان کا پتہ ہوتا ہے' نہ مکان کا۔ چاہے باتیں بے ربط ہوں تب بھی وہ لطف لے سکتے ہیں۔ یوں صرف فقہ کو دین سمجھ کر' نہیں اور منکرات میں لگ کر حُسن قرآن کہاں پا سکتے ہیں۔ جانِ قرآن تو محبوبؐ ہے' اسی تک رسائی کے لئے یہ کلام تھا۔ اس احساس زیاں کو لے کر جب بھی قوم محبوبؐ کی طرف رجوع ہوئی تو اپنے قلب کی گہرائیوں ہی میں اسکی محبت کو پایا۔ اپنے غیب کے اندر ہی اس حقیقت کو قوم پا سکی اور اس دنیا میں اپنا مقام حاصل کرتی رہی۔ ان کے لئے محبوبؐ کا رنگ اپنانا سوائے اس کے کیا تھا کہ محبوبؐ کی اُمّت سے اس شدّت کی محبت ہو جو محبوبؐ کو اپنی اُمّت سے تھی۔ کیا محبوبؐ اپنی اُمّت کی اس بدحالی کو دیکھ سکتے تھے۔

مگر جس قوم سے احساسِ زیاں بھی جا رہا ہے' کوئی امید کی منزل یا مقام بھی غائب ہو تو اس قوم میں ایمان بالغیب کیسے پیدا کریں۔ حضرت ابراہیمؑ تک کہتے تھے ''ایمان تو ہے مگر دکھاوے''۔ جب کوئی جانتا ہی نہیں کہ مٹھائی کیا شے ہے تو مٹھائی کی لذّت بیان کر کے تھوڑی سی چاشنی بھی اس کے ہونٹوں سے لگا دی جائے تب بھی کیا پائے گا۔ تو ایمان بالغیب کے الفاظ سے یہ گمان گذرتا ہے کہ یہ ایک چیز پر بغیر دیکھے یقین کرنا ہے۔ پھر قرآن بھی یُومِنُونَ بِالغَیبِ پہلی نشانی بتاتا ہے' متقی لوگوں کی۔ اس غیب کا کھلنا فتح الغیب ہے۔ جس کی طرف غوث پاکؒ نے اشارہ کیا تھا۔ فتح کیا ہے' کھلنا ہے' بند گی کا پردہ اٹھنا ہے۔ اب غائت نظر سے دیکھیں تو جسے دیکھا ہے' سنا ہے' وہ غائب نہیں۔ اور جو علم سے باہر ہو وہ غائب ہے۔ غیب میں نہیں' پردہ میں نہیں۔ لہٰذا غیب وہ ہے جس پر یقین ہو کہ یوں کائنات کی ہر شے' چاہے دیکھی ہوئی' سوچی ہوئی ہو' یا واہمہ میں ہو اس پر گمان ہو سکتا ہے کہ ہے یا نہیں۔ اس پر کافی یقین نہیں ہو سکتا۔

البتہ کسی چیز پر یقین کامل ہو سکتا ہے تو وہ یہ کہ 'میں' ہوں 'میں' ہے اس کے لئے کسی گواہی کی ضرورت نہیں 'یہ میں ہوں' کیا ہے۔ بچہ تھا تو میں 'جوان ہوا تو میں 'غریب تھا تو میں' حاکم بنا تو میں 'حتیٰ کہ مر جاتا ہے تو کہتا ہے یہ میری لاش ہے۔ آخر یہ 'میں' ہے کیا کسی نے اس 'میں' کو نہیں دیکھا' مگر ہماری تمام فکر اور تگ و دو اسی 'میں' ہے کیا کسی نے اس 'میں' کو نہیں دیکھا' مگر ہماری تمام فکر اور تگ و دو اسی 'میں' پر ہے۔ ایمان اگر مکمل طور پر ہے تو اسی 'میں' پر ہے جو غیب میں ہے اور یہ ایمان اتنا ٹھوس ہے کہ جاہل ہو یا عالم اسی کے بل بوتے پر زندگی گزارتا ہے۔ اسی لئے تو حضرت علیؓ نے فرمایا تھا مَنْ عَرَفَ نَفْسَہٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّہٗ اور اسی لئے اپنے سے باہر ڈھونڈنے جاؤ تو کچھ نہیں۔ تو گویا عرفانِ ذات کا راستہ اپنے ہی اندر ہے۔ اور جسے ذات تک رسائی کہتے ہیں وہ سوائے اسلام کے بزرگان کے کسی کو نصیب نہیں۔ ہماری جیت ہندو حقیقت بینی پر ایمان بالغیب کی ہے۔ ایمان بالغیب مگر جسے نصیب ہو جائے' اس کا کیا مقابلہ۔ کیونکہ اسی ایمان بالغیب کی حقیقت تک پہنچیں تو ذات تک رسائی ہوتی ہے۔ اس سے پہلے نہیں۔ اور بات کچھ ایسی ہے کہ خود ہی اپنے وجود کے چکر میں گرفتار ہو کر اس حقیقت باطنی سے دور بھی ہو گئے۔

تو خود حجاب خودی حافظ از میاں برخیز

جان لو کہ ذات کی حقیقت سے آشنا ہو نہیں سکتا جب تک زمان و مکان سے اسے نجات نہ ملے 'خواہ ایک لمحہ کے لئے ہو۔ یوں وجود کے پہلو پر تو زیادہ تر توجہ ہماری ہوتی ہے اور وجود تک ہی ہم اپنا ایمان محدود رکھتے ہیں مگر زمان مکان سے ماوراء ہو کر دیکھو۔ اسی طرح نبی کریمؐ کے وجود کے پہلو پر تو ہماری زیادہ تر توجہ ہوتی ہے لیکن لَوْلَاکَ کے تصور کو' حقیقت محمدیؐ کو خیال میں نہیں رکھتے کہ وہی کل اشیاء پر محیط ہے۔ رَحْمَتِیْ عَلٰی کُلِّ شَیٍٔ کے انداز میں بتفکرون کا یہ انداز بھی پا جائیں۔ لطافتوں کو اپنا کر بھی تو دیکھیں۔

اِیمان

لطافت ایمان کو لیں۔ ایمان کیا ہے۔ بظاہر یہی جو نبی کریمؐ نے فرمایا کہ ایمان میری محبّت کا نام ہے۔ اور جس کی قرآن کریم نے تصدیق کر دی کہ تم میں سے کوئی مومن نہیں ہو سکتا جب تک انہیں اپنے ماں باپ' اہل و عیال سے زیادہ نہ چاہے۔ تو عشق نبی کریمؐ ہی تمام ایمان کی بنیاد ہوئی۔ پھر کیسے ہو سکتا ہے کہ ہم کسی اعلیٰ کے عشق میں خود اعلیٰ اور الطف نہ ہو جائیں۔ ارے ایمان تو بہت پختہ چیز ہے۔ یہ ایسی ہی چیز ہے جیسے کسی سے محبّت ہو جائے تو اس کے لئے ثبوت نہیں چاہیے۔ وہ خود بخود چیز ہے۔ یہ وہی چیز ہے۔ اس کی صداقت کی دلیل یہ ہوتی ہے کہ دُوئی نہیں ہوتی' محبوب اور طالب، میں البتہ شعوری سطح تک جسے ایمان کہتے ہیں وہ دُوئی نہیں ہوتی' محبوب اور طالب، میں البتہ شعوری سطح تک جسے ایمان کہتے ہیں وہ دُوئی ہے۔ کیونکہ شعور دوسری چیز کا ہوتا ہے اور اسی لئے اپنے لئے جو علیحدہ ہے وہ دُوئی ہے۔ توحید نہیں۔ مثلاً کوئی خیرات دے اور خیال آجائے تو شعور ہے' گھٹیا چیز ہے۔ لیکن وہ نیک اعمال جو بغیر خیال کے خود بخود پھوٹیں وہ الطف ہیں۔ ان کی بنیاد توحید ہے۔ صرف ایسی حالت میں ہی ہمارے ایمان کی سطح توحید ہوتی ہے۔ لہٰذا صداقت یہ ہے کہ جو دل میں بسا ہو وہی ایمان ہے۔

اب اس کی گواہی اَشْہَدُ کہہ کر دی جاسکتی ہے۔ اب ایمان کی مختلف سطحیں سمجھنے کے لئے یہ خیال کریں کہ پہلے محبّت، پھر ایمان، شدّت سے محبوبؐ پر تصدّق، اسکے بعد احسان۔ احسان وہی ہے جو پیر کے صدقے میں 'برزخ شیخ اور برزخ رسولؐ کی صورت میں نصیب ہوتا ہے۔ یہی رحمت کا پہلو ہے۔ رَحْمَتِیْ وَسِعَ کا اندازہ ہے۔ یہی توحید ہے۔ وحدت کو اگر مصوّر کہہ لیں تو توحید تصویر ہے، وحدت وہی خود ہے۔ اور جب قرآن کی تہہ تک پہنچیں تو توحید ہے۔ حقیقی توحید تو اسی وقت ہے جب وجود کے حبس سے نکلے۔ مگر کون نکلا ہے وجود کے حبس سے۔ یہ روح جو جسم کے حبس کے اندر گھٹتی ہے اس حبس کی کیفیت کتنوں نے لی ہے۔ شاذونادر ہی ہوتے ہوں گے جن کی زندگی وجود سے ماوراء ہوتی ہوگی۔ وہ جانتے ہوں گے کہ توحید کیا چیز ہے۔ زمان و مکان سے ماوراء کیا حقیقت ہے۔

ایمان کے بعد احسان ہے۔ برزخِ محبوبؐ، یعنی غیب اور حضوری کا رشتہ۔ حضوری کے تصوّر کے لئے عالم شعور میں جمالِ حسن کا اکمل پیکر لیں تو بات بڑی واضح ہو جاتی ہے۔ وہ ایسا جلوہ ہوتا ہے کہ نہ جلوے کا ہوش، نہ اپنا، یہی تو اپنی حقیقت کو دیکھ لینا ہے کیونکہ ہم جو کسی حسین کی طرف رجوع ہوتے ہیں وہ اپنی طرف سے رجوع ہوتے ہیں۔ معشوق میں دراصل اپنے کو دیکھتے ہیں۔ معشوق آئینہ ہوتا ہے۔ اور حسین کو بھی یہ لطف کہاں مل سکتا ہے جو دیکھنے والے کو، کہ ایک حسین کا سب حُسن سلب کر کے جب دیکھتا ہے تب مزہ آتا ہے۔ نہ پلک جھپکی، نہ آنکھ نیچی کی۔ ٹکٹکی باندھ کر دیکھا۔ مازاغ الْبَصَرَ، آنکھوں کی ٹھنڈک، وہ قاب قوسین اوادنی وہ نماز، معراج المومنین۔ وہ اَلسَّلَامُ عَلَیْکَ یَا اَیُّھَا النَّبِیُّ کی زندہ واردات۔ تب معلوم ہوتا ہے کہ حسن مطلق کیا چیز ہے۔ جب رَاءیْتَ رَبِّیْ بِرَبِّیْ (دیکھا رب کو رب سے) کا انداز ہو کر ہوش آئے تب اپنے غیب کے کھلنے کا اندازہ ہوتا ہے۔ یہ رویت گویا حقیقت محمدیؐ کا ظل تھا جس کے ذریعے تم نے اپنی حقیقت کو دیکھ لیا۔ اور جیسے ہی شعور و فہم کے ذریعہ اس حقیقت کو پانا چاہا تعینات کے پردے پڑ گئے۔ کیونکہ اپنی کوشش، اپنے تخیل، اپنے وجود سے علیحدہ ہی حقیقت آشکار ہوتی ہے۔

غور کریں کہ یہ جو ہم دیکھتے ہیں اور سمجھتے ہیں پھر بھی اس سے تشفی نہیں ہوتی۔ ایسا لگتا ہے کہ پس پردہ کچھ ہے، جو کچھ ہے حقیقت ہے۔ آخر کیا ہے پس پردہ یہ جاننے کے لئے جس حد تک انسان اپنا فنا حاصل کر جاتا ہے اس حد تک انکشاف ہوتا جاتا ہے۔ اسکے بعد لاشعور ہے وہبی اور جبلی صلاحیتیں ہیں کروڑوں سال پرانی۔ اس کے بعد ہی کہیں روح کا مقام ہے جہاں بصیرت حاصل ہوتی ہے، زمان سے آزادی ملتی ہے۔ یہ حاصل ہونے کے بعد واقعت کا رُخ یا اسی قسم کی چیزیں صحیح انداز میں آشکار ہوتی ہیں۔

روح کی منازل میں پہنچ کر اپنی انفرادی روح کی شعوری نشوونما ہوتے ہوتے روحِ کلی کا وجدان حاصل ہوتا ہے۔ جب یہ عرفان اپنا ہو جائے تو غیب کے پردے اٹھنے شروع ہوتے ہیں۔ مگر وہ ستر ہزار پردوں میں ہے اس تک رسائی پھر بھی کیسے ہو۔ مشکل یہ ہے کہ ہمارے تخیل تک اس کا ادراک ہو جاتا ہے، مگر وصال نہیں ہوتا۔ ادراک اسی کو ہوتا ہے جس کے نصیب میں اس راہ سے گزرنا ہوتا ہو۔ اسی طرح بصیرت حاصل ہو تو دیکھ لیتے ہیں مگر ہونے میں ہی اصل حقیقت ہے۔ فقراء کہتے ہیں کہ منزل یہی ہے مَنْ عَرَفَ نَفْسَہٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّہٗ۔ لہٰذا اپنی حقیقت آشکار ہوتی ہے تو انا الحق کہتا ہے اس کے بعد دیکھتا ہے کہ یہ بھی انفرادی ہے۔ اپنا جانِ جان کو کیسے دیکھے۔ حیات کی توحید کیسے پائے۔

لیک کس را دید جان دستور نیست (مولانا رومؒ)

میں کی حقیقت اور حقیقت عشق

حیات کی پہلی توحید زمان و مکان سے ملتی ہے۔ جب حیات اور زمان مکان کی توحید حاصل ہو جائے تو اپنی توحید حاصل ہوتی ہے۔ اس وقت 'مَیں' ایک ہی یکتائیت توحید میں ہوتا ہے۔ یہ نہیں کہ دل کچھ کہہ رہا ہے' دماغ کچھ۔ توحید حاصل ہو جانے کی کوئی حد نہیں۔ کامل ترین ہستی کے لئے بھی اوادنیٰ کہہ کر چھوڑ دیا۔ ابتداء وہیں سے ہے کہ لَا ہو۔ پھر سب کچھ کلمہ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَسُوْلُ اللّٰہِ میں ہے' کہ پڑھنا نہیں بلکہ کلمہ خود ہو جانا ہے۔ البتہ پہنچنا کہاں ہے۔ یہ اپنے اندر کی بات ہے۔ تمہارے اندر کہنا بھی غلط ہے کیونکہ ہم زمان مکان کے پابند ہیں۔ تب ہی حضرت علیؓ نے حضرت حسنؓ سے کہا "اے بیٹے تم اُمّ الکتاب ہو' قرآنِ ناطق ہو' تمہارے اندر ساری کائنات ہے۔" تو غیب اپنی 'میں' کے سوا کچھ نہیں۔ کہیں آسمان میں نہیں ہے یہ غیب۔ اور ایمان بالغیب یہ ہے کہ اس 'میں' کے چھلکے اتارتے جاؤ یعنی سوا کے تُو جسے اللہ کہتے ہیں وہ اس 'میں' کے سوا کچھ نہیں۔ زینہ بزینہ اس 'میں' کی حقیقت معلوم ہوتی ہے۔ تب ہی تو انا الحق کہہ اٹھتا ہے۔ مگر اسلام میزان ہے۔ ان تمام چیزوں کے درمیان میزان اور توازن کے طریقہ سے ترقی کریں تو 'مَیں' کی حقیقت کے انکشاف کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ میں بندہ ہوں۔ بندہ کی صفت عجز ہے۔ اس لئے شکریہ ءوجود میں استغفار کرتا ہے۔

پھر وہی بات آتی ہے کہ یہ اپنے اندر تجسس کی تڑپ کیوں ہے۔ یہ سر میں کیڑا کیوں ہے۔ ایک تجسس کے بعد دوسرا۔ اس طرح ستّر ہزار پردے۔ تو یہ عشق کی بات ہے۔ رُوح کی بے تابی ہے اپنے اصل کے لئے۔

بشنو از نئے چوں حکایت می کند

دز جدائی ہا شکایت می کند (۔مولانا رومؒ(

اب عشق کی بات یہ ہے کہ ذاتِ مجرد سے عشق کیا جب منتہائے لطافت زمان یا مکان کے ساتھ عشق نہیں کر سکتے تو اسکے ساتھ عشق کیا کرو گے جو الطف در الطف ہے' بے نشان ہے۔ ہاں کامل ترین ظہور یعنی نبی کریمؐ سے عشق ہوتا ہے' اگر استاد سکھا دے تب محض اپنے خیال یا جذبات سے یہ عشق پیدا نہیں ہو سکتا۔ یہ عشق زندگی کی مشعل کی بات ہے۔ ہادی اگر حقیقت کا شہسوار ہو تو توجہ سے اس مِشعل کو روشن کرتا ہے۔ وگرنہ طریقت میں چنے چبواتے ہیں۔ اللہ بہت کچھ دیتا ہے مگر اپنے کو نہیں۔ اپنے آپ کو اسی کے ذریعے دے سکتا ہے جو سامنے ہو۔ اور وہی مظہر حق ہوتا ہے جو کامل ہو۔ حقیقت کا شہسوار ہو' محبوبِ ربِّ العٰلمین ہو۔ یہ ہم کلمہ کیا پڑھتے ہیں۔

اس کی توحید نصیب نہیں ہوتی۔ مگر حق بڑا نکتہ نواز ہے۔ اسے صداقت چاہیے۔ لگاؤ چاہیے' استقامت چاہیے۔ اس کے لئے کسی ظہور حق سے عشق کا رشتہ استوار ہو جائے تو بات بن جاتی ہے۔ بس انہماک اور دیوانگی سے پیچھے لگ رہیں تو یہ بڑا غیرت مند ہے۔ ایک قدم چلو تو میں دس قدم چلتا ہوں۔ ذرا سی حرکت میں بڑی برکت ہے۔ اسی لئے دل بہ یار و دست بہ کار۔ بس لاشعور میں وہ بتّی جلا لیں' کوئی غار میں بیٹھنے کی ضرورت نہیں۔ "شعور اور لاشعور کے درمیان کا پردہ کسی مظہر حق کے دستِ کرم سے ہٹ جاتا ہے۔" اب برزخِ محبوبؐ میں ہو کر جو خیال آتا ہے وہ رُوح کی جڑوں تک

حتی کہ اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ تک ہوتا ہے۔ یہ ایقان ہے اور حقیقت وہی ہے جو تمہارا ایمان ہے۔ جسکا تمہیں حقیقی بھروسہ ہے۔ تو مومن کے ایقان کی سطح عشق نبیؐ ہے۔ اسی ذاتِ مبارک میں امن ہے، بھروسہ ہے، پناہ ہے اور اپنی زندگی کی چارہ جوئی ہے۔

وائے اسلام و مسلمانی

مگر مسلمانوں کا یہ حال ہے کہ ایمان بالغیب کی لذّت سے ناآشنا بھی ہیں اور اس کی حقیقتوں کے ساتھ زندگی گذارنے کا احساس بھی نہیں ہے۔ کیسا ذاتِ مبارک میں بھروسہ اور ایمان ہے، خود اپنے پر سے بھروسہ کھو بیٹھے ہیں۔ زندگی کے میدان میں مردبن کر زندہ رہنے کا گُر کھو چکے ہیں۔ آخر وہ کیا بات تھی جس نے جاہل بدّوئوں میں زندگی کی لہر دوڑادی تھی۔ جس نے ان کے عقیدۂ حیات بعد الممات کو اتنا راسخ کر دیا تھا کہ اسلام کے نام پر جان دینے کے لئے ایک دوسرے پر سبقت لے جاتے تھے۔ وہ کوہِ فاران کی چوٹی سے پہلا سبق، اسی آخرت کے عقیدے کی بابت تھا اور فوری طور پر مان لیا گیا تھا۔ وہ کیا بات تھی کہ روزِ قیامت اور حیات بعد الممات پر یوں ایمان آگیا تھا۔ حضورؐ کی ذاتِ مبارک ایسی تھی، ان کے ساتھ رہ کر انہوں نے حضورؐ کو امین پایا تھا۔ ان کی امانت و صداقت پر ایمان تھا۔ اسی لئے ان کی غیب بینی تک کو حضورؐ کا ذہنی تخیل یا جذبہ جان کر قبول نہیں کیا، بلکہ اس کو بھی حقیقت سمجھ کر اپنے سینوں میں اتار لیا۔ آج اسی محبوبؐ پر بھروسہ اسی اعتمادِ شخصیت کی کمی ہے۔ مسلمانوں کا خدا تو غیب میں تھا ہی نبیؐ کو بھی پس پردہ کر کے بھلا بیٹھے ہیں۔ اَب علم کو ایمان مان لیا ہے، حالانکہ ایمان تو فدا ہونے میں ہے۔ اب اصولوں کو ایمان جان لیا ہے، حالانکہ اسلام ایک طرزِ زندگی میں ہے، عملی چیز، تخیلی یا جذباتی چیز نہیں۔ اب ارکانِ دین کو گردان لیا ہے، حالانکہ دین کا تقاضہ عشق نبیؐ ہے، جمعیت بندی ہے۔ قرآن کو کتاب شمار کر لیا ہے، حالانکہ قرآن ہونے میں ہے۔ اصل جاننا تو ہو جانا ہے۔ ان سادہ بدّوئوں نے کلمہ کیا پڑھ لیا کہ فدا ہو گئے۔ ہر دم اپنے محبوبؐ کا کلمہ پڑھتے رہے۔ مگر آج حال یہ کر لیا ہے کہ اس محبّت کے پیمان کو چھوڑ کر قرآن کی سماجی اور معاشرتی تعلیمات کی تفاسیر اور فقہ میں ایسے لگے ہیں کہ مغزِ قرآن، جانِ قرآن تک کسی کی ہی نظر گئی اور حال یہ ہوا کہ احادیثِ مبارک میں سے ان ہی کی زیادہ تشہیر کی گئی جو اپنے نظریہء خیال کی وضاحت اور دلیل کے طور پر پیش کرنا چاہیں۔

اب دین کہہ لو، اسلام کہہ لو، ان سب کے پیچھے وہی ایک روشن دلیل ہے جسے ایمان کہو، ایقان کہو، ایمان بالغیب کہو، احسان کہو۔ نہ یہ تخیلی وادرا کی چیزیں ہیں، نہ جذباتی، یہ نہ درود و ظائف سے پیدا ہوتے ہیں، نہ ریاضتوں اور مجاہدوں سے۔ عشق کا ان باتوں سے کیا تعلق۔ عاشق کوئی کتابیں پڑھ پڑھ کر یا غزل گا گا کر تو بن نہیں جاتا۔ یہ جذبہء عشق تو فطری ودیعت ہے انسان میں اور پھونکا سا گیا ہے اس کے وجود میں۔

یہ جذبہ عشق ہی بنیادِ حیاتِ کائنات ہے۔ اجسام میں کشش کی صورت میں ہے۔ نباتات و حیوانات میں افزائش نسل کی صورت میں رُونما ہے۔ اور انسان خود مختار ہے۔ اسلئے جیسے ہی اس کا جذبہء عشق جاگا تو اس نے نئے نئے انداز در انداز میں اس کی رعنائی کی تجلی دکھادی۔ تو بات لے دے کر وہیں آجاتی ہے۔ یُؤمِنُونَ بِالْغَیْب پر۔ یوں ایمان ہے تو مسلمانوں میں، مگر سرد پڑا ہے۔ باطن کی گہرائیوں میں ہے۔ اسے باہر لانا ہے۔ تاکہ اس کے سہارے زندگی گذاریں اور مصروفِ عمل ہوں۔ باطن میں ایمان کی موجودگی کا ثبوت بچوں سے ملتا ہے۔ کہ آج بھی وہ اسلام اور کفر کی معرکہ آرائی

کا ذکر کرتے ہیں تو کیسے یقین کے ساتھ' وہ اسلام کو کفر پر فتحیاب ہونے کی بات کرتے ہیں۔ اور ان کا یہ رنگ دیکھ کر ماں باپ اور دیکھنے والے بھی خوش ہوتے ہیں' کہ یہ ثبوت ہے کہ جو ایمان بچوں میں ہے وہ ماحول میں بھی ہے' مگر خوابیدہ ہے اسے مصروف عمل کرانا ہے۔

پاکستان اور اسلام

جب پاکستان بنا' مسلمانوں کے پاس کوئی چیز نہ تھی۔ اہل نظر دیکھ رہے تھے کہ مسلمانوں کا کس طرح استحصال کیا جارہا ہے۔ جناحؒ اٹھے۔ احساسِ زیاں قوم کو دلایا۔ یہ احساسِ زیاں ہی قوم کو ان کی طرف لے گیا۔ حالانکہ کوئی مثبت چیز مسلمانوں کے سامنے پیش نہیں کی گئی۔ مگر آج تو قوم کا یہ حال ہے کہ احساسِ زیاں بھی نہیں' یہ منفی چیز بھی نہیں۔ اور مہدی کا تخیل قوم کو ایسا دے دیا ہے کہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے صدیوں سے بیٹھی ہے۔ اور صدیوں تک یوں ہی انتظار میں بیٹھی رہے گی۔ یہ نظریہ بھی سوائے یہودی ذہن کی عیاری کے اور کیا تھا جس نے اسلام کو یوں یہودیوں کی طرح منتظر فردا کر کے ناکارہ بنادیا۔ آخر اگر مہدی آیا بھی تو آئے۔ تمہاری زندگی کس لئے ہے۔ تمہیں بھی تو کچھ کرنا ہے۔ اس وقت قوم کا یہ حال ہے کہ وعظ سے' لکچروں سے' تحریروں سے' ذہنی طور پر مان لیتے ہیں پھر بھی نہیں ہلتے۔ مصروفِ عمل نہیں ہوتے۔ چین میں لوگوں کو ڈنڈے سے ہلایا۔ مگر ڈنڈے سے ہلانے کے لئے بھی بہت کچھ چاہیے اور کافی وقت۔ کسی قوم کو آگے بڑھانے کے لئے یقین پیدا کرنا ہوتا ہے۔ چین میں کسی نہ کسی طرح یہ عظیم یقین ہے۔ برطانیہ میں جب تک تھا تو بڑی قوم تھی۔ کوئی قائم کردہ رواج کے خلاف کرتا اور اسے یہ بات یاد دلادی جاتی' تو فوراً رک جاتا۔ مسلمانوں نے اپنی قومیّت کا یہ لحاظ بھی کھودیا۔ اسلام تو ایک جامع مذہب ہے۔ سوچیں کہ یہ مصیبتیں جو آتی ہیں تو کیا ہم مسجد میں گھُس کر آیت کریمہ سے پڑھنے لگیں۔ یہ تو اسلام کے خلاف ہے۔ اس قسم کا فرار۔ یوں نوافل سے اللہ کو اپنی طرف رجوع کرنا یا استغفار سے گذشتہ خطاؤں کی معافیاں مانگنا صرف ایک جزوی پہلو ہے۔ کلی پہلو میں تو یہ بھی ہے کہ تلوار لے کر باہر نکلنا ہے۔ نبی کریمؐ جو محبوبِ خدا تھے' جب دشمن آتا تو کیا مسجد میں جاتے تھے۔ نہیں بلکہ خندقیں کھدواتے تھے' تیاری کرتے تھے' تلوار لیتے تھے' باہر نکلتے تھے۔ دل میں یقین تھا ایمان تھا۔

اب ہندستان سے جو جنگ ہوئی ہے اس کے پس پردہ جو ظلمتیں عالم اسلام کو گھیرے ہوئے ہیں وہ بیان میں نہیں آسکتیں۔ پاکستان تو اس مسئلہ کا ایک چھوٹا سا جُزو ہے۔ اسلام کو ختم کرنے کے یہ منصوبے کوئی پانچ سو سال سے ہیں۔ مگر اب ایسا نازک وقت آیا ہے جیسے پارسیوں کو مسلمانوں نے ختم کیا' بُدھسٹ کو ہندوئوں نے کیا' یا اسپین سے مسلمانوں کا نام مٹا۔ سلطنت عثمانیہ کی وُسعتوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے عرب قومیّت کو جنم دیا گیا۔ اب پاکستان کو ٹکڑے کر ڈالنے کے لئے علاقائی اور لِسانی تعصب کو ہوا دی گئی ہے اب عالمِ اسلام پر ہر طرف وہ وقت آگیا ہے کہ تمام کوششیں یہود و ہنود و نصاریٰ کی یہ ہو رہی ہیں کہ یہ مِلّت مٹ جائے۔ مِلّت کا نام زمانہ سے اٹھ جائے۔ اب ہر اس ملک کو جس نے ہمارا ساتھ دیا گھیرے میں لیا جارہا ہے۔ کوشش یہ ہو رہی ہے کہ نفرتوں کے جذبے اُبھار کر آزادی کے نام کی جھوٹی جھلک دے کر' ترقی و خوشحالی کا لالچ دے کر' کسی طرح سے مسلمانوں کے دل سے اسلام کا جذبہ نکال دیا جائے جو تلوار لے کر دینی حمیّت و غیرت میں باہر نکل آتے تھے۔ یہی جذبہ تو قوم کو زندہ رکھے ہوئے تھا۔ طرح طرح سے اس جذبہ کو گذشتہ زمانوں میں ختم کرانے کی کوششیں ہوتی رہی ہیں۔

ان ہی باتوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ ہمارے اعمال خراب ہیں۔ حالانکہ اس شکست کا اعمال سے کوئی تعلق نہیں اور ہماری بد اعمالی کا ذکر وہ لوگ کرتے ہیں جن کے خود اعمال پر اللہ رحم کرے۔ جو اپنی ذاتی زندگی میں کچھ ہوں' قوم کے لئے دستِ مفلوج ہیں اور قوم کو ذلیل سمجھنے اور کرانے میں بھی پیش پیش ہیں۔

ارے اس مفلوک والحال قوم کے اعمال تو دیکھتے ہو لیکن نہ اپنے اعمال پر نظر ہے نہ دنیا کے دوسرے لوگوں کے اعمال پر۔ سوچیں کہ بات اعمال کی نہیں ہے' ایمان کی ہے۔ یہ تمہارے اعمال تو ایمان کے تابع ہوتے ہیں۔ مگر آج اس قوم کے ایمان کا یہ حال کر ادیا ہے کہ پوچھتی ہے ایمان کیا ہے؟۔ ایمان کس چیز میں ہے۔ ایمان توکلی شے ہے۔ نہ صرف اللہ پر' نبیؐ پر' بلکہ ہر چیز پر۔ عالم پر' جمعیت پر' ساتھی پر' اپنے پر۔ اور ایمان کی تعریف ہے ایمان بالغیب' تو یہ کیسے جگایا جائے؟ اس اُمّت میں' ملت میں؟ کیونکہ یہ صرف پاکستان کا سوال نہیں ہے۔ دشمنوں کی چالیس تو یہ ہیں کہ اسلام مٹ جائے' چاہے مسلمان رہ جائیں۔ یہ بہت بنیادی سوال ہے۔ پاکستان کو توڑ کے اس نظریے کی بنا ہلا دینے کی کوشش کی گئی ہے۔

فرد قائم ربطِ ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں

موج ہے دریا میں اور بیرونِ دریا کچھ نہیں

اب اسلام کو ملی نہیں کہا جارہا بلکہ پنجابی' پختون' مہاجر' سندھی بلوچی' بنگالی' عربی' ایرانی' ترکی' انڈونیشی وغیرہ۔ گویا اجزاء میں اسلام کو مُنتشر کیا جارہا ہے۔ پیسے سے' عورتوں سے' اقتدار کی ہوس دلا کر انہیں برباد کیا جارہا ہے۔ اس چیز کا تدارک وہی بدّوئوں جیسا ٹھوس جذبہ اور وہی سادگی کی لٹک کر سکتی ہے۔ وہ جذبہ ہے' تو دائو میں نہیں آتے۔

اس سے قبل سُنّی' شیعہ' قادیانی' وہابی' اہل حدیث' دیوبندی' بریلوی' وغیرہ کی تعریف کی گئی۔ وہ وار نہ چلا تو یہ وار چلایا گیا ہے۔ افسوس ہے کہ مسلمان جمعی طور سے اس کا احساس تک نہیں کر رہے اور عُلماء' صوفیا صرف پیوند لگا رہے ہیں۔ جزوی پہلوئوں پر نظر رکھے ہیں۔ حالانکہ مسلمان کبھی دُور رَس اسکیموں یا فلاحی اسکیموں سے نہیں جاگا۔ ہمیشہ سویا۔ ایک پہلو سے اٹھایا تو دوسرے پہلو سو گیا۔ عقیدہ درست کرنے کی کوشش کی تو عمل گیا۔ ارکانِ دین پر توجہ دی تو جھوٹی خود اعتنائی میں پڑ گیا۔ دین و دنیا کو اسی وقت توازن میں رکھا جاب نازک وقت آیا۔ تو اب اس نازک وقت کا احساس ہی دلانا ہے۔

خدا کا ذمہ اسلام کو بچانے کا یہ ہے کہ اصول زمانہ میں محفوظ رہیں گے۔ مگر یقین واثق کریں کہ عمل بغیر آپ کے ہاتھوں کے نہیں۔ یہ تخیّل' یہ نظریہ جمعیت میں کیسے دلنشیں ہو۔ ویسے وقت تو آچکا ہے۔ قسم ہے اس ذاتِ پاک کی جس کو قضا کہتے ہیں' قضائے مُبرم' وہ تو وہاں سے چھوٹ چکی ہے۔ فروغِ اسلام پاکستان سے ہی ہونا ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ ہم میں سے کتنے اس حقیقت کو اپناتے ہیں اور عمل پیرا ہوتے ہیں۔ اسی کام کے لئے فرشتے یا جن تو آتے نہیں۔ قومی فطری صلاحیتوں ہی کو ابھرنا ہے۔ اٹھنا تو اس شعلہ کو پختون سے ہے۔ اور سندھ میں بڑی جان ہے۔ شائد وہاں پر پہلے ہی

اُٹھے۔ دونوں جگہوں پر یہ جو مجاہدین جیسے گروہ ہیں اور پچانوے فی صد آبادی ایسے ہی نمازیانِ دین کی ہے' ان ہی میں جان ہے۔ چاہے کتنے ہی درمیان میں منافق بیٹھے ہوں مگر جب یہ ایمان بالغیب فضا میں پھیلے گا تو سب اُٹھ کھڑے ہوں گے۔ کچھ شہید ہوں گے۔ کچھ غازی' کچھ انعامات لیں گے۔

صرف ایک بات ہے جو بار بار کہتا ہوں۔ وہ زمانے گئے کہ کوئی ایک شخص' کوئی بھی ہو' وہ زمانہ کا رخ بدل سکے۔ وہ جسے نگاہ سے تقدیر بدل دینا کہتے ہیں' وہ اتنی سادہ بات نہیں ہے۔ وہ نگاہ یَنْظُرُ بِنُوْرَ اللہ ہے۔ اس کو سمائے ہوئے کون ہے' کہاں ہے؟ یوں تھوڑی بہت جس میں روشنی بھی ہے وہ انفرادی حد تک تو کر دیتے ہیں کہ کسی فرد پر تجلی ڈال کے اسے چونکا دیں۔ مگر قوم کا معاملہ دوسرا ہے۔ وہ نگاہ اپنے قبضے میں نہیں ہوتی۔ بندہ کے اختیار میں نہیں ہوتی۔ یہ نگاہ انائے کُل ہے جو اللہ اَکْبَر کا ظِل ہے۔ اور ظِل کے اختیار میں کیا ہے۔ جب وہ نہ ہو تو ظِل کہاں' جب وہ ہے تو یہ ہے۔ یوں ظِل ہونا تو بڑی چیز ہے۔

پھر بھی وقت کا تقاضہ تو یہی ہے کہ عمل کی مُحرک قوت کسی طرح پیدا ہو۔ خواہ وہ فرد کے ذریعے ہو یا جمعیت کے ذریعہ۔ زمانہ جمعیت کا ہے۔ تو پھر

من و ساقی بہم سازیم و بخیش را بر اندازیم

)میں اور ساقی ساتھ مل جائیں اور فساد کی بنیاد اکھاڑ دیں) کی پھریری سی سب کے وجودوں میں کیوں نہ سرائیت کر جائے۔ ہم سب نامِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی غیرت کیوں نہ بن جائیں۔ اسٹیج تو سیٹ ہے۔ ہر طرف قوم میں جذبہ ہے' چنگاری لگانے کی ضرورت ہے۔ جھنڈا لے کر نہیں نکلنا' مِشعل لے کر نکلنا ہے۔ قوم بے غیرت سہی' کمزور نہیں ہے۔ اسے میدانِ عمل میں لانے کے لئے کچھ کرنا ہو گا' یا قربانی دینی ہو گی۔ جب موج آئے تو سب شامل ہوں گے۔ یہ کُل کا سوال ہے اور آتشِ عشق کو کچھ اس طرح بھڑکانا ہے۔

ما آتش عشقیم کہ در موم رسیدیم

چوں شمع بہ پروانہء مظلوم رسیدیم

)ہم عشق کی آگ ہیں کہ موم میں پہنچے ہیں۔ شمع کی طرح مظلوم پروانہ عاشق تک پہنچے ہیں(

حضرت عثمانؓ کو قوم نے شہید کیا۔ اُمّت کی ظاہری جمعیت بندی گئی۔ نہ پھر یکجا ہو کر نماز پڑھ سکی' نہ جہاد کر سکی۔ حضرت علیؓ نے اپنی شہادت دیکر قوم کی باطنی حیات کی ضمانت کر دی۔ حضرت حسینؓ نے اپنے ساتھیوں' اپنی اولاد اور اپنی شہادت دے کر' قوم کا باطن پارہ پارہ ہونے سے بچالیا کہ بنائے لا اِلٰہ ہست حسینؓ' ورنہ ایک سَر کی قیمت لاکھوں کیا' پورا جہان تھی۔ جبکہ جانِ من جانِ عالم است' کا انداز تھا۔ ان کے بعد شمع نورِ محمدیؐ کو اٹھانے والے امام زین العابدینؒ تھے ورنہ چراغِ دین گل ہو جاتا۔ اس روشنی کو جہان میں منور رکھنے میں بھی اتنی ہی ضرورت تھی جتنی کی حسین علیہ السلام کی قربانی کی۔ مملکت نورِ باطن میں اسی نورِ محمدیؐ کے حامل زمانے میں آتے رہے' جنہوں نے یہ چراغ ظاہر باطن میں روشن رکھا۔ ولائیت میں

سب سے بلند مقام پیرانِ پیرؓ کا آیا جنہوں نے دین کو حیات بخشی اور محی الدّین کہلائے۔ ان کے قدم مبارک تمام اولیائوں کے کاندھوں پر کہ دین میں قیام رہے' بقا رہے' زمین مضبوط رہے' دین کے یہ ستُون مستحکم رہیں۔ حضرت معین الدین اجمیریؒ نے اعانت دین کر کے اسلام کے چراغ کو سرزمین ہند میں فروزاں کر دیا۔ اب یہ خطہ' خطہء اسلام بھی ہے' خواہ کفر کچھ بھی دعوے کرے۔ وہاں بھی تو مسلمان بس رہے ہیں۔ ان دلوں کی فریادیں کیا عرش پر نہیں پہنچ رہیں۔ کیا اُمّت کے والی کو ان کے دلوں کا پکار نہیں پہنچ رہی؟

مسلمانو! یہ بھی تو دیکھو کہ سنت نبویؐ کا نچوڑ کیا ہے؟ نبی کریمؐ کیا چاہتے تھے؟ کس کے غم میں وہ آنسو بہاتے تھے؟ پیٹ سے پتھر باندھے رہتے تھے۔ معراج میں بھی اُمتی اُمتی کی صدا لگی تھی۔ اس چاہ کی تھوڑی سی جھلک اگر تمہارے دلوں میں نہیں تو کیسے مسلمان؟ یہ کیا ہم نیک بننے کی کوشش کرتے ہیں' ارکین دین ادا کرتے ہیں' اس لئے کہ عذاب سے بچیں' جنت ملے۔ ارے یہ سوداگری اور خود پرستی نہیں تو کیا ہے۔ ہم قرآن پڑھتے ہیں' احادیث پڑھتے ہیں مگر اپنے سے کوئی تعلق نہیں۔ تو یہ دُوئی ہے' وحدت الوجود کہاں ہے۔ قُرب کا راستہ نہ ریاضتوں میں ہے نہ مجاہدوں میں۔ قرب کا راستہ محبّت ہے۔ جبتک اس وجود کی کثافتیں لگی ہوں تو وہ الطف کیسے قبول کرے گا۔ نور کو تو نور ہی قبول کر سکتا ہے۔ جب تک خود منور نہ ہو کیسے قُرب مل سکتا ہے۔ آخر محبّت کے کیا معنی ہیں۔ عبادت یہی کہ معبود کا رنگ آئے۔ محبّت وہی کہ معشوق کا رنگ آئے۔ محبّت سے بڑی عبادت کیا ہو سکتی ہے۔ محبوب کا رنگ سوائے اس کے کیا ہے جو ایک درد تھا نبی کریمؐ میں اُمّت کے لئے۔ مسلمانوں نے اسے نہ اپنایا اور اسے بنیادِ دین و حیات نہ بنایا تو کیا پھل پائیں گے۔ نبی کریمؐ کو تو اپنی اُمّت سے اتنی محبت تھی کہ آئندہ آنے والے اُمّت کی اس لئے تعریف و تحسین فرمائی کہ وہ بغیر مجھے دیکھے یہ محبّت کا رشتہ قائم رکھیں گے۔ ان کے اس ایمان بالغیب کو' جو ذاتِ مبارک سے انہیں ہو گا' اتنا سراہا کہ انہوں نے خصوصی مقام پر اپنے بعد کے آنے والے امیوں کو دیا۔

بشارت سورۃ الکوثر

حضور سرور کائنات تو قاسم کوثر ہیں' بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ہیں۔ تو کیسی ناامیدی۔ مسلمان کیسے ہی سہی' ہیں تو ان کے نام لیوا' ہیں تو ان کی اُمّت' ہیں تو ان کی اولاد۔ تب ہی تو ازواج مطہرات کو اُمہات المومنین کے لقب سے نوازا۔ کفار نے جب یہ کہا کہ آپ کی نسل منقطع ہو گئی اور آپ ابتر یعنی بے نشان ہیں اس لئے آپ کے دین کا چرچا چند روزہ ہے' اور یہ سب دین کے بکھیڑے ختم ہو جائیں گے۔ تب حضورِ حق سے آپ کی تسلی کے لئے کوثر نازل ہوئی۔ اِنَّآ اَعْطَيْنٰكَ الْكَوْثَرَ O فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ O اِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْاَبْتَرُ O یہ مختصر ترین سورہ پیامِ نوید ہے' شادمانی اور کامرانی کی خبر ہے۔

آج کے زمانے میں بھی کفار نے یہی صدا اُٹھائی ہے کہ دین اسلام سب بکھیڑا ہے اور بس اب دم توڑ رہا ہے اور اس کا چرچا چند روزہ ہے۔ تو ایسے میں رحمت محمدیؐ کیسے جوش میں نہ آئے گی۔ سنو! پھر سے مژدہ جانفزا اُمّت کو دیا گیا ہے۔ سورۃ الکوثر کی تجلی قلوبِ مومنین پر پھر سے ڈالی گئی ہے۔ اپنے قلبوں ہو تو اسلام کیسے مٹ سکتا ہے۔ اسلام تو سارے عالم کے لئے پیغام بن کر آیا ہے۔ اسے تو ابھی تمام عالم میں پھیلنا ہے۔ تب ہی کہیں قیامت آئے گی۔ نورِ حق' باطل کی پھونکوں سے کب بجھ سکے گا۔ سنو! ان کفار کے مفسدانہ نظریات اور اسلام کی ابتری کے اعلانات' اس رحمت کو جوش میں لے آئے ہیں جسے کوثر عطا کی گئی ہے۔ جسے فرما دیا گیا تھا کہ تیرا دشمن ابتر ہو گا' ذلیل و رُسوا ہو گا۔ آج بھی ملّت اِسلامیہ دامن شفاعت میں ہے۔ بے

آسرا بے سہارا نہیں ہے۔ اس کا دکھ درد رکھنے والا' پائندہ جاوید ہے۔ تم اپنے باطن میں فتح مبین کی تجلی دیکھو۔ سَلَامٌ ھِیَ حَتّٰی مَطْلَعِ الْفَجْرِ کا کیف لو۔ اِنَّا اَعْطَیْنٰکَ الْکَوْثَرَ کا مژدہ قوم کو دو۔ تمہیں کوثر عطا کر دی گئی ہے۔ یہ غیب کے جاری و ساری خزانے' انعامات اور اکرام ہیں۔ تو اب شکرانہ میں اس غیب کے ساتھ صلواۃ قائم کر لو۔ دس بدست شانہ بشانہ رابطہ پیدا کر لو۔ توحید ذاتی قائم کر لو۔ یہ غیب کا رابطہ تمہارے اندر ہے۔ اور یہی حق ہے۔ اسکے بل بوتے پر اپنی ساری فکر و عمل کو ڈھالو۔ شِدّتِ کار' شِدّتِ انہماک' یک رُخی' حق کے ساتھ جذبہ اپنے عمل میں لائو۔ اپنی صلاحیتوں کے ان خزانوں کو جو جمعیت کے اندر ہیں' بے حساب ہیں' پوری صداقت اور بے نفسی سے حق کی اس تجلی کے انشراح کے لئے قربان کر دو۔ یہ بے لوث عمل' یہ غم اُمّت شکرانہ کی نماز ہے۔ اور شکرانہ کی قربانی' یہ عمل پیہم کی قربانی' قربِ حق کی نشانی ہے۔ ابراہیمیؑ سُنّت قربانی اپنی عزیز ترین شے کی قربانی تھی۔ دعوائے اقرارِ خلیلیّت کی سند تھی۔ لَااِلٰہَ کی منزل تھی۔ مگر یہ صاحب کوثر کی قربانی کا اندازِ غم اُمّت کو اپنا کر عمل پیہم کی مسرّتوں کا اظہار ہے۔ زندگی ظاہر باطن کی جدوجہد میں حیاتِ جاوید اُمّت' اور اس کی کامرانی اور فتح کی خوشی ہے۔ جیسے کہ یہ خود حق کی طرف سے قربانی ہے۔ اہل حق کی قربانی فدائیوں کی عملی قربانی ہے۔ اپنے محبوبؐ کے نشاطِ خاطر کے لئے کیا پیارا انداز ہے۔ فَصَلِّ لِرَبِّکَ وَانْحَرْ۔ اور کیا شان زیبائی ہے۔ اِنَّا اَعْطَیْنٰکَ الْکَوْثَرَ۔ جب مجھے آبِ کوثر سے غسل دیا گیا تو میرا حُسن اتنا نکھر آیا کہ میں خود اپنے آپ پر فریفتہ ہو گیا۔ اور جب اس وجود پر آیہء کوثر نازل ہوئی تو حُسنِ عروسِ جمعیت کی تجلی سارے عالم میں جگمگا اٹھی۔ میں خود انا اعطینک الکوثر پکار اٹھا۔ فَصَلِّ لِرَبِّکَ وَانْحَرْ اِنَّا شَانِئَکَ ھُوَ الْاَبْتَرُ زندگی کا ہر اقدام محبوب کے لئے ذبح عظیم بن جائے۔

قربان جائیں اس شگفتگی پر' جشن منائیں' اس پیغام پر کہ تمہارا دشمن ذلیل و خوار ہو گا۔ ڈھول بجائیں اور منادی کریں۔ زور سے اور زور سے کہ اس کی گونج سارے عالم میں پھیل جائے اور اس کی بازگشت تمہارے قلُوب سے کلمہء لَااِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہ کی تلوار بن کر کفر کے مقابل صف آرا ہو جائے۔

اَللّٰھُمَّ انْصُرْنَا مَنْ نَّصَرَ دِیْنَ مُحَمَّدٍؐ O

باب ۴

ہم کیا کریں

تباہی کا حکم

ہم کیا کریں! یہ قوم کیا کرے! وہ سوالات ہیں جو اس وقت جمعیت کی فوری توجّہ کا مرکز ہیں۔ بات کچھ ایسی ہے کہ بغداد جیسی تباہی کے احکامات ہیں۔ اور دستِ عطّار بھی جو خود مرکز حق' ابوالوقت ہے' اندر باہر کی ایسی توحید' انا امتی' میں ہے کہ تباہی کا حکم دینے والا بھی وہی' پیالہ اُلٹ کر بغداد کو دامن امن میں چھپانے والا بھی وہی' پھر پیالہ اُلٹانے سے ہاتھ رکوا کر بغداد کی تباہی کے ساتھ ساتھ اپنی بھی جان نذر کرنے والا وہی۔ یہ کیفیت

توحید' ظاہر باطن کی وہ میزان ہے جس میں فنابقا' موت وحیات' زندگی وبربادی ایک ہی پیمانے میں ہیں۔ ظاہر اُمّت کا اثر اپنے باطن پر ہے۔ امّت تباہی کی طرف رواں دواں ہے تو یہ بھی دستِ قدرت کا معاون بن کر اور تباہی کو تیز سے تیز تر کھینچ کر لے آنے والا بنا ہوا ہے' کہ قدرت کا یہی اسلوب ہے۔ اور ساتھ ہی اس تباہی کے تصوّر سے دل آزردہ بھی ہے کہ رحمت کا یہی تقاضا ہے۔

سبز درختوں کا جُھنڈ بارانِ رحمت لاتا ہے' تو خشک لکڑیاں آگ کو دعوت دیتی ہیں۔ فطرت کا تقاضا تو ایسی صورت میں یہی ہوتا ہے کہ آگ لگے اور لگے تو بھڑک کر لگے۔ پھر جب آگ لگے تو کیسے سبز درخت' سبز جھاڑیاں اور بیل بوٹے' سب ہی ساتھ فنا۔ توحید ویگانگت کا تقاضا تو یہی ہے کہ سب ایک ہی رنگ میں ہوں۔

حضرت صابر مسجد جاتے ہیں تو پھٹے کپڑے ہونے کی وجہ سے اگلی صفوں سے ہٹاہٹا کر پیچھے کر دیئے جاتے ہیں۔ سجدہ کرتے ہیں تو مستیء توحید میں نہ بدلہ ہے' نہ غصہ' نہ کسی سے شکایت۔ ایک مستی کا عالم ہے۔

ایک بزرگ کے خلیفہ بادشاہ کے پیر تھے۔ اپنے مُرشد کے لئے کہا کرتے کہ وہ تو مرغی کی طرح ہیں جیسا انڈا نیچے رکھو گے ویسا ہی بچہ نکلے گا۔ گویا سب اور نتیجہ کی حدود میں گرفتار تھے۔ فضل وبرکت اور امر باللہ کو نظر انداز کر رہے تھے۔ کسی نے مرشد کو یہ بات سنائی' فرمایا ڈوب کر مرے گا۔ قضائے کار یہ مُرید خلیفہ بادشاہ کے بستر پر آرام فرما ہوئے۔ ملکہ بھی نادانستہ طور پر اپنی جگہ جا سوئیں۔ بادشاہ آئے تو انہیں سوتا دیکھ کر واپس چلے گئے۔ صبح کو خُدام کو حکم دیا کہ ان بزرگ کو دریا کی سیر کرانے لے جاؤ اور ڈبو دو۔ خُدام نے ایسا ہی کیا۔ ملکہ کو خبر لگی تو بادشاہ کو حقیقت حال سے آگاہ کیا۔ اب بادشاہ سخت نادم ہوئے مگر اپنے پیر کی جان لے چکے تھے۔ بہت سے جواہرات اور ایک تلوار لے اپنے مُرشد کے پاس پہنچے کہ قصاص لینا ہو تو حاضر ہے اور اگر خون کا بدلہ خون لینا ہے تو یہ تلوار حاضر ہے۔ یہ بزرگ جلال میں آئے چہیتے کا اتنا سا قصاص اور ایک گردن۔ فرمایا تو تباہ' تیری سلطنت تباہ۔ ایسا ہی ہوا۔ آخر شہسوارِ توحید تھے۔ خود ذاتِ حق بنے بیٹھے تھے۔ اور چہیتے خلیفہ اُمّت کے مصداق تھے۔ نہ یہ نفس کی سطح کی بات تھی نہ غُصّہ کی۔ ایک توحید کی کیفیت۔ ایک مرا تو سب مریں۔ یار کا جنازہ اکیلا کیا نکلے۔ مگر خود ہی ڈبونے والے اور خود ہی بہا لینے والے اور خود بھی اس خوں بہا میں شامل۔

ہائے اس زُود پشیماں کا پشیماں ہونا۔

مقامِ توحید

فقیر 'انا اُمتی' کچھ ایسی ہی توحید کی مستی میں ہوتا ہے۔ اُمّت تباہی کی طرف رجوع ہے وہ بھی دستِ قدرت بن کر اس تباہی میں مدد ومعاون ہوتا ہے۔ کل کے آتے آج ہی ہو جائے۔ بزن بزن۔ اندر باہر ہر طرف بزن۔ اور ساتھ ہی کف افسوس بھی ملتا جاتا ہے۔ تو ایسی حالت میں نہ میں کچھ کر سکتا ہوں نہ تم' نہ جمعیت نہ اُمّت' نہ بزرگ جو مقامِ توحید میں ہوں' نہ وہ جو آزاد ہو' نہ وہ جو اپنے اپنے جذب میں مست دوام' نہ وہ سالک جو ہر حال میں راضی بہ رضا اور اُف تک کرنے کی تاب نہیں رکھتے' نہ وہ قلندر جو بے باک ہو کر اپنی مرضی پر چلانا چاہیں۔ یہ کام ایک ہی کر سکتا ہے اور ہے بھی یہ یکتائی کی بات۔ یعنی وہ جسے کہیں کہ 'ہے'۔ وہ کہنا بھی بے ادبی' آخر کس کی طرف اشارہ۔ دوسرا ہے کون۔ یہ دُوئی' یہ شرک' یہ گستاخی' یہ نظر کی بے باکی'۔

’ہے‘ کہلائے جانے کا مصداق ابو الوقت ہے‘ نورِ محمدیؐ کا حامل۔ زمان مکان اس سے ہیں‘ اسی میں ہیں۔ رسول اللہ کو مرکز توحید نہیں بنایا بلکہ مرکز عشق‘ مرکز حُب‘ مرکز رحمت۔ رَحمَتِی وُسِعَ عَلیٰ کُلِّ شَیٍٔ۔ سب تخلیق پر رحمت کا سایہ۔ اسی طرح صاحب تاج و معراج وبُراق و علم‘ دافع بلا و وبا و قحط و مرض و الم۔ اس رحمتً لِّلعالمینی کو جذب کرنے والا‘ نشر کرنے والا یہی ابو الوقت ہے۔ اور انا اُمتی بھی۔ ایسا ابو الوقت صدیوں میں پیدا ہوتا ہے یا سنوارا جاتا ہے۔ جھلک سب کو ملی ہوتی ہے مگر کچھ تو اَدب کا پردہ ڈال کر رہ جاتے ہیں اور کچھ توحید کی مستی میں گُم۔ پھر بھی ذات کی مستی کیا‘ دشتِ ہُو میں گم گشتگی کیا۔ رحمتً لِّلعالمینی کا انداز تو کچھ اور ہی ہے۔ اِدھر اللہ سے واصل‘ اِدھر مخلوق میں شامل۔ رحمت کی معراج کا تقاضا‘ نزولِ انوار ہے‘ کرم ہے‘ شفقت ہے‘ رحمانیت ہے‘ رحیمیت ہے۔ مانگنے والے کو بھی دینا اور بے مانگے زیادہ عطا کرنا ہے۔ بلا تخصیص دینا ہے۔ جیسے ایک ہوا سی رحمت کی جو پژمردہ دلوں کو پھر سے تازگی بخشے۔ ابو الوقت کا دائرۂ عمل کچھ ایسا ہے کہ تمام چھوٹے چھوٹے آئینے اسی ایک بڑے آئینے کے رخ ہوں تو یہ رحمت کے انوار کو مرکوز کر کے مصروفِ عمل ہو جاتا ہے۔ اور چھوٹے چھوٹے آئینے اگر بے رخ ہوں تو رحمت کے نشر میں اتنی ہی کمی ہوتی ہے۔ اس لئے فُقرا میں توحید فکر کی ضرورت ہے جیسے نباتات ابرِ رحمت کے آنے کا ذریعہ‘ اسی طرح ان چھوٹے چھوٹے ننھے ننھے آئینوں کی عاجزی رحمت کو سموتی ہے۔

عاجزی وہ صفت ہے جو عبد کے نصیب میں ہے۔ ذاتِ حق کے پاس عاجزی نہیں۔ تو یہی زبردست کشش کی صفت‘ مثبت کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔ رحمت کو سموتی ہے۔ مجھ میں‘ تم میں اس جماعت‘ اس قوم میں عاجزی کیسے آئے۔ عاجز ایک ٹوٹا ہوا دل ہی ہوتا ہے۔ ایک زخم خوردہ دل ایک بیمار آنکھ‘ ایک تھک تھک کر چور ہو جانے والا جسم‘ ایک تباہ و خستہ حال انسان۔ مبارک ہے وہ دل جو اُمّت کے غم میں خون کے آنسو رو رہا ہو۔ مگر وائے اپنے انجام سے بے خبر ہونے والی قوم کہ وہ یا تو تنکوں کا سہارا ڈھونڈتی ہے یا ایسی وحشی اور خود غرض ہو جاتی ہے کہ جیسے کئی دن کا بھوکا‘ ساتھی کو بھی چیڑ پھاڑ کھا جاتا ہے۔ چاروں طرف افلاس دیکھنے والا لالچی ہو جاتا ہے۔ ذرداری کی حرص میں لگ جاتا ہے۔ چاروں طرف بھوک اور غلہ کی کمی دیکھنے والا ذخیرہ سمیٹنے لگتا ہے۔ الغرض چاروں طرف ہم قسم کی بیماریاں دیکھنے والا ہر قسم کی دوائیں جمع کرنے لگتا ہے۔ اسی طرح سے ہر طرف سے پِٹ پِٹ کر انسان مختلف قسم کے غاروں میں چھپ چھپ کر پناہ لینے لگتا ہے۔ ربُوبِیت سے اس کا تعلق منقطع ہو کر توکل ختم ہو جاتا ہے اور عارضی اور جھوٹے سہارے اسکے خدا بن جاتے ہیں۔ اس طرح بہ ظاہر‘ حریص دولت و عظمت‘ حریص ہوا ہوس‘ حریص طاقت و سطوت‘ بہ باطن ایک مفلس و نادار انسان ہو جاتا ہے۔ خود اعتمادی اور خدا اعتمادی دونوں کھو بیٹھتا ہے۔ اپنی ناکامیوں کی طرح طرح سے پردہ پوشی کرتا جاتا ہے۔ رَبُوبِیت‘ برکت‘ رحمت سے کبھی کا دُور ہو کر ہر عمل کو سبب اور نتیجہ کے آئینے میں دیکھنے کا عادی ہو جاتا ہے۔ مُسبّبُ الاسباب سے نظر ہٹ چکی ہوتی ہے۔ نظر کو سیری عطا ہونے کے لئے‘ احسان و انعام و اِکرام کی بارش کی ضرورت ہے۔ کیونکہ بچہ ماں باپ سے پِٹ پِٹ کر محبّت بھی کھو بیٹھتا ہے اور خود اعتمادی بھی۔ اسکا وہ بھروسہ جو ماں باپ پر اعتماد سے نصیب تھا ختم ہو چکا ہے۔ یہ بھروسہ اسے رَبُوبِیّت پر اعتماد کی وجہ سے حاصل تھا‘ جس کا ذریعہ ماں باپ بنے تھے۔ وہ خُد اعتمادی کا ظِل تھا۔ اس میں مجبور و کم عقل بچے کا کہاں تک قصور۔

نُصرتِ حق

آج بھی فرد اور قوم میں خود اعتمادی کی کمی ہے۔ خود اعتمادی شفقت و رحمت کے وسیلوں سے نصیب ہوتی ہے۔ اس میں بچے کی اہلیت کو دخل ہے' نہ اس کی یک رخی اور بے رخی کو' نہ اس کے جہل و ظلمت کو' نہ حرص و ہوا کو' نہ اس کے توڑنے پھوڑنے کے جذبے کو' نہ ہر چیز کو اپنانے اور خود غرضی کو۔ بچہ تو فطرت کی طرح معصوم ہے۔ انسان بھی یا تو معصوم ہے یا مجبور۔ محض ایک تھوڑا سا سہارا' ایک انعام' ایک کامیابی' ایک فتح اس کے حوصلے بلند کر دیتی ہے۔ اس کے آگے نئے عزائم' ایک کامیابی' ایک فتح اس کے حوصلے بلند کر دیتی ہے۔ اس کے آگے نئے عزائم' نئے نصبُ العین کی راہ کشادہ کر دیتی ہے۔ ۶۵ء میں نُصرتِ حق شامل حال تھی۔ قوم کی روح میں بیداری تھی۔ ۷۱ء کی خواری میں اپنا وقار' اپنا اعتماد بھی کھو بیٹھی' اور حق پر اعتماد بھی۔ اب مادّی طریقوں سے اپنی راہِ خود اعتمادی کی تلاش میں اندھے کی طرح اندھیرے میں راہ ڈھونڈ رہی ہے۔ سبب اور نتیجہ کی حدود میں گرفتار ہے۔ ایسے میں آنے والے طوفان کو کیسے روکا جائے۔ اب سوال یہ ہے کہ یہ طوفان اُٹھا کہاں سے؟ یہ بزن بزن جہاں سے نکلا' یہ آگ کا شعلہ جہاں سے بھڑکا اس کے پس پشت بھی تو رحمت ہے' جو تازیانے پر تازیانہ لگا کر اپنی طرف رجوع کرا رہی ہے۔ اسی جگہ تو فضل و برکت کے سوتے ہیں۔ اسی جگہ تو ابر رحمت منڈلا رہے ہیں اور برسنے کے لئے عرصہ سے بے تاب ہیں تاکہ اس آگ کو ٹھنڈا کر دیں یہ رَبُوبِیّت اور رحمت ہی کی تو بے چینی تھی جو شعلہء آگ بن کر بھڑک اُٹھی تھی۔ مگر ان سوکھے جنگلوں میں بہت سے سبز پودے' بیل بُوٹے ہیں جو ابرِ رحمت کے لئے تڑپ رہے ہیں۔ ان میں عاجز پرندے اور طُوطیانِ خوش الحان بھی ہیں جو پیاسے ہیں۔ جھاڑ جھنکار کا جلانا ہی کیا۔ خُشک لکڑی سے تعمیر کا کام کیوں نہ لیا جائے' یا اس خس و خاشاک کو بھی تر اور سیر اب کیوں نہ کر دیا جائے کہ آگ کا بھی تقاضا جائے۔ دوزخ کی آگ ٹھنڈی کرنے کے لئے حق اپنا ایک پیر اس کے شکم میں ڈال دیں گے۔ رَبُوبِیّت اور ماں کے پیر کے نیچے جنّت ہے۔ جنّت کو دوزخ کی آگ کی لپیٹ نہیں لگ سکتی۔ رَبُوبِیّت دہکتی آگ کو ٹھنڈا کر دیتی ہے۔ انسانوں کے جسم اور پہاڑوں کے ایندھن سے اسکی شکم سیری کب ہوتی ہے۔ هَلْ مِنْ مَزِيدٍ هَلْ مَزِيدٍ ہی پکارتی ہے۔ القصّہ آگ کو ٹھنڈا کرنا ہی اس کا انجام ہے۔ يَانَارُ كُونِي بَرْدًا وَسَلَامٌ عَلَىٰ إِبْرَاهِيمَ۔ ایک حکم تھا اور وہ بھی بے طلب ابراہیم۔ نہ اس کے لئے دُعا نہ نجات حاصل کرنے کی پریشانی و فکر۔ اسی طرح ایک طوفان جو اُٹھا ہے اس کا رخ پھیرنے کے لئے ایک حکمِ رَبُوبِیَّت' ایک فرمانِ رحمت کی ضرورت ہے۔ کچھ نہیں' کوئی دیوار نہیں' بس ہاتھ سے اِشارے سے کہہ دیتے ہیں تو طوفان اپنا رخ بدل لیتا ہے۔ رخ بدلنا یہ نہیں کہ طوفان کی جگہ بھوک' قحط' افلاس' خانہ جنگی' بیماری' وبا۔ رخ بدلنے میں محض دوسری صورت اختیار کرا دینا کیا معنی۔ یہ تو رحمت کے تقاضوں کے سراسر خلاف ہے کہ یوں بہانے تلاش کرے۔ رخ پھیرنے میں یہی رمز ہے کہ سَلَامٌ عَلَىٰ إِبْرَاهِيمَ۔ رخ پھیرنے میں یہ بھی تو ہے کہ کمان سے نکلا تیر واپس لاتے ہیں۔ رخ پھیرنے میں یہ بھی ہوتا ہے کہ جدھر سے اٹھا اِدھر ہی واپس' یعنی جمال کے مقام سے اوپر اٹھا لیا اور جلال کے مقام سے زیرِ زمین کر دیا۔

فروغِ اسلام کی راہ

اب سوال یہ ہے کہ اس قوم کو جھنجھوڑنے کی بجائے کیا یُوں ہی تاریکی اور غفلت میں اسے چھوڑ دیا جائے۔ اگر ایسا ہے تو اس قوم کو اسلام کی وہ راہِ فروغ کیسے ملے جو عرصہ سے اس کے مُقدر میں ہے۔ فروغِ اسلام' مسلمانوں کے فروغ میں مضمر ہے۔ جوانی کا فروغ بچے کے فروغ میں مضمر ہے۔ ایک سہارا' ایک رَبُوبِیَّت و رحمت کی تابانی اسے خود اعتمادی نصیب کرے گی۔ اسے نہ اتنا مارا جائے کہ ٹوٹ جائے نہ اتنا دیا جائے کہ برباد ہو جائے۔

یہی بچہ تو لڑتے لڑتے مجاہد بن جائے گا۔ تھوڑا تھوڑا کھا کر شکم سیر ہو جائے گا۔ چشتیہ رنگ بھی یہی ہے کہ نیت بھرا دی جاتی ہے۔ تب ہی اُدھر سے احسانوں کی بارش دیکھ دیکھ کر احسان مند بن جاتا ہے۔ یہ قوم بھی اپنے حالات میں دستِ کرم شامل دیکھ کر خود دست کرم بن جائے گی۔ اپنے ساتھ امر باللہ دیکھ کر خود آمر باللہ ہو جائے گی۔

یہ سائنس اور مادیّت کا زمانہ ہے۔ بیماری اور وبا پھیلی ہو تو انجکشن لینے والے محفوظ ہو جاتے ہیں۔ قحط ہو تو ذخیرہ بندی اور راشن بندی کرا دی جاتی ہے۔ قتل وغارت گری ہو تو ڈیفنس کمیٹیاں منظم کر دی جاتی ہیں۔ جنگ ہو تو عام لام بندی اور سامانِ حرب سے لیس کرا دیا جاتا ہے۔ غائت نظر سے دیکھیں تو یہ سب کچھ رحمت کے مادی پہلو ہیں۔ اور قلب کی سطح سے رحمت کا اندازیوں ہے کہ ہمت' عزم' اِستقلال' شوقِ شہادت اور دیگر اعلیٰ اقدار کا انسان پر پر تو پڑتا ہے۔ پھر روح کی سطح سے رحمت کی تجلی امر باللہ سے ہے۔ اسکے تحت امر کے اجراء کا عام حکم ہے۔ سب ہی کلمہ گو کمیشنڈ آفیسر' سب ہی آمر باللہ' بھلے میں بُرے ہیں' آخر کو اپنے ہیں۔ کہلاتے تو اُمتی ہیں۔ یہ کیسے ہی سہی' مگر کسی کے نام کی غیرت تو بنے ہیں۔ اس کی لاج بھی تو رکھنی ہے۔ اسی نام کے صدقے میں تو یہ مقامِ جبروت کے وارث ہیں۔ محبوبؐ کے محبوبؐ ہیں۔ یہ ملائک سے اوپر کا مقام ہے۔ یہاں تجلیء نورِ محمدیؐ ہے۔ یہاں نسبت محمدیؐ ہے۔ یہاں رحمت کا دامن نصیب ہے۔ قیصر و کسریٰ بھی ان کے زیر اثر ہیں' ہندو' یہود و نصاریٰ بھی۔ ان کی قسمت میں نہ بربادی ہے نہ تباہی۔ انہیں ذُوالفقار لی ملی ہے جو فقر کے میدان میں ظاہر باطن میں چل رہی ہے۔

نظر آیا جلالِ کبریا شیر خُدا ہو کر

جمال اللہ کا ظاہر ہوا مُشکل کُشا ہو کر

یہ فقر کراری' جلال و جمال دونوں سمیٹے کمال کے میدان میں خیمہ زن ہے۔ یہ مشکل کشائی رحمت کا کمال ہے' کمال سب جلال جمال پر محیط ہے۔ مگر کمال کو اپنانے والے کم ہی آئے اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ کسی کسی سے ہی کہا جا سکا۔ کبھی کبھی ہی وہ فرد اور وہ دن آیا جس پر رحمتً لِّلعالمینی سایہ تھا۔ یہ اُدھر ہی کی عطا تھی۔ جیسا زمانہ ویسا ہی صحیفہ اتارا گیا اور مصحف یار کی رُونمائی تو یوں بھی کبھی کبھی ہی ہوا کرتی ہے۔ رحمتً لِّلعالمینی مقام سے رحمتوں کے سائے گنہگاروں پر ہی اترا کرتے ہیں۔ کبھی سلامتی و حفاظت کی چادر بن کر' کبھی اُمّت کے لئے کالی کملی کی واردات بن کر اور اس وقت تک جب تک کہ مَطْلَعِ فَجر ہو' قوم کا طلوعِ فجر ہو' سَلَامٌ ہِیَ حَتّٰی مَطْلَعِ الْفَجْر' اس قدر کی رات ملائکہ اور روح نازل کئے جاتے ہیں۔ کُلّی امر و سلامتی کے ساتھ یہاں تک کہ طلوعِ فجر ہو۔ طلوعِ فجر نہ رات ہے نہ دن۔ ایک برزخ کا سماں۔ سحر کے بعد روح کی زندگی ہے اس میں ایک نمود کی لذّت ہے' کُنْ کی تجلّی ہے۔ اس اُمّت کی رات کی صبح تو اس وقت ہے جب حُسن کا وہی پہلا جلوہ پھر سے دیکھے گی۔ یہ کیفیت نہ ہجر میں ہے نہ وصال میں۔ یہ حِصّہ بانٹے جانے والی رات' ان چُھپے ہوئے باطنی راستوں کا ذکر ہے جس میں ملائک قدرت کی طاقتیں اور روح' امر الٰہی انسان کو عطا کیا جاتا ہے۔ اسے کُلّی قدرتوں' حکم اور سلامتی کا پیکر بنا دیا جاتا ہے۔ اسی کی زندگی پردوں سے نکل کر اظہار میں آ رہی ہوتی ہے۔ وہ کلی کا سا انسباط' وہ نکھار جو گل میں ہے نہ بند شگوفہ میں' وہ حسن اُمّت کے چہرہ سے پہلی نقاب کشائی' وہ روحِ اُمّت کی بیداری کا سماں۔ اُمّت کی یہی سحر اب جلوہ فگن ہونے والی ہے۔ اسی طلوعِ سحر کے لئے اُمّت کے ہاتھ دعا میں اُٹھے ہیں۔ اُمّت کی اس سحر کی تصدیق ہر صبح مُؤذّن کرتا ہے اور اُمّت کی سحر تو اسی وقت ہو گی جب محبُوب کے چہرہ کی جھلک ملجائے۔ تو دعا

ہے کہ اس اُمّت کو رخِ محبوبؐ عطا ہو۔ محبوب الٰہی حضرت نظام الدین اولیاؒ کا انداز تجریدی رنگ میں ہم کو عطا ہو، جس کا تفریدی رُوپ بابا فریدؒ ہیں۔ محبوبؐ کی جلوہ نمائی کی وہ تڑپ ہم کو بھی عطا ہو جائے جو بُرقع کشائی کی صبح امید بن جائے۔

رُخ بہ نُما کہ اے پری صبح اُمید من توئی

بُرقع کُشا کہ اے صنم جلوۂ عید من توئی

ہر سُخنے کہ می کُنی قندِ حلاوت آیدت

گنج شکر بہ زیر لب پیرِ فرید من توئی

بخت رود بہ گامِ من دشتِ مُراد حاصلم

تا سگِ تو مرا بگفت کہ اے مرید من توئی

رُخ کشا کہ اے پری جلوہ عیدِ من توئی

برقع کشا کہ اے صنم صبح اُمیدِ من توئی"

صورتِ مہر نیمروز۔ عالمِ جان بر فروز

جانِ جہاں بدید آ۔ تابش دید من توئی

لب بکُشا۔ بہ نغمہ آ سِرّ سرود آنما

پردۂ سازِ جان را۔ کفِ نوید من توئی

برق فگن۔ بہ شُعلہ دہ۔ کاہش ممکنات را

کُن کُن سرا۔ فِگاں نما۔ دید و شنید من توئی

معنی بہ حرف و صوت دہ مستیٔ ذوق و شوق ریز

جانِ مشامِ جاں توئی۔ گُلے سعید من توئی

راہِ جنوں نُما نُما۔ دردِ سکوں کُشا کُشا

سوزِ قریب من توئی۔ سازِ بعیدِ من توئی

قاب بہ قاب قوس کُن۔ نُورِ ظہور تاب دہ

آبِ جمال برفشاں۔ کشتِ حمید من توئی

تاب وتب وجُود رانکہت شرح صدر کُن

بُوئے دلیلِ رَہ توئی۔ شمع وحیدِ من توئی

) رحمٰن بابا(

باب۵

فراستِ مومن

وَالنَّجمُ وَالشَّجَرُ یَسجُدَانِ

دائمی سجُود وصلواۃ کی واردات

فَصَلِّ لِرَبِّکَ کتنی پیاری صلواۃ کی دعوت ہے' سجدہ بندگی کا شُکرانہ ہے' بے ساختگی اور قُرب کی نشانی ہے' عشق کی مستی ہے۔ وَالنَّجْمُ وَالشَّجَرُ یَسْجُدَانْ سب ہی سجدے میں ہیں۔ ایک ہی یکتائی ہے۔ جب زمین بھی وہی ہے' یہ جبین بھی وہی ہے' اور یہ بھی وہی ہے' وہی بھی وہی ہے' تو کون کس کا سجدہ کرے۔ یہ نجم یہ شجر دائم قائم سجود و صلواۃ میں ہیں تو اس کیف میں ماسواء ہے کہاں جو ہم لَا اِلٰہَ کہیں۔ اس وحدت میں یہ 'ہم' کیا ہے؟ حقیقتِ دوام ہے جو ایک ہی ہے۔ یہ کُل ہے' نئی آن نئی شان کے ساتھ ہے۔ یہاں 'ما' و 'تُو' کہاں' ہُو اللّٰہُ اَحَدُ اس ایکائی میں نفس اور ابلیس کہاں۔ نفس اور ابلیس' یہ ان کے لئے ہیں جن میں غیریّت' ہو دُوئی ہو۔ جو 'من' و 'تُو' کی چکی میں پس رہے ہوں۔ لیکن جن کو نہ اپنی خبر ہو اور نہ خبر کی خبر' تو کیسی غیریّت' کیسی دُوئی' کس کی خبر۔ مَازَاغَ الْبَصَرُ وَمَاطَغٰی نہ نگاہ نیچی کی نہ آنکھ جھپکی' اصل شہُود و شاہد و مشہود ایک ہوا۔ نظارہ نظر میں شامل رہا۔ ہوش آیا تو ایک بے پردہ ہوش۔ ہوش تو آئینہء قدرت کی جِلا ہے اور مردِ مومن کی شان ہے۔ نماز معراج المؤمنین' وہ لذّتِ سجدہ۔ جُھکے تو قَابَ قَوْسَیْن او ادنیٰ راز و نیاز کی باتیں۔ فَاَوْحٰی اِلٰی عَبْدِہٖ مَااَوْحٰی یہ اس بندے کے نصیب میں ہیں جس نے انا اُمتّی کی کملی اوڑھ لی ہو۔ اُمتّی اُمتّی ہی اس کی آرزو ہو۔

فراستِ مومن کا حصول

اُمّت جو پانچ سو سال سے ذہانت یہود و ہنود و نصاریٰ کا شکار بنی ہوئی ہے اس سے قوم کو کس طرح رُوشناس کراتے ہوئے اس کی راہ نکالی جائے۔ اس کا مستقبل کس طرح روشن کیا جائے۔ وہ راز کیا ہے جس سے قوم میں وہی فراستِ مومن آجائے جو اسلام کے ابتدائی دور میں اسے نصیب تھی۔ ہدایت مِن جانب اللہ کا ذریعہ وہی باطن کے راستے کھلنا ہیں۔ راز و نیاز کی باتوں کی کُنجی' رجوع الی اللہ' رجوعِ الی الحق ہے۔ نماز یکسوئی' شدّت کا ایک ذریعہ ہے۔ قوم کے باطن کی پکار ہے' قلب سلیم کی آواز ہے۔ ''دل کو اپنے وجود کی زمین میں گاڑ دو۔ اس کی جڑوں سے شجر طیبہ کے شجر کو خفی پانی سے تقویّت ملے اور نورِ عقل کی روشنی پھلے پھیلے۔ زمین کھود کر جڑوں کو دیکھنے کی کوشش نہ کرنا۔ ہاں عجز اور غم کے آنسوئوں اور عمل صالح کے پسینے کی بارش سے دنیا کی گرد و غبار جو دھوپ کی راہ میں حجاب بن جاتے ہیں' دُھلتے رہیں۔ تب کہیں فراستِ مومن حاصل ہوتی ہے۔''

ایک ذرا سی دیر کے لئے اپنی سطح سے بُلند ہو کر دیکھیں تو سب کے سب خواہ عوام ہوں خواہ خاص ہوں' خواہ مصلحین ہوں یا مفکرین' اپنے حاصل کردہ علم کو ہی اپنی مشعل راہ بنا بیٹھے ہیں۔ خود ہر قسم کی اصلاح سے اپنے کو مُبرا سمجھ کر دوسروں کے پیچھے لگے ہیں اور وہ بھی شائد لاشعور میں اپنی ہی داد و ستائش یا عاقبت سنوارنے کی فکر میں۔ حالانکہ اسلام جمعی کردار میں ہے' فروغ میں ہے' دین فطرت ہے۔ جب تک مومنین اپنی فطرتِ باطنی کو پائے رہے' ظاہر میں بھی سربُلند رہے۔ اور باطن کے چراگ بھی روشن رہے۔ باطن فطرت میں نمو ہے' فروغ ہے' اِرتقاء ہے۔ اس کی عمل پیرائی مادی ذہنی سطح پر بھی ہے' اور قلب و روح کی سطح پر بھی۔ اپنے وجود کی زمین میں بھی اہے اور نورِ عشق کے آسمانوں میں بھی۔ انفاس میں بھی ہے، آفاق میں بھی۔ آج ہم اپنا جائزہ لیں تو ظاہری زندگی تک میں ذہنی خلفشار' مادّی کشمکش اور نفسا نفسی ہے۔ اسی لئے عمل و کردار کی نہ کوئی راہ متعین ہے' نہ اس میں اِخلاص و شدّت ہے۔ قوم کی قوم میں ایک تساہل' بے دلی' سُستی' خود غرضی' منافعت طلبی ہے۔ نفسا نفسی کا یہ عالم ہے کہ لِسانی' نسلی' علاقائی تفرقے ہیں' حسد' بغض' عناد' مُنافرت' چھینا جھپٹی' منافقت کا دور دورہ ہے۔ کہیں جاہ و اقتدار کی بُت پرستی ہے' کہیں ظلم و استبداد کی گرما گرمی۔ غرض

ہر قسم کی منفی صفاتِ نفس، آج پیرویانِ دین کے نصیب میں ہیں۔ نظر جب اپنی ابتلائوں، اپنی جڑوں سے ہی نہیں ہٹنے پاتی تو، مسلمانوں کی طرف کیسے رجوع ہوں۔

مسلمانوں کا اس حال تک پہنچ جانے کا سب جاننے کے لئے، ان چہرہ دستیوں پر بھی نظر رکھنا ہو گی جو پانچ سو سال سے ذہانت یہود و ہنود و نصاریٰ کا عطیہ ہیں۔ کیفیت یہ ہے کہ آج اس کا تجزیہ تک کرنا بذاتِ خود ایک دشوار عمل ہے۔ گو اس فِتنہ سے کسی نہ کسی طرح مسلمانانِ عالم روشناس ضرور ہو گئے ہیں مگر اس کا مقابلہ کرنے کے لئے راہ نہیں مل رہی۔ یہودیّت اور برہمیّت صرف مذہبوں کے نام نہیں۔ ان کی ہزاروں سال کی خود پرستی، نسلی غرور کے سبب آج یہ نفس کل کے روپ ہیں۔ ان ہی کے تحت ان کے ذہن رسا کا عروج ہے۔ اب کئی صدیوں کی کوشش سے انہوں نے غَیرِ الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّالِّيْن کے زُمرہ سے اپنے کو نکال کر دوسروں کو ان منفی صفاتِ نفس سے آراستہ کر دیا ہے جو انہیں راندہ درگاہ رکھتے ہیں۔ ٹھنڈے دل سے اپنے کو مِن حیثُ القوم دیکھیں تو کیا ہم اس جہنم ارضی کے کنارہ تک نہیں پہنچ گئے۔ عوام کو تو خیر چھوڑیں کہ عوام الناس عَلٰی دِینِ مُلُوکُھُم لیکن وہ خواص جو دین و وطن کے نام پر اصلاح کرنے کا نام لیتے ہیں، ان میں اپنی لیڈری کا غرور ہے۔ علم و دانش، فہم و فراست کا غرور ہے۔ حسب و نسب، حشمت و عظمت، جاہ و اقتدار کا غرور ہے اور جو شریف النفس ہیں ان کے لاشعور میں علم کا غرور ہے، اعمالِ صالحہ کا غرور ہے۔ ریاضت، عبادت، فہم دین کا غرور ہے، اور اس حد تک کہ اپنا تجزیہ، اپنے علم و دانش کا تجزیہ تک کرنے کے لئے تیار نہیں۔ ایک خود فریبی، جھوٹی خود اعتمادی، خود اعتنائی، خود پرستی میں گرفتار ہیں۔ بات بھی کرتے ہیں تو اپنے علم و دانش اور ذہن و عقل کا سہارا لیکر۔ حالانکہ اس مادی عقل کی رسائی ہی کیا ہے۔ آج حسن اخلاق کا یہ حال ہے کہ دین کی پابندی کی طرف لوگوں کو رجوع بھی کرتے ہیں تو تُرش کلامی سے، ڈنڈے کے زور سے، جس سے نہ اس شخص کی باطنی خوبیاں اُجاگر ہو سکتی ہیں، نہ اللہ اس بیدلی اور بیگار سے خوش ہوتا ہے۔ ان مصلحین میں لوگوں کے حسن باطن کو نکھارنے کی وہ تڑپ بھی نہیں جو ماں باپ کو بچے کے لئے ہوتی ہے۔ چہ جائیکہ رحمتٌ لِّلعالمین کے وسیلے سے اُمّت کے ساتھ اُمتیّ اُمتیّ کی نسبت کہ ان کی حالت دیکھ کر بے چین ہو جائیں، آنسو بہائیں۔

نفس کل کی کار فرمائی

اس طرح دیکھا جائے تو عقل و ذہانت اور ظاہر پرستی خواہ اپنی ہو یا ذہانتِ یہود و ہنود، انکی اصل تو ایک ہی ہے، وہی نفس کُل، جس کے تحت ہر عمل انسانی خود غرضی پر مبنی ہوتا ہے۔ نفس کُل کی کار فرمائی دو سطح پر ہے۔ نفس اور لطیفہء نفس۔ نفس کی سطح پر ذہانت کا نام عیّاری، مکاری، دغا، فریب، ظاہری اصلاحی پروگرام، ظاہری مدد و اعانت، ظاہری معاشی اقتصادی اور معاشرتی اصلاحی پروگرام وغیرہ جو علم کی روشنی اور تہذیب کے نام پر ایک جال کی طرح دنیا کو گھیرے ہوئے ہیں۔ ان کے پیچھے ذاتی اغراض، رِیا، فریب، اپنی تہذیب و تمدن کی سربلندی، اپنا اقتدار کار فرما ہے۔ اور لطف یہ ہے کہ تمام منصوبوں کے پیچھے حسن عقل و دانش اس طرح کار فرما ہے کہ عقل و دانش والے ہی اس جال میں زیادہ پھنستے ہیں۔

البتہ لطیفہء نفس کی سطح وہ ہے جہاں اپنے تمام اعمال کے پیچھے خلُوص ہے‘حسن اخلاق ہے‘سچی ہمدردی ہے‘فلاحِ انسانیت کا جذبہ ہے۔یہی فطرت کے عین مطابق ہے۔مثبت صفت ہے۔اس فطری جذبے کی کار فرمائی پاکیزگی میں دیکھنی ہو تو بچوں میں دیکھیں خواہ کہیں پیدا ہوئے ہوں‘اس حسن فِطرت سے آراستہ ہوتے ہیں۔عجز اور غم کے آنسوئوں اور عمل صالح کی پسینے کی بارش سے دنیا کی گرد و غبار‘جو دھوپ یعنی رحمت کی راہ میں حِجاب بن جاتے ہیں‘دُھلتے رہیں‘تب کہیں فراست مومن حاصل ہوتی ہے۔

ردہ ہے جو اسے دیا گیا ہے۔

لے دے کے بات اس پر آجاتی ہے کہ مختلف ذرائع سے حاصل کردہ علم ہی انسان کی راہ کھوٹی کرتا ہے۔یہ ہے اصل حقیقت اپنے ذہن و عقل کی۔اس عقل ظاہر ہی کا سہارا لے کر جیتے رہنا شیوئہ انسانیت نہیں ہے۔سطحی اور ذہنی حاصل کردہ علم کے تحت یہ کتنا بڑا خطرہ ہے کہ اپنے ذاتی خلوص کے باوجود اگر غلط علم کو ہی صداقت مان کر شدّت سے‘خون پسینہ ایک کر کے عمل کرتے رہے‘تب بھی کیا بن سکتا ہے۔یہی کچھ اپنے صاحبانِ عقل و دانش کو دیکھنا اور پانا ہے۔اسی کے پیچھے قوم کی زبوں حالی‘تمام فلاحی پروگراموں کی پے در پے ناکامی‘اور قوم کا شیرازہ منتشر سے منتشر تر ہوتے جانے کا سبب پالینا ہے۔

حُبِّ رسولؐ‘فراستِ مومن کا سرچشمہ

بات یہ ہے کہ ظاہر تک تو ہماری شدّت سے نظر گئی۔اپنے علم اور اپنے خلوص پر بھی بھروسہ کیا۔مگر اس خلُوص کو عمل پیرا کرانے کے لئے راہ بھی خود ہی مقرر کر بیٹھے۔اپنی عقل پر تو اتنا ایمان رہا مگر جس سے محبّت کا نام ایمان تھا اس ذاتِ گرامیؐ کو بھلا بیٹھے۔جس سے محبّت کے عوض ہی تائید ربی مل سکتی تھی اس کی فکر نہ کی۔جس کی طرف دن رات اپنے ہر عمل میں نظر رکھتے ہوئے صحیح طریق راہ نصیب ہو سکتا تھا اس کو بھلا بیٹھے۔زبانی دُرود صلواۃ تو بہت کچھ پڑھا‘کبھی اس کی زندہ حقیقت کو محسوس نہ کیا۔اپنے علم‘اپنی عقل و دانش‘مذہبی کتابوں پر اپنی دسترس نے یہ فرصت ہی کہاں دی کہ اس کا بھی کچھ خیال کرتے جس پر اللہ و ملائک بھی مصروفِ دُرود ہیں‘جس کے ذکر کو آسمانوں میں بلند کر دیا گیا ہے۔جسے کوثر عطا کی گئی ہے‘جسے اس کے دشمن کے خوار ہونے کی خوشخبری دی گئی ہے۔غیروں سے گلہ کیا اپنے ہی جب والی‘مولا‘ہادی و رسولؐ سے اسطرح کنارہ کشی کر بیٹھیں تو ان کا خود حال ابتر کیوں نہ ہو۔جن کا کلمہ پڑھا ان کا دامن رحمت نصیب نہ ہوا تو تمہارا زُہد و تقویٰ‘ریاضت و عبادت علم و فہم اکتسابی اور کتابی علم‘کس کام کا۔تم اپنے نفس‘اپنی ذاتی اغراض‘اپنی بخشش و نجات کے چکروں سے ہی نہیں نکلے تو تم کیا جانو مومن ہونے کی شان؟محبت کرنے والوں اور مر مٹنے والوں کی آن۔

تم کیا جانو کہ فراست مومن کیا ہے؟یہ فراست مومن ہی تو تھی جس کے آگے کُفار لرزہ براندام تھے۔یہ فراست مومن ہی تھی جس کے انوار جاہل بدّوئوں تک میں آگئے تھے۔یہ فراست مومن ہی ہے جس کا ذکر قرآن میں آیا ہے کہ مومن کی فراست سے ڈرو۔مومن وہ ہے جو مرمٹنا جانتا ہے۔بدّوئوں کی طرح یار پر فدا ہو جانے کے لئے ایک دوسرے سے سبقت لے جانا چاہتا ہے۔اس کا مطمع نظر محبوبؐ‘ہمارا مطمع نظر زُہد و تقویٰ

ہے یا علم و دانش۔ تو خود دیکھ لیں کہ کہاں سے کہاں قوم کو پہنچا دیا۔ آج بھی یہود و ہنود و نصاریٰ جو مسلمانوں سے ڈرتے ہیں وہ صرف اسی بات سے کہ یہ قوم یار کے نام پر بے دریغ قربان ہونا جانتی ہے۔ یہ محبّت' یہ جذبہ اس قوم سے نکال دو تو پھر رہنے دو انہیں مسلمان' کہ جئے جائیں اپنی ظاہر داری' عقل و دانش کی تاریکیوں میں' آخرت کی اُمید میں۔ اب مسلمانوں کو ان کی ظاہر داری اور ظاہر بینیوں سے نکلنا ہے۔ یار کی غیرت میں ایک ہی ہو جانا ہے۔ وہی بدّوؤں کی سی سادگی' وہی فراست و مومن' تائید ربیّ' اِلقا' جس کا سرچشمہ محبّت ہے' ایمان ہے نبی کریمؐ کی ذات میں۔ یہی تعلق' یہی نسبت' یہی فدا ہو جانے کا جذبہ ان کی مِشعل راہ تھا۔ وہ دل سے نبی کریمؐ کی طرف ہر وقت رجوع تھے۔ جب بھی کوئی دشواری آتی دھیان یار کی طرف کرتے' کتابوں کے ورق نہ گردانتے' بلکہ اپنے محبوبؐ کی غیرت کو اپنے اندر پاتے اور ہدایت اندر سے پھوٹ پڑتی۔ اس فراست مومن کے سرچشمے عقل میں نہیں تھے بلکہ دل میں تھے' محبّت کے تعلق میں تھے' ایمان اور بھروسے میں تھے' علم لُدنی کے سہارے تھے' اِلقا پر مبنی تھے۔ بھلا یہ بھروسہ کونسے ظاہری علم کے ذریعہ حاصل ہو سکتا تھا۔ یہ محبتوں کے چراغ تو اپنے اندر روشن تھے۔ باہر سے تو اس کی تائید مل رہی تھی یا پھر اپنے اس بھروسے اور ایمان پر وحی و الہام کے پیغامات سے مہریں ثبت ہو رہی تھیں۔ معصومیت اور عشق اپنے ہی اندر تھا جس کے دروازے محبوبؐ کے تخیل میں کُشادہ کر دئے گئے تھے۔

فطرت معصوم ہے' اس میں عشق ہے' کشش ہے' کُن ہے' ارتقاء ہے فروغ ہے' نمو ہے تو اپنے وجود کو بھی نمو اور فروغ و ارتقا کی فطری چال چلنے دو جس میں بقائے دام ہے۔ اس نصبُ العین کو اپنانے دو جس میں پائدار اقدار ہیں۔ بصیرت کی نظر سے دیکھو گے تو صرف ان اعمال و کِردار کو دوام ہے' حیات ہے' بقائے ہے جو انفرادیت کی راہ سے ہٹ کر جمعیّت کا رُخ لئے ہوں۔ فرد کی فنا ہے' جمعیت کو بقا ہے۔ جمعیت سے تقویت بغیر کشش' بغیر عشق و محبت کے' بغیر رابطے اور لگاؤ کے نہ ظہور میں آتی ہے نہ قائم رہتی ہے۔ اسی عشق و محبّت کی صلاحیّت کو اپنے اندر اُبھرنے دو۔ دل کو اپنے وجود کی زمین میں گاڑ دو کہ تمہاری رگ رگ' ونس نس میں تمہارے تخیّل' ارادے' عمل اور کِردار میں یہ جمعیت کی محبّت کا جذبہ جاں گزیں ہو جائے' محبّت کو اپنے وجود میں جاگزیں کرنے کے لئے آبِ حیات ذکر خفی ہے۔ جمعیت کے شجر طیبہ کو جس میں تمہارا اپنا وجود و کردار بھی ہے خفی کے پانی سے تقویّت ملے اور نورِ عقل جو عقلِ کُل ہے' جو نُور کی شکل میں کائناتِ وجود پر حاوی و ساری ہے اس کی روشنی میں یہ شجر پھلے پھولے۔ حقیقت بینی تمہارے وجود و کردار میں آئے تو تم اس وقت اَصْلُہَا ثَابِتٌ فِیْ الاَرْضِ کی تمثیل ہو گے کہ تمہاری جڑیں تمہارے وجود میں مستحکم ہوں گی اور تم نُورِ عقل کی روشنی سے سمٰوات میں بلند ہو رہے ہو گے۔

لیکن زمیں کھود کر جڑوں' اپنی نسل' اپنے علم و فضیلت' اپنی عقل' اپنی ہنر مندی' اپنی قوّت' اپنی دولت' اپنے اقتدار' اپنی 'میں' کو دیکھنے کی کوشش نہ کرنا تاکہ تمہیں خود فریبی اور غرور نہ گھیرے۔ اور یہ خود بینی و خود پرستی تمہیں اپنی طرف کھینچ کر بلندیوں کی طرف رجوع ہونے سے بے بہرہ نہ کر بیٹھے۔ ہاں عجز اور غم کے آنسوئوں اور عمل صالح کی پسینے کی بارش سے دنیا کی گرد و غبار' جو دھوپ یعنی رحمت کی راہ میں حِجاب بن جاتے ہیں' دُھلتے رہیں' تب کہیں فراست مومن حاصل ہوتی ہے۔ یہ فراست مومن' عقل کی فراست سے بُلند شے ہے۔ عقل کی فراست سے تو علم کا غرور آجاتا ہے جو عذاب ہے۔ البتہ جس علم سے عاجزی نصیب ہوتی ہے وہ یہی القائے ربی ہے۔ کیونکہ اصل رُشد و ہدایت کا سرچشمہ تو وہی ہدایت مِن جانب اللہ

ہے۔ عاجزی وہ صفت ہے کہ بے نیاز بھی رجوع ہوتا ہے۔ نیاز مند بن جاتا ہے۔ یہ عاجزی ہی عبدیّت و بندگی و اخلاص و شانِ فقر ہے۔ اس لئے اپنی تمام قابلیتوں' صلاحیتوں کے ہوتے ہوئے' اپنی تمام کوششوں' مجاہدوں' ریاضتوں' خدمتوں کو نظر انداز کرتے ہوئے' اپنے تمام پسینوں کو بہاتے ہوئے اپنے میں اس عاجزی کا کیف لو۔

مقامِ بندگی' غمِ اُمّت

مقامِ بندگی دے کر نہ لُوں شانِ خُداوندی کار مزپائو کہ اسی اور صرف اسی نوعیّت میں یہ دنیا کا گرد و غبار یعنی جھوٹی ستائش' جھوٹا نام و نمود اور علم و فضیلت' جاہ و جلال' پارسائی' خدمت خلق وغیرہ خود اعتنائی میں تمہیں ڈال کر تمہاری عاجزی کو برباد نہ کر ڈالیں۔ تمہارے عاجز اور ٹوٹے ہوئے دل کی پکار' اُمّت کے غم میں تمہارے آنسو ہی تمہاری دولت ہیں یہ نہ خود غرضی کی وجہ سے ہوں گے' نہ نام و نمود کی خاطر۔ تب ہی تم رحمت کے مستحق ہو گے اور رحمتً لِّلعالمین کی سُنّت ادا کر رہے ہو گے۔ رحمت کی دُھوپ میں ہی شجر طیّبہ فَرْعُہَا فِی السَّمَاءِ ہو سکتا ہے۔ تب ہی کہیں فراست مومن حاصل ہو سکتی ہے۔ اس حالت میں تمہاری مادّی' جسمانی عقل تمہاری رہبری نہ کر رہی ہو گی۔ بلکہ نُورِ عقل جو خود تمہاری فطرت میں ودیعت تھا اور اب تک حِجاب میں تھا' بے نقاب ہو جائے گا۔ تب کہیں تم خود گواہی دے سکو گے کہ۔

؎ آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں

غیب کا سرچشمہء رحمت

اس نُورِ عقل کی روشنی میں تم اس عقل کی ترکیبوں کا مقابلہ کر سکو گے جس کی جڑیں نفسِ کُل میں ہیں۔ کیونکہ اب ہدایت و روشنی بالواسطہ حق سے' تمہارے باطن وجود کے ذریعہ' تمہیں حاصل ہو رہی ہو گی۔ عام روشنی کی طرح اس روشنی کو تم نہیں دیکھ سکتے مگر ان رحمت کے انواروں میں تم بات پالو گے کہ فی الواقعہ سرچشمہء رحمت تو غیب میں ہے۔ اور اس کے انوار تمہارے تخیل' عقل' اعمال' کردار سے رونما ہو رہے ہیں۔ فراستِ مومن کا سرچشمہء فیضان' وہی دامنِ رحمت ہے جس سے عشق کی یک رُخی میں شدّت سے وابستگی ہے۔ فضل' رحمت' برکت' ہی اصل رُشد و ہدایت ہے۔ اپنی عقل و دانش کو 'میں' کی کثافتوں سے بلند کر کے اسی نُورِ عقل سے رابطہ قائم کرو۔ صداقت و خلوص' وفا' ایمان' ایقان' سب کے سب محبّت ہی کے فیضان ہیں۔ اور محبّت پیدا ہوتی ہے محبوبؐ کے رابطے سے' محبوبؐ کو اپنے اندر بسانے سے' محبوبؐ کی موجودگی اپنے وجود کے غیب میں پا جانے سے۔ اسی کیفیت کو پا جانے کے لئے جو کام ہو' ارادہ ہو' تخیل ہو' عمل ہو' محبوبؐ کی خاطر ہو' محبوبؐ کے وسیلے سے ہو' محبوبؐ کی اُمّت کے لئے ہو۔ اس حالت میں رِیا اور خود فریبی تو تمہارے نزدیک بھی نہیں بھٹک سکتی۔

گویا فراستِ مومن کے لئے بس ایک ایمان چاہیے نہ کہ تدبر اور مادّی وسیلوں پر بھروسہ۔ محبوبؐ سے اس تعلق کے طفیل تم دیکھو گے کہ رحمت کس طرح تمہارے لئے بے چین ہے۔ تمہیں حق کی کیا تلاش ہو گی جو حق کو تمہاری ہے۔ پھر جب حق سے اس طرح نسبت قائم ہو جائے تو دشمنوں کے ڈورے اور ریشہ دوانیاں، عقل و مکر کی چالبازیاں کہاں تمہارا مقابلہ کر سکتی ہیں۔ محبوبؐ سے نسبت اور محبّت قائم ہو جانے کا اندازہ تم اسی سے کر سکتے ہو کہ تم ان کی اُمّت کے لئے سراپا محبّت قائم ہو جائے گی۔ اس لئے کہ حضورِ اکرمؐ نے فرمایا تھا "گنہگار میرے" یہی تو رحمت ؐلِّلعالمینی ہے جس کے تصدّق سب فطرت ہے اور جسکی بِنا پر تمہارا والی محبوبؐ رَبِّ العَالمیُن کے لقب سے نوازا گیا ہے۔

جان لو کہ ہدایت نہ عِلم سے ہے، نہ اپنی عقل سے ہے، نہ فہم و دانش سے ہے، نہ کتابوں سے ہے۔ ان سب میں روشنی اور نُورِ ہدایت بس اسی نسبت سے ہے جسے نسبت محمدیؐ کہتے ہیں اور یہ ایک والہانہ لگاؤ ہے۔ ایک اعتماد اور بھروسے کی بات ہے۔ محبت کی بات ہے۔ محبت کے لئے نہ شرائط ہوتی ہیں، نہ دلیلیں۔ جسے بھی نصیب ہو جائے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ رحمت ؐلِّلعالمین کی طرف تمہارا رُخ ہو اور ان کی رحمت سے تم محروم رہ جاؤ۔ اس رحمت ؐلِّلعالمینی کو زندہ و پائندہ حقیقت مان لو۔ عقل و دانش کی گمراہی سے بچو کہ وہ تو سوائے 'میں' اور اپنی عقل کے کسی دوسری حقیقت کو ماننے سے روکتی ہے۔ حالانکہ فراستِ مومن تو یہ ہے کہ سب کچھ محبوبؐ کے تصور میں ہے۔ محبوبؐ کو اپنے اندر بسانے میں ہے۔ گویا کلمہ کیا پڑھ لیا کہ محبوبؐ پر فدا ہو گئے۔

اس دِینوی فراست، عقل و دانش کا مقابلہ جس فراست مومن کی سطح سے ہو سکتا ہے نہ دلیلوں کی بات ہے، نہ منطق کی، نہ ردِّ دلائل کی، نہ علم و دانش کی، نہ کتاب و لکچر کی، نہ پند و نصائح کی، نہ ورد و ظائف کی، نہ اصلاحی پروگراموں اور ان پر عمل درآمد کرانے کی۔ یہ تو سب سطحی چیزیں ہیں۔ اصل بات باطن کی ہے، اپنے اندر کی ہے، لگاؤ، کشش اور محبّت کی ہے اور وہاں تک رسائی صرف ایمان کے فیضان سے ہو سکتی ہے۔ یہ ایمان بالغیب کی بات ہے۔ جن کی زندگیاں محبوبؐ کے لئے ہو گئی ہوں انہیں کون گمراہ کر سکتا ہے۔ جو محبوبؐ کے نام پر فدا ہونا جان گئے انہیں کون موت سے ڈرا سکتا ہے۔ جن کا عمل محبوبؐ کی خاطر ہو گیا ان کے قدم کون اُکھاڑ سکتا ہے۔

فراست مومن اور فتوح القلوب

یہ بھی سادہ سی بات ہے کہ منافرت، مخالفت، چالبازی کا مقابلہ اسی مکاری کی سطح سے کرو تو زیادہ سے زیادہ اس کے شر سے اپنے آپ کو محفوظ کر لو گے یا تم خود بھی اس سے زیادہ منافرت، مخالفت میں پڑ جاؤ گے۔ مگر بات تو فتح کی ہے، فروغِ اسلام کی ہے، اِرتقائے انسانیت کی ہے۔ فتح یہ نہیں کہ دشمن کو زیر کر دیا جائے یا ختم کر دیا جائے بلکہ فتح یہ ہے کہ اسے بھی اپنا لیا جائے۔ اس کا بھی سینہ کُشادہ کر دیا جائے۔ جب وہ دل سے تمہاری برتری، بزرگی، اخلاق، اقتدار، مان لے اور اسے اپنے لئے رحمت سمجھے، تب بات ہوئی۔ محبّت، رحمت تو وہ تلوار ہے کہ تلوار بھی چلے تو عالم کی بہتری کی خاطر، فساد کو مٹا دینے کی خاطر۔ اس میں نفرت کا جذبہ بالکل نہیں۔ نفرت اور محبّت کی مار میں بڑا فرق ہے۔ یوں ڈاکٹر بھی آپریشن کرتا ہے، کاٹ چھانٹ کرتا ہے۔ یہ بھی تو رحمت کا ایک پہلو ہے اور بغیر اس کے کام بھی نہیں بنتا۔ ماں باپ مُصلح کی حیثیت سے بچے پر سختی کرتے ہیں۔ جانور کو بھی سُدھارنے کے لئے اس پر سختی کی جاتی ہے۔ گو ظاہر بیں آنکھ کو یہ ظُلم، جہالت، کرختگی نظر آتی ہے مگر حقیقت میں اس کے پیچھے وہی جذبہء شفقت و محبّت اور رحمتؐ

لِّلعالمین دیکھتے ہیں۔ اور یہ بات عین فطرت کے نظام کے مطابق بھی ہے کہ نااہل کی جگہ اہل کو دیتی ہے۔ فرد کے وجود سے جمعیت و انسانیت کا رُوپ ڈھالتی ہے۔ اور اُمّت کے وجود سے نااہلیت کو ہٹا کر اس کی لَا اِلٰہَ کراتی ہے۔ پھر اس کے حسن کو سنوارنے کے لئے باطنی ہدایت و انوار، حُسن کردار و عمل عطا کرتی ہے، جن کو دوام ہے، بقا ہے۔ یہ اس کی اِلّا اللہ ہے۔ اس کے بعد ہی کہیں رحمت لِّلعالمین وسیلے سے رحمت کار فرما ہونے لگتی ہے اور تب ہی صحیح معنوں میں کلمہ لَا اِلٰہَ اِلاَّ اللہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللہِ کی تکمیل، انفرادی اور اجتماعی وجودوں میں ہوتی ہے۔ فراست مومن کی کنجی بس یہی مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللہ ؐ ہے۔ یہی اس کی عقل و دانش کا نُور ہے۔ یہی اس کے عمل و کردار کا حُسن، یہی اس کے جہاد کی تلوار اور مقصد سب کا ایک ہی ہے۔

وَمَآ اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا رَحْمَۃً لِّلْعٰلَمِیْن o O O

" جب اللہ تعالیٰ کسی بندے پر تجلّی فرماتا ہے تو اس کی عقل کے نور کو اپنی بلند ذات کی وحدت کے نُور سے روشن فرماتا ہے۔ پس وہ اپنی صفت کو اس کی صفت دیکھتا ہے۔ اور اپنے فعل کو اس کا فِعل دیکھتا ہے۔ اس وقت حادث (نیا) اور قدیم (پرانا) کی تمیز اُٹھ جاتی ہے۔ اس مقام کو جمع (ایکائی) کا مقام کہا جاتا ہے اور توحید میں اس سے بلند کوئی مقام نہیں۔"

(ترجمہ قول غوثِ پاک)

باب ۶

سالار زماں

اِذَا جَآءَ نَصْرُ وَالْفَتْحُ وَرَاَیْتَ النَّاسَ یَدْخُلُوْنَ فِیْ دِیْنِ اللہِ اَفْوَاجًا

O

قوم کی رُوح

سائنس کے نقطہ ء نگاہ سے دیکھا جائے تو کسی قوم کی بڑائی کا سبب اس کا وہ نصبُ العین ہوتا ہے جس میں دائمی اِقدار ہوں۔ اور جن کے حصول کے لئے وہ عزم و حوصلہ سے ایک مسلسل جدوجہد میں لگی ہوئی ہو۔ یہی نصبُ العین اس قوم کی بقاء، اِرتقاء اور عرُوج کا ضامن ہوتا ہے۔ تاریخ کے ورق پلٹیں تو اس دنیا میں بڑی بڑی قومیں اپنی تہذیب اور عمرانیّت کو لے کر نمودار ہوئیں، کچھ عرصے دنیا میں رہیں اور پھر ختم ہو گئیں۔ بڑی بڑی مُہذب قوموں کا یہ حال ہوا کہ ان میں سے کچھ صفحہ ءہستی سے ایسی غائب ہوئیں کہ اس دنیا میں اپنا نشان تک نہ چھوڑا اور صرف آثارِ قدیمہ کی تحقیقات کی زینت بن کر رہ گئیں۔ قوموں ہی کا کیا، جانوروں کے وجود تک کو اس سطح ارض پر دیکھا جائے تو ان میں بھی ایسی ایسی نسلیں اور اقسام آئیں جن کا شاندار دور دورہ رہا مگر پھر قدرت کے ہاتھوں مٹ گئیں۔ الغرض تمام کی تمام انسانی، حیوانی اور نباتاتی زندگی کی بقاء، اِرتقاء اور تنزل کا جائزہ لیا جائے تو یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ زندگی اور قدرت کے کچھ ایسے ہی فطری تقاضے اور نظریے ہیں جن سے نسل انسانی و حیوانی اور قوموں کو پائدار اقدار نصیب ہوتی ہیں اور انکی زندگی کو ان کے سہارے ایک طویل عرصے تک بقا حاصل ہوتی ہے۔

پُرانے دانش وروں کا کہنا ہے کہ جیسے ایک فرد کی روح ہوتی ہے جو اس کے جسم میں ہوتے ہوئے اس کی اِرتقا کا باعث بنتی ہے اور ایک عمر طبعی تک، جسے ستر ۷۰ یا سو سال کہہ لیں، اس کے جسم میں رہتی ہے، اسی طرح ہر قوم کی ایک رُوح ہوتی ہے جس کی عمر اندازاً ہزار سال ہوتی ہے۔ تاریخ بھی اس نظریے کی تصدیق کرتی ہے کہ عام طور پر بہت سی تہذیبوں نے یہی ہزار سال تک یا اس سے کچھ کم یا زیادہ، اپنے اثرات زمانے میں چھوڑے ہیں۔ افراد پیدا ہوتے ہیں اور اس دنیا میں زندگی گزارتے ہیں لیکن جو چیز چھوڑ جاتے ہیں وہ ان کی تہذیب ہے۔ اسی تہذیب کی ضمنی شکلیں اِقتصادی خوش حالی، تہذیب کی بُلندی، رہنے سہنے کا اعلیٰ معیار، طاقت و عظمت وغیرہ کے نشانات ہوتے ہیں۔ مگر حقیقت کی نظر سے دیکھا جائے تو ان میں سے نصبُ العین، یعنی اِقتصادی خوش حالی، اعلیٰ معیارِ زندگی، تہذیب، عظمت و شوکت وغیرہ سب کی سب ناپائیدار اقدار ہیں، آنی جانی چیزیں ہیں اور ان کو دوام نہیں۔ اسی لئے جن قوموں نے اپنا نصبُ العین ان ہیں ظاہری اور جھوٹی چمک والی اقدار کو بنالیا وہ ختم ہو گئیں۔ ان اقدار کو اپنا نصب العین بنالینا خود ہی ان قوموں کی تباہی کے لئے کافی تھا کیونکہ نہ مال و دولت، نہ قُوت و عظمت، نہ فنونِ لطیفہ و ادب، کسی قوم کی سربلندی، اِرتقاء اور دوام کے ضامن ہوسکتے تھے۔ ظاہر کے اس قسم کے تمام عروجوں کا نتیجہ یہی ہوتا رہا کہ باطن، جس کو دوام ہے اور بھی کمزور ہوتا چلا گیا اور ان قوموں کی قوتِ حیات اور ناپائیدار ہوتی چلی گئی۔ فنونِ لطیفہ، ادب، فلسفہ، بذاتِ خود کسی قوم کی بنیادی صفات مضبوط نہیں کرتے۔ نہ اس تہذیب کی نشاندہی کرتے ہیں، نہ اس کو حیات کی ضمانت دیتے ہیں، البتہ ان کے ذریعے اس قوم کا نظریہ معلوم ہوسکتا ہے۔ اور اس دنیا میں اس قوم کے حصُول، کامیابیوں اور ناکامیوں کا اندازہ لگایا جاسکا ہے۔

انسانی جسم کے اِرتقاء کو دیکھا جائے تو یہ اندازہ کرلینا مشکل نہیں کہ جسمانی طور پر انسان کمزور سے کمزور تر ہوتا چلا جارہا ہے۔ مگر اس کے ذہن اور عقل کی قوت لگاتار بڑھتی چلی جارہی ہے۔ انسانی ذہن کے اِرتقائی عروج کے صلے میں یہ ضرور ہوا ہے کہ صدیوں کی کشمکش کے بعد انسان نے

اجتماعی عمل اور مل جل کر کام کرنے کی قدر و قیمت جان لی ہے۔ آثارِ قدیمہ کے محققین ہمیں بتاتے ہیں کہ تقریباً پچاس ہزار سال قبل پہلا معاشرتی گروہ وجود میں آیا۔ اس وقت تک انسان نے تنہائی اور چھوٹے گروہ کی کمزوری کا اندازہ کر لیا تھا۔ اسے یہ بھی اندازہ ہو گیا تھا کہ تسلسل حیات کے لئے خاندان اور قبیلے ضروری ہیں۔ اس کے بعد انسان نے اجتماعی زندگی گزارنا اپنے لئے مفید سمجھا۔ اور گاؤں اور شہروں نے اس طرح جنم لیا۔ انسانی ذہن کی اسی اِرتقائی ترقی کا اصل سبب دیکھیں تو اس کی بنیادی وجہ اپنی حفاظت اور اپنی نسل کی بقا کا شعور تھا جس نے جمعیت کی طرف اس کا قدم اٹھایا۔ افراد کو فنا تھی مگر جمعیت کو بقا۔

حیاتِ انسانی کی بقاء کو دیکھا جائے تو اس کے دو پہلو ہیں' ایک منفی اور ایک مُثبت۔ منفی پہلو یہ ہے کہ قدرت کی تباہ کرنے والی قوتوں کے مقابلے میں بقاء کی تلاش ہے۔ اس میں بھوک' بیماری' خطرات' ناگہانی حادثات' قحط' سیلاب' طوفان' موسم' آتش فشاں پہاڑوں کا پھٹنا وغیرہ ہیں جن سے انسان کو مقابلہ کرنا ہے۔ صدیوں کی پیہم کوشش سے اب کہیں انسان تہذیب کی ترقی کے اس مقام پر آیا ہے کہ بقاء کے ان منفی پہلوئوں سے اس نے نجات پالی ہے۔ لیکن صرف اطمینان اور سکون کی زندگی گزار لینا انسان کا نصبُ العین نہیں ہو سکتا۔ جب سکون اور اطمینان آگیا تو پھر اس کے بعد کیا؟ یہ تو جمود کی کیفیت ہے اور فطرت میں جمود کے معنی موت ہیں۔ زندگی تو جدوجہد اور کوشش پیہم میں ہے۔ یہ جدوجہد اور کوشش پیہم ہی بقا کی ضامن ہو سکتی ہے۔ جب مطمئن ہی ہو گئے تو اِرتقاء ختم ہوا۔ نتیجہ میں دیکھیں تو جفاکشی ختم اور اس کی جگہ مُنفعت طلبی نے لے لی۔ عیش و عشرت' آرام طلبی' نفسا نفسی' خود غرضی اور انفرادی منفعت طلبی نے پھر اس جگہ لا ڈالا کہ تہذیب کی تمام روشنیاں ہوتے ہوئے انسان ان ہی تاریکی کے غاروں میں رہا۔ تاریخ انسانی میں یہی کچھ ہوتا رہا ہے کہ جہاں ظاہری تہذیب و تمدن عروج پر پہنچے اندر سے پاکیزہ اخلاق' اوصاف حمیدہ' اور زندگی کے اعلیٰ اقدار' غیرت' حمیّت' شُجاعت' سخاوت' دیانت' امانت' خدمت' مروّت' محبّت' رحمت' وغیرہ غائب ہوتی چلی گئیں اور نتیجۃً اس قوم کو زوال ہوا۔

ظاہری تہذیب' علم و دانش اور تمدن کے اس دور میں ہمیں تاریخ سے سبق لینا ہے اور اسی لے ظاہر کے علاوہ باطن پر بھی نظر رکھنی ہے تاکہ یہ مقصد واضح ہو سکے کہ انسان محض جانوروں سے زیادہ آرام اور سکون کی زندگی گزارنے کے لئے اس دنیا میں نہیں آیا بلکہ اس کی پیدائش کا مقصد کچھ اور بھی ہے۔ مقصد واضح ہونے کے بعد ہی انسان یہ معلوم کر سکے گا کہ کہاں تک وہ اس کے حصول کے لئے زندگی گزار رہا ہے۔ آخر اس دنیا میں اس کا نصبُ العین کیا ہونا ہے؟

مقصد تخلیق کی تلاش ہی میں انسان حقیقت کی طرف رجوع ہوا اور زمانوں کی مطابقت سے مذاہب میں آئے۔ تمام مذاہب پر ایک عبوری نظر ڈالی جائے تو معلوم ہو گا کہ زمانے کے مطابق مذہب کا بھی حیاتِ انسانی میں اِرتقاء ہوتا رہا۔ دین وہی ایک تھا جسے دین فطرت کہیں۔ یہ تلاشِ حقیقت انسان کی فطرت میں ودیعت تھی۔ یہ تجسس کا جذبہ پیدائشی طور پر انسان کی بچپن کی زندگی سے لے کر بڑھاپے تک اس کے ساتھ رہا۔ اسی جذبے کے تحت اس نے اشیاء کی تلاش کی' ہر چیز کو جاننا چاہا' پھر جوانی میں اسی تلاش نے ساتھی کی تلاش کا رخ اختیار کیا مگر اس سے بھی اس فطری انسانی تڑپ کو سیری حاصل نہ ہو سکی کیونکہ اصل تو اس تلاش کی وہی حقیقت کی تلاش تھی۔ بالآخر اپنی حقیقت کی تلاش اور اپنے مقصد تخلیق کے معلوم کرنے کی فکر نے مذہب کی صورت اختیار کی۔ انسانی ذہن و عقل اور علم و دانش کی عام سطح کے مطابق مذاہب عالم انسان کی رہنمائی کرتے رہے۔ تمام

ابتدائی مذاہب حتیٰ کے حضرت موسیٰؑ کے زمانے تک ممنوعات کی طرف زیادہ رجوع تھا کہ یہ نہ کرو، وہ نہ کرو۔ یہ ایک منفی انداز تھا۔ جس کی زمانے کے لحاظ سے ضرورت تھی۔ البتہ جیسے جیسے انسان کا باطن بھی لاکی یہ منازل طے کرتا رہا تو اس کے بعد باطنی ترقی کی طرف مُثبت دونوں کی میزان تھی کہ یہ نہ کرو اور وہ کرو بُرائی سے روکو اور بھلائی کی طرف بلائو۔ یہ نَھِی عَنِ الْمُنْکَرْ وَاَمَرْ بِالْمَعْرُوف کا انداز تھا اور مختصراً اس کا بیان اور اس کی طرف ہدایت کلمہء لَااِلٰہَ اِلَّااللہ میں تھی جس میں ساری منفی صفاتِ انسانی کی لا تھی اور مثبت صفات کی طرف پیش قدمی کی انسان کو دعوت تھی۔ یہ کلمہ خالی پڑھ لینا نہ تھا بلکہ اپنی زندگیوں کو اس کلمہ کی تفسیر اور اس کا عملی پہلو کر کے دکھانا تھا۔ اس کے بعد رحمت اللّعالمینی انداز مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللہِ آنا تھا۔ منزل بہ منزل انسانیت کے لئے یہ باطنی راہ کی نشان دہی تھی۔ ارتقائے باطن کے خزانہ کی کُنجی تھی۔

اِرتقائے ظاہر اور نصبُ العین

ارتقائے ظاہر کے سلسلہ میں فلسفہء جُہد للبقاء اور اِرتقاء کا دانشور ڈارون دائمی اقدار کے نقطہ نگاہ سے کہتا ہے کہ ''نسل انسانی کے لئے ذہن انسانی اور انسانیّت کے لئے ذہن انسانی کا ماحول کے مطابق تبدیلی پذیر ہوتے رہنا سب سے بڑی دولت ہے کیونکہ ان چیزوں کو بقا ہے جن کی قدر و قیمت ہمیشہ اور ہر زمانہ کے لئے ہو'' فلسفہ پر مذہب کو یہی برتری حاصل ہے کہ مذہب نے انسان کو وہ نصبُ العین عطا کیا جو ہمیشہ ہمیشہ رہنے والا تھا۔ فلسفے اور چند مذاہب تک کے آئیڈیل اتنے تخیلی تھے کہ ان پر عمل درآمد کرنا ممکن نہ تھا، نہ ہر انسان کے بس کی بات تھی۔ ان میں سے بہت سے نظریے قابل تعریف بھی تھے جیسا کہ عیسائیت کی عاجزی، مسکینی اور دنیا سے کنارہ کشی کا تخیل۔ مگر اس کی منزل رہبانیت ہو کر رہ گئی۔ دوسرے مذاہب میں کچھ ایسے بھی تھے کہ ان میں ظاہری سختی اور جمود اس حد تک تھا کہ ان میں سے اِرتقاء کی راہ ڈھونڈنی مشکل تھی۔ زمانہ اور ماحول کے مطابق تبدیل پذیر ہو جانے کی نہ ان میں گنجائش تھی نہ صلاحیت۔ اور یہ دُرست بھی تھا کیونکہ ایسے نظریے اور مذاہب ایک مخصوص زمانہ میں آئے تھے۔ آنے والی نسلوں کے لئے نہ یہ پیغامات تھے، نہ ان کا دائرہ عمل عالم انسانی کو ہونا تھا۔ منزل بہ منزل پیغامات کی وضع قطع میں تبدیلی ہوتی رہی اور مذہب اپنی اِرتقائی منازل کی طرف بڑھتا رہا۔ ان مذاہب کے لئے زمانہ کے مطابق تبدیلی پذیر ہو جانے کا سوال ہی نہ تھا اور نہ دائمی اقدار کا۔ اس لئے کہ بعد میں آنے والے زمانے میں تو دین کی تکمیل ہو جانی تھی۔ جو چیز انسانی زندگی کی شیر خوارگی، بچپن اور لڑکپن کے لئے دائمی ضروری تھی وہ اس کی جوانی اور بعد کی زندگی کے لئے تیاری تو ہو سکتی تھی مگر شمع ہدایت نہ بن سکتی تھی۔

اب موجودہ زمانہ تک نسل انسانی اپنی ظاہری باطن کی اس سطح تک یقیناً صدیوں سے پہنچ چکی ہے کہ کسی قوم کی بڑائی کا اندازہ اس کے مذہب سے لگایا جا سکتا ہے۔ مذہب وہ نہیں جو اس قوم کی کتابوں میں ہے بلکہ وہ مذہب جس کو وہ قوم اپنی روزمرہ زندگی کے عمل و کردار میں دکھا رہی ہے۔ محض ایک ذہنی یقین یا ایمان کسی نصبُ العین میں، اس بات کا ثبوت نہیں ہے کہ کوئی شخص یا قوم اس آئیڈیل کے مطابق زندگی گزار رہی ہے۔ کیونکہ جب تک افراد میں یہ آئیڈیل پیوست نہ ہو جائے کسی قوم کو وہ گہرائی نہیں مل سکتی جسے مذہب، یقین یا ایمان کہا جا سکے۔ بظاہر مذہب کے نام لیوائوں کا حال دیکھیں تو یہ بات صاف نظر آنے لگے گی کہ قوم کا باطنی تنزل اسی دن سے شروع ہو جاتا ہے جب وہ ظاہر پرستی میں مبتلا ہو کر اپنے نصبُ العین سے کج روی اختیار کر لیتی ہے اور جن کا اظہار اس کی روزمرہ کی زندگی سے ہو رہا ہوتا ہے۔ ایسے افراد اور ایسے مذاہب اور اقوام کا حال یہ ہوتا ہے کہ ان کا

ذہن کسی رخ کام کر رہا ہوتا ہے اور یقین اور ایمان کسی رخ۔ حالانکہ ذہن اور یقین کی میزان ہی اس کی دائمی حیات اور پائدار اقدار کی ضامن ہو سکتی تھی۔ اب یہ تو ظاہر ہے کہ انسانی ارتقاء کے مطابق نصبُ العین بدلتے رہتے ہیں۔ اس لئے وہ کون سے اصول اور کون سی میزان ہے جس کے ذریعے ہم کسی نصبُ العین کا اندازہ لگا سکتے ہیں کہ وہ قائم رہنے والی قدروں پر مبنی ہے یا نہیں؟ علامہ اقبالؒ نے نکتہ رسی کی ہے کہ اس موڑ پر انسان کو اِرتقاء کی لازمی ضرورت ماننی پڑتی ہے اور نصبُ العین کے جاوداں ہونے کے لئے یہ دیکھنا پڑتا ہے کہ کوئی نظریہء حیات جو القاء ہوتا ہے اس کی رگیں چشمہء حیاتِ انسانی کے سوتوں میں ہیں یا نہیں۔ دائم قائم قدر و قیمت والی اقدار اور اصولوں کی فطرتِ انسانی سے مطابقت ضروری ہے کیونکہ افراد اور قومیں آتی ہیں' زندگی گزارتی ہیں اور فنا ہو جاتی ہیں مگر حیاتِ انسانی کو تو پائیداری ہے۔ حیاتِ انسانی تو جاری و ساری ہے۔

جن نظریوں کا رخ حیاتِ انسانی کے فروغ' اِرتقاء اور عروج کی طرف ہے انہیں دوام ہے' بقا ہے۔ اسلام فروغ انسانیت کے لئے پیام بن کر آیا ہے۔ اسلام کی تعلیم مخصوص جماعتوں' قوموں یا محدود زمانے کے لئے نہیں ہے بلکہ تمام عالم کے لئے ہے اور پیام کی تکمیل ہو چکی ہے۔ اسی ہدایت اور روشنی کو پا کر قومیں انسانیت کی عروج کی ضامن بنتی چلی جائیں گی۔ اسلام صرف موجودہ مسلمانوں کی میراث نہیں بلکہ عالم انسانی کے لئے پیامِ رحمت ہے۔ یہ ان لوگوں کے لئے پیامِ رحمت ہے جو اس کے اصولوں پر کاربند ہوں گے' جو اسلام کے دائرہ عمل کو اپنی روزمرہ زندگی میں عمل پیرا ہو کر مان رہے ہوں گے۔ اسلام کے اصولوں کو اچھی طرح فکر و عمل میں پرکھنے کے بعد' مغربی فلسفہ' مفکرین و سائنس دان اور دیانت سے سوچنے والے یہی کہتے ہیں کہ اسلام ہی دائم قائم رہنے والا مذہب ہے اس لئے کہ فطرتِ انسانی کے مطابق ہے۔ اس میں لچک ہے۔ ماحول کے مطابق ساز گار ہونے کی صلاحیت ہے۔ اور تخیل کی بلندی کے باوجود قابل عمل بھی ہے۔ اسلام وہ ہدایت ہے کہ انسانی اِرتقاء اور ترقی کے ساتھ ساتھ اس میں تا ابد دائم قائم رہنے کی صلاحیت ہے۔ اسلام ہی وہ نظریہ ہے کہ انسان کے اندر حیوان کو بھی نظر انداز نہیں کرتا اور ان ملکوتی صفات کو بھی جو انسان میں ہیں کچھ اس طرح عمل پیرا کرانا چاہتا ہے کہ تخیل عرش پر ہو مگر پائوں زمین پر ہوں۔ زندگی حقیقت بینی پر مبنی ہو۔ اسلام کے نزدیک انسان کی انفرادی ترقی' جسمانی' اخلاق' روحانی' سب کی سب دوسرے نمبر پر ہیں۔ تمام عالم انسانی کے ارتقاء اور ترقی کے مقابلے میں اسلام کے اصول ایسے ہمہ گیر ہیں کہ نہ مذہب و نسل کی تفریق ہے نہ کالے گورے کی۔ آج ہی کیا' آنے والے زمانے میں اور ابد الاباد تک وہی گروہِ انسانی ترقی پذیر ہوں گے جو سب سے زیادہ عین اسلام کے مطابق زندگی گزار رہے ہوں گے خواہ ظاہر اطور پر وہ اپنے آپ کو کسی اور مذہب یا کسی اور نظریے سے منسوب کر رہے ہوں اور اپنی ترقی کو خواہ کسی مذہب یا تہذیب سے وابستہ کر رہے ہوں یا کسی فرد کی تعلیمات کو اپنے فروغ کا سبب بتا رہے ہوں۔

آج ایسے سارے دانشوروں اور قائدین کی تعلیمات کا تجزیہ کیا جائے تو صاف نظر آجائے گا کہ یہی تو وہ اصول تھے جو تیرہ سو سال پہلے اسلام نے پیش کئے تھے۔ اور یہ سب کچھ تو اسلام کی کُلی تعلیمات کا صرف ایک حقیر سا حِصہ ہیں جن کا تعلق انسان کی روزمرہ زندگی سے ہے۔ اسلام کی ظاہری تعلیمات کو ہی ان کے اصلی رنگ یعنی سپرٹ میں اپنا کر آج غیر قومیں فائدہ اٹھا رہی ہیں اور اسلام کے نام لیوا صرف ظاہر داری اور ارکانِ دین کو اسلام سمجھ بیٹھے ہیں حالانکہ ارکانِ دین کے پیچھے اصل تعلیم جمعیت بندی اور اجتماعی فلاحی زندگی گزارنے کے لئے تھی۔ پھر اسلام کے باطنی اسباب پر کِس کِس کی نظر ہے۔ یہی تو مولا اور بندے کا رشتہ اُستوار ہونا تھا۔ مقصدِ تخلیق کو پورا کرنے کے لئے پہلا قدم اٹھانا تھا اور کچھ اس انداز سے کہ اُدھر اللہ

سے واصل، ادھر مخلوق میں شامل۔ دین اسلام تو کھرا کھوٹا پرکھنے کے لئے ایک کسوٹی ہے۔ جیسے جیسے عقل انسانی پچھلے بُغض، عناد اور زہر افشانیوں سے خالی ہو کر اپنے حُسن و خوبی کو دیکھے گی اس کی پہلے سے ہی نشان دہی اسلام میں پائے گی۔ پھر کہیں اس آئین فطرت کو اپنے حُسن و قبح کا جائزہ لینے کے لئے آئینہ بنائے گی۔ اور کیسا انسانی حُسن اور قبح۔ وہ وقت بھی آجائے گا کہ ذاتِ باری کے جلال و جمال کی تجلیاں اپنے ہی پیکر میں کائناتِ عالم دیکھ سکے کہ خود شیر خدا بن کر اس کے جلال کو دکھا سکے اور خود مشکل کُشائی کر کے اس کے جمال کا پیکر بن سکے۔

نسلِ انسانی کی بقاء

فطرتِ انسانی یہ ہے کہ فرد کو فنا ہے اور نسل کو بقاء ہے۔ نسل انسانی کی بقاء کی ضامن جمعیت بندی ہے۔ نسل انسانی کی حیات کی آسانی، ضمانت اور فروغ کے لئے جمعیت بندی ہے ایک دوسرے سے مل جل کر رہنا سہنا، ایک دوسرے کے کام آنا، لین دین میں حقوق العباد کی نگہداشت کرنا، اور معاشرتی اصولوں کے تحت زندگی گزارنا جمعیت کی بقاء کے سامان ہیں۔ ہمدردی، حُسنِ اخلاق، بے لوث خدمت، مُروّت، محبّت، رحمت وغیرہ مثبت اندازِ زندگی ہیں۔ ان پائدار اقدار کو دوام ہے۔ گویا دوسرے معنی میں فرد کی زندگی جمعیت کی زندگی کے لئے ہے۔ ارتقاء انسانیت اور فروغِ جمعیت ایک مسلمان کا نظریہ ہے۔ اس نظریے میں پائیداری ہے، فروغِ انسانیت ہی فروغِ اسلام میں وسیعُ النظری ہے۔ یہ قوم، نسل، رنگ، تہذیب، اور معاشرتی اصولوں کو یک رُخی عطا کرتا ہے، خدا تک رسائی کا ذریعہ بھی مخلوق تک رسائی کو قرار دیتا ہے، عین دین گردانتا ہے۔ ظاہر و باطن کی یہ یک رخی کو دوسرا کون سا مذہب نظریہ یا آئیڈیل بخشتا ہے؟ قومی عروج کو کسی نہ کسی خطہ تک محدود رکھتا ہے نہ کسی نسل تک بلکہ آغوشِ رحمت میں ساری انسانیت کو لے کر ایک ہی قوم گردانتا ہے۔ قومی نظریہ کی یہ بلندی اور قوم کے تخیل کا یہ عروج نہ کسی مذہب نے پیش کیا اور نہ کسی انسان نے جس کے ماننے والی قوم کے تصور میں یہ ہمہ گیری ہے وہ مذہب، مذہب عالم کیونکر نہ ہو گا۔ اس کا نصبُ العین دائم قائم کیونکر نہ ہو گا؟ انسانی عروج اور اِرتقا کی ظاہری باطنی منازل اسی کی دسترس میں ہوں گی۔ یہی مذہب حق کے اس جذبہء محبت کی آئینہ داری کر رہا ہو گا جو اسے اپنی مخلوق سے ہے۔ یہی مذہب حق کے اس جذبہء محبت کی آئینہ داری کر رہا ہو گا جو اسے اپنی مخلوق سے ہے۔ یہی مذہب مقصد تخلیق کی تکمیل کی طرف انسانیت کو لے جا رہا ہو گا۔ یہاں تک کہ ذرہ ذرہ حق کی طرف رجوع ہو جائے گا، اِلاّ لِیَعبُدُونَ کا پیکر بن جائے۔ باغ ہستی میں اس اَحسَنُ التَّقوِیم کی ہستی و حیات کی مُسرتوں، شادکامیوں، ولولہ انگیزیوں، عشق کی سرمستیوں میں میثاق ازل کا وہ نمونہ پیش کر سکے کہ احسنُ الخالقین بھی کہہ اٹھے کُنتُم خَیرَ اُمَّۃٍ اُخرِجَت لِلنَّاسO

بادیء النظر میں قوموں کی زندگی میں بات اصولوں کی ہے تمام مذاہب والے اپنے اپنے اصولوں پر نازاں ہیں مگر کوئی بھی عمدہ اصول فطرت انسانی سے جُدا نہیں اور اسلام سے باہر نہیں۔ فرمان باری ہے کہ اس دنیا میں جو بھی نیکی کرے گا اس کے لئے اجر ہے، خواہ ایمان لائے یا نہ لائے۔ مگر کلمہ گو کے لئے دونوں جہان کی خیر و برکت ہے مرد مومن کلمہ کو اپنا کر، مشیت کا ہاتھ بن کر، مقصد آفرینش کو پورا کرتا ہے۔ مقصد آفرینش میں عشق ہی دائم و قائم ہے۔ کشش، محبّت، ایمان، عشق ہی اجزائے بندگی ہیں۔ جو چیز ساری کائنات میں خوبی اور حُسن پیدا کئے ہوئے ہے وہ کشش چیز عشق ہی ہے۔ جمادات میں پُرکشش ہے تو جانداروں میں محبت عشق و ایمان کی رعنائی کو نور کہتے ہیں۔ یہی نورِ محمدیؐ ہے۔ یہی فطرت کے ساتھ ہم آہنگی ہے اور یہی دائم و قائم ہے۔ اب ہم اپنا جائزہ لیں کہ کونسی چیز ہم میں دائم قائم رہے گی۔ جسم، دولت، عزت؟ اس سوال کا جواب، بغیر اپنے آپ کو دھوکا

دیے اگر خلوص سے اپنے دل میں تلاش کرو تو عشق پائو گے۔ اسی کو خواہ ایمان کہہ لو' بھروسہ کہہ لو یا اعتماد شخصیت کہہ لو۔ آج اپنے دلوں کی گہرائیوں میں ہم دیکھیں تو حرمت اسلام اور ناموسِ رسولؐ تو ہم میں موجود ہے۔ اسلام کے پیام کے جاوداں ہونے پر بھی ہمیں اعتقاد ہے۔ مذہب کے ناموس کی خاطر ہم جان دینا بھی جانتے ہیں' عشق نبیؐ کی آگ بھی سینوں میں دبی رکھتے ہیں جو وقتاً فوقتاً بھڑک بھی اٹھتی ہے مگر اس کی کیا وجہ ہے کہ اس کو قیام نہیں ہوتا اور عمل پیہم کے لئے قدم نہیں اٹھتے؟ مسلسل عمل پیہم سے آخر یہ قوم کیوں ناآشنا رہی ہے اور زمانہ میں اس کی حالت کیوں اب تک ابتر ہے؟ دنیا کے دوسرے لوگ بھی اس پیام کی خوبی کو صرف اسی وقت دیکھ سکیں گے جب اس کی عملی تفسیر مسلمانوں کی زندگیوں میں دیکھ لیں گے۔ اسلام کی خوبیاں اس کے پیرویان کے حسن ظاہر و باطن ہی سے نمایاں ہو سکتی ہیں نہ کہ صرف ارکان دین کی پیروی کو دکھا کر۔

اسلام' مکمل ضابطہء حیات

اسلام ایک مکمل ضابطہء حیات ہے جس کی بنیاد پانچ ارکان پر ہے۔ توحید' نماز' روزہ' زکوۃ' حج۔ جہاں باقی ارکان کی عملی صورتیں ہیں وہاں توحید کی بھی عملی صورت اپنی زندگیوں میں آنے دو۔ کلمہ' وحدانیت پر یقین و نبی کی رسالت کی تصدیق کو اپنی زندگی کا شعار بنالو' جزو ایمان بنالو' محرک قوتِ عمل بنالو۔ یہ محض ذہنی اقرار کی بات نہیں ہے' یہ بھروسے اور عشق و ایمان کی بات ہے۔ اس قوت کو اپنے اندر محسوس کرو۔ محسوس کرو اور شدت سے محسوس کرو۔ نبیؐ کی رسالت کی تصدیق' نبی کے کلمہ کی اور وحدانیت پر یقین کو ایک ہی چیز بتایا گیا ہے۔ یہ عشق نبیؐ ہی کی بات ہے اور اسی میزان میں اپنی توحید کا اندازہ لگائو۔ بغیر نسبت محمدیؐ اور بغیر عشق رسولؐ کے یہ نصب نہیں ہو سکتی۔ یہ عشق' یہ ایمان' یہ بھروسہ' یہ قوتِ عمل بغیر اس تعلق کے قائم نہیں ہو سکتا۔ اسی عشق و محبت و ایمان و بھروسے کی روشنی ہی میں تمہاری باطنی صلاحیتیں اُجاگر ہو سکتی ہیں اور کاروبارِ جہاں میں بھی تمہیں عمل پیرا ہونے کے لئے تقویت دے سکتی ہیں۔ یہ فطری' باطنی صلاحیتیں ہی تمہارے اندر سے حقیقت کی رُونمائی کرتی ہیں۔ فِیْ اَنْفُسِکُمْ یہی بات ہے۔ یہ فطری صلاحیتیں قدرتی طور پر ہر ایک بچے میں اپنی تمام حُسن و خوبی کے ساتھ موجود ہوتی ہیں۔ تب ہی اس کا ظاہر و باطن ایک توحید میں ہوتا ہے' یعنی جو اندر ہے وہی باہر' نہ کوئی منافقت نہ کوئی شرک اور نہ کوئی فساد۔ توحید کی اسی فطری سادگی کی رُونمائی اپنے ظاہر و باطن کے توحید عمل میں ہونے دو۔ اپنی ساری صلاحیتوں کو اور ظاہر و باطن کی سب قوتوں کو ایک ہی رخ پر سرگرم عمل ہونے دو۔ عاشق میں فطری طور پر بچے کی طرح توحید ہوتی ہے۔ اس کی ساری صلاحیتیں محبوبؐ کی خاطر ایک ہی رخ ہو جاتی ہیں۔ ایک مجاہد میں اس یک رخی' اس فریفتگی اور اس والہانہ عشق کا نظارہ کرو۔ کس طرح وہ محبوبؐ کے نام کی حُرمت کے لئے میدان میں نکل آتا ہے۔ اس وقت نہ اسے دنیا کی طلب ہوتی ہے نہ آخرت کی۔ بس محبوبؐ پر فدا ہو جانا ہی اس کا ایمان ہوتا ہے۔ یہی جذبہ اسے ہر آہنی دیوار کو توڑ دینے کی ہمت و وُسعت عطا کرتا ہے۔ ساری کی ساری جمعیت' ساری کی ساری عالم انسانیت کو وہ محبوبؐ کے لئے اسی اندازِ توحید فکر میں رخ بخشتا ہے۔ پہلے اس میں اپنے اندر باہر کی توحید فکر و نظر ہوتی ہے۔ وہ یہی توحید فکر و نظر و عمل اپنے اردگرد کے ماحول کو بخشتا ہے۔ پھر جمعیت اور عالم اس کی دسترس میں ہوتے ہیں۔ توحید سے جمادات' نباتات' حیوانات' ملائک و انسان میں سے کوئی بھی خالی نہیں ہے۔ بات صرف اپنی اپنی سطح کی ہے۔ انسان کو شرفِ فضیلت بخشا گیا اور خلیفۃ اللہ کے خطاب سے نوازا گیا۔ تب ہی تو خواہ بچہ ہو یا مجاہد' خواہ زاہد یا صوفی' جس جس نے بھی اپنی توحید کو پالیا وہ پھیلتا ہی گیا' پھیلتا ہی گیا اس توحید کی وُسعتیں تو بے حد و بے پایاں ہیں وَسِعَ کُرْسِیُّہُ السَّمٰوٰتِ وَالاَرْض۔

اسلام کی ان وسعتوں پر نظر رکھی جائے تو یہ معلوم ہو گا کہ اسلام ایک مکمل ضابطہء حیات ہے۔ اور اصل حیات وہی ہے جسے دوام ہو' قیام ہو۔ اس ضابطہء حیات کا دینوی زندگی سے تعلق بھی ہے جو ساٹھ ستر سال تک ہے مگر یہ آخرت کی پونجی بھی بتائی گئی ہے۔ اس صورت میں ارکانِ دین کی بے دِلی سے ادائیگی یا رسمی خانہ پُری کی تو کوئی گنجائش ہی نہیں رہتی۔ بلکہ ایک شدّتِ عمل' ایک والہانہ جذبے کے تحت یہ سب کچھ کرنا ہے۔ اور اپنی ذات کے لئے نہیں بلکہ ہر عمل میں صرف جمعیت کا تخیل ہی نہیں بلکہ جمعیت کی فلاح کا عملی پہلو ہی صرف پیش نظر رکھنا ہے کیونکہ ضابطہء حیات تو ضابطہء جمعیت کی بات ہے اور اس کا تعلق انسانی زندگی کے معاشرتی' معاشی' اخلاقی' اقتصادی' مذہبی اور دفاعی' سب ہی پہلوئوں سے ہے۔ لہٰذا تمام ارکانِ دین توحید' روزہ' نماز' زکواۃ' حج' سب کے سب جمعیت بندی کو مضبوط سے مضبوط تر کرنے کے لئے ہیں۔ اگر ایسا نہیں ہو رہا تو ہمارے ایمان میں فرق ہے' ہماری توحید میں کھوٹ ہے۔ لہٰذا یہ اصولی خرابی ہمارے اپنے تخیل میں ہے جو ہم نے ارکانِ دین کی بابت اپنی طرف سے تجویز کر رکھے ہیں۔ اور یقیناً یہ بات ہے کہ ہم نے ان سب میں صرف انفرادی پہلو پر زور دے کر اپنی اپنی عاقبت بخیر کرنے کی فکر کی ہے۔ ان ارکان کے ذریعے جس چیز کو مضبوط کرنا تھا وہ جمعیت بندی تھی' ایمان تھا۔ اس کو تو بھلا دیا اور صرف ارکان کی پابندی کو جزو دین بنا لیا ہے' دین تو جمعیت بندی کی بات تھی۔ اور یہ ارکان تو صرف بنیاد تھے جن پر دین کی عمارت کھڑی ہونی تھی۔ جمعیّت کو دنیوی اور آخرت کی زندگی کے ہر پہلو پر اسی جماعت بندی کے ذریعے فروغ دینا تھا۔ ایک دین میں ہونے کے معنی یہ تھے کہ زندگی میں جمعیت کے اندازِ فکر کو اپنانا تھا۔ جمعیت ہی کو حیات ہے اور جمعیت کو دوام۔ فرد کو تو بالآخر فنا ہونا ہی ہے۔ البتہ اپنے صِدق' خلوص اور خدمت کا صلہ آخرت میں دامن شفاعت میں پانا ہے۔ محبوبؐ کے سامنے سُرخرو ہو کر پہنچنا ہی ہر مومن کا مطمح نظر ہے' تاکہ دُنیا کی زندگی بھی سب کی سب ساتھ ہو اور آخرت بھی سب کی سب ساتھ۔ یہ آدھا آدھا دین کیا جس میں کالے' گورے اور اپنے' غیر کی تمیز باقی رہے۔ لاکھ عبادت کر لو' لاکھ ارکانِ دین ادا کر لو' اگر یہ دُوئی باقی ہے تو توحید کہاں؟ دین و ایمان کہاں؟ کیسا مومن! مسلمانی بھی کہاں؟ اس سے آج مسلمان اپنے آپ کو دیکھ لیں تو سوائے ظاہر و باطن کی منافقت کے اپنے اندر کیا پائیں گے۔ کیسا مقامِ روح و ملائک کی باتیں' کیسی قلب و عشق کی وارداتیں' ابھی تو ہر طرف جمعیت مقام نفس میں ہی گرفتار ہے۔ مادی اور جسمانی' ذہنی اور ہوا و ہوس کی سطح سے ہی نہیں اُٹھی۔ اسی سطح سے اس کی اصلاح کی ضرورت ہے۔ اسلام کے فلاحی' اخلاقی پہلو کو عوام کی روزمرہ زندگیوں سے منسلک کرانا ہے۔ عوام سے رابطہ کے لئے اوچھے ہتھیار استعمال نہیں کرنے کہ انہیں استحصال اور ناانصافیوں کا احساس دلا کر درندہ صفت بنا دیا جائے۔ انہیں مجرم و قاتل بنا دیا جائے۔ یا تعلیماتِ اسلام کی وضاحت اور وعظ و پند و نصائح سے صرف وقتی طور پر انہیں قائل کر لیا جائے۔ اور عملی زندگی کی طرف کوئی لائحہ عمل نہ پیش کیا جائے' نہ کوئی نصبُ العین مقرر کیا جائے۔

سالارِ زماں کی اِحتیاج

وقت تیزی سے گزر رہا ہے۔ زمانہ کہاں سے کہاں جا رہا ہے۔ اب اس کا بھی تو وقت نہیں ہے کہ صرف منفی پہلوئوں پر زور ڈال کر قوم کو برائیوں کے دُور کرنے' سمجھنے اور غور و فکر میں لگا دیا جائے۔ یہ کام تو مصلحین نے برسوں سے کیا ہے اور بہت کم اصلاح ہو سکی ہے۔ خرابیوں کو گنا جائے تو سینکڑوں یا ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں ہیں۔ کس کس کا تدارک ہو سکے گا۔ اور اس کے لئے تو ایک انسانی زندگی جو زیادہ سے زیادہ ساٹھ ستر سال ہو سکتی

ہے ناکافی ہے۔ اس طرح تو قوموں کی زندگیاں سُدھارنے کے لئے صدیاں چاہیں۔ اس وقت جب کہ مریض جاں بلب ہے وقت کا تقاضا یہ ہے کہ صحت کے اصول بتائے جانے کی بجائے کوئی علاج تجویز کیا جائے۔ اس وقت مثبت اقدامات کی ضرورت ہے۔ منفی پہلو خود بخود غائب ہونے لگیں گے۔ حرمت اسلام اور ناموسِ رسولؐ کا جذبہ قوم کے دل کی گہرائیوں میں ہے۔ اسے یہ بھی معلوم ہے کہ اسلام کی خاطر مرمٹنا ہزار عبادتوں سے بہتر ہے جو صرف اپنی عاقبت کی خاطر ہوں۔ رہنما کی تلاش میں اس کی آنکھیں ہمیشہ سے راہ تکتی ہیں اور اصولِ فطرت بھی یہی ہے کہ لاکھ اصول موجود ہوں' اسلام کے قوانین موجود ہوں' پیام کی خوبیاں موجود ہوں اور اس پیام میں اپنی فطری سادگی کے باعث دعوتِ فلاح و عمل بھی ہو' تب بھی جانِ اسلام کی طرف رجوع کرانے کے لئے ایک رہبر کی ضرورت ہوتی ہے تب ہی تو تاریخ انسانی میں ہادیانِ دین آئے اور قوموں کی زندگیوں میں ایسے افراد آتے رہے جو انہیں ایک نصبُ العین عطا کر کے معروف عمل کراتے رہے۔ آج بھی اسلام کے اخلاقی پہلوئوں اور روزمرہ زندگی سے متعلق اصولوں پر کاربند کرانے کے لئے ایسے لیڈر کی ضرورت ہے جو فیصلہ کر سکے کہ اوّل کن کن اقدامات کی ضرورت ہے۔ یہ تو فیصلہ کُن بات ہے کہ عوام کا کام محض پیام رسانی سے نہیں بنتا بلکہ ساتھ چل کر راہ بتانی پڑتی ہے۔ مخلص ہو کر خلوص کا جذبہ' مجاہد ہو کر جہاد کا جذبہ' یہاں تک کہ زندگی کے ہر پہلو میں مسلسل جہاد کا جذبہ عام کرنا ہوتا ہے۔ سختی' نرمی سب کچھ اسی مقصد کے حصول کی خاطر خلوص کے تحت کرنی ہوتی ہے۔

آج عام حیاتِ انسانی میں ایک جنگل کا سا قانون چل رہا ہے۔ قوم کی زندگی یوں گزر رہی ہے جیسے مویشی' جانور' کیڑے مکوڑے' چوپائے' درندے' زندگیاں گزارتے ہیں۔ پہلے انسان کسی زمانے میں شیر صفت تھے مگر آہستہ آہستہ خود غرض اور درِندہ صفت بن گئے۔ کہیں مُردار خوری ہے' کہیں حسد' بغض' مکاری' عیاری۔ وحشت و درندگی کا یہ عالم ہے کہ کہیں پس ماندہ کھانے والے گیدڑ اور لومڑیاں ہیں' کہیں گندے اور ناپاک سور ہیں کہیں' وفا نا آشنا جنگلی کُتے ہیں' کہیں شرم و حیا سے مُبرا ریچھ اور بندر ہیں' کہیں خچر اور بھیڑ بکریاں ہیں۔ محض زندگی گزارنے والے چوپائے کہ جدھر کسی نے چاہا ہنک گئے جب کسی نے چاہا بک گئے۔ الغرض سب کے سب جنگلی ہیں۔ عاقبت نا آشنا۔ نہ اتحاد' نہ تنظیم۔ ایسے میں ایک (Grey Wolf) گرے وُولف کی ضرورت ہے' ماحول کی موجودہ حالت خود اس کی نشاندہی کر رہی ہے۔ ماحول ہی لیڈر بناتا ہے اور لیڈر ماحول ہی کی عکاسی کرتا ہے۔ آج مسلمانانِ عالم کی بقاء کے لئے کیڑے مکوڑوں کو صاف کرنا ہے۔ کھوکھلے ڈھانچوں کو ختم کرنا ہے اور مغز و معانی کی طرف نظر رکھنی ہے۔ جانِ اسلام کی طرف رجوع ہونا ہے۔ "گرے وولف" کا یہی انداز ہوتا ہے کہ اس میں شیر جیسی دھاریاں بھی ہوتی ہیں اور اس کی خاص صفت یہ بھی ہے کہ ہڈیوں تک کو چبا جاتا ہے' گودا کھاتا ہے۔ مغز ہی' یعنی اصل حقیقت سے تقویت پکڑتا ہے۔ اس کے ساتھ وولف پیک (Wolf Pack) بھی ہوتا ہے۔ آج ہم سب کو وولف پیک ہی بن جانا ہے۔ یہ عجز و انکساری کا زمانہ نہیں۔ اب بزن کا زمانہ ہے۔ پہلے بزن اپنوں پر تھا اب دُشمنانِ قوم اور دُشمنانِ اسلام پر ہے۔ ہماری قسمت میں جو گرہ لگی ہے وہ فتح سے کھلے گی۔ انشاء اللہ یہ ہو کر رہے گا۔ اسلام کی تاریخ میں ہے' مسلمانوں کے خون میں ہے کہ بغیر فتح و نصرت کے اکٹھے نہیں ہوتے۔ ہماری قوم پر یہ بات صادق آتی ہے کہ کامیابی سے زیادہ کامیاب کوئی چیز نہیں۔ مصروفِ عمل رہنا ان کا دین' اور عبادت تھی۔ ارکانِ دین کی پابندی اسی رشتہ کو مضبوط رکھنے کا ذریعہ بنی ہوئی تھی۔ اخوت اور جمعیت بندی ان کے لئے ایسے مستحکم نصبُ العین بن گئے تھے کہ زمانے کی اونچ نیچ بھی اس میں فرق نہ ڈال سکتی تھی۔ گویا فلاحی جمعیت کا نظریہ قومی زندگی کے خون میں شامل ہو چکا تھا۔ اب بھی نئی حیات کے لئے یہی کچھ ہونا ہے۔ فوری اور دُور رس پالیسیوں پر قوم کو کچھ اس طرح یقین آتا چلا جائے گا کہ وہ اپنی منزل کے حصول کے لئے ایک مقرر کردہ راہ پر اپنے

آپ کو گامزن پائے گی اور تیس چالیس سال کا انتظار بھی اسے بے صبر نہ بنائے گا۔ اس کی قسمت میں تو عالم میں پھیل جانا ہے' بس قدم اٹھانے کی دیر ہے۔ رفتہ رفتہ دشمنانِ دین کی بساط اُلٹ جائے گی۔

پانچ سو سال کی تاریخ دیکھی جائے تو ہنود و یہود و نصاریٰ نے طرح طرح سے اسلام کے اس نصبُ العین کی بیخ کنی کی ہے۔ کبھی مشقت و محنت و عملی زندگی سے ہٹا کر خشک اور بے جان طریقے سے ارکانِ دین کی ادائیگی کی طرف رجوع کر دیا۔ کبھی اہل دانش اور لیڈروں کے ذہنی تخیل میں اپنی تعلیمات سے ہیجان بپا کر کے نئی نئی راہیں تلاش کرنے میں ڈال دیا ہے۔ کبھی زَر پرستی' اقتصادیات اور معاشیات میں عوام کو الجھا دیا ہے۔ کبھی لِسانی' نسلی' علاقائی منافرت کو ہوا دی ہے۔ کبھی تعلیمات دین و وعظ پر پند و نصائح کو عمل صالح قرار دلایا ہے' حالانکہ ہر عمل صالح کی بنیاد خدمت خلق ہے' خود مصروفِ عمل ہو کر خلیفۃُ اللہ بننا۔ الغرض طرح طرح سے قوم کا شیرازہ منتشر کرایا گیا ہے۔ مرکزیت اور لیڈرشپ کا تخیل قومی زندگی سے ختم کرا دیا ہے۔ دین کی بنیاد یہی مرکزیت تو تھی۔ جب مرکز ہی نہیں تو یہ عمل اور فروغ کی ہوائیں کہاں سے اُٹھیں۔ انسان کی فطرت میں ہے کہ وہ محض ضروریات زندگی کو اپنا مقصد زندگی نہیں بناتا۔ وہ ایسے نصبُ العین کی تلاش میں ہوتا ہے جس کو دوام ہو' بقاء ہو۔ اس نصبُ العین اور مقصد زندگی پر وہ اپنا سب کچھ فدا کر دیتا ہے۔ اپنی جان تک قربان کرنے سے دریغ نہیں کرتا۔ یوں جھوٹے اور عارضی نصبُ العین تک کے حصول کے لئے انسان اپنی جان دینے سے دریغ نہیں کرتا تو وہ مقصد زندگی جو اسے سب سے زیادہ عزیز ہوتا ہے سوائے اس کے کیا ہوتا ہے کہ اپنے محبوبؐ کی خاطر جئے' اس کے لئے اپنے عمل و کردار وقف کرے اور اسی کے لئے جان تک قربان کر دے۔ یہ اور بات ہے کہ اس نے اپنا محبوبؐ کس شے' نظریہ' یا فرد کو بنا رکھا ہے۔ مسلمان کو تو خوش بختی سے پائندہ و جاوید محبوبؐ نصیب ہے۔ بس اسی کی طرف قوم کو رجوع کرانا ہے۔ یہی سالارِ زماں کا کام ہے۔ مسلمان کی اس ضد کو دیکھ کر دشمنانِ دین کی یہ کوشش رہی ہے کہ بجائے ایک مرکز کے ایسے چھوٹے چھوٹے کئی مراکز قائم کر دئے جائیں تاکہ ان سے اگر فروغ کی لہریں اٹھیں تو ایسی بے ترتیبی سے پھیلیں کہ ایک رُخ ہی اختیار نہ کر سکیں' اور آپس میں ٹکڑا ٹکڑا کر ختم ہو جائیں۔ اسی طرح قوم کو عارضی یا غلط نصبُ العین دے کر قوم کے مختلف حصوں کی راہ بھی کھوٹی ہوئی ہے۔ اور ایک دوسرے سے کھنچ گئے ہیں۔

قوم کو متحد رکھنے اور ایک جاوداں نصبُ العین دینے کی کوشش بہت سی ہستیوں نے کی ہے۔ وہ پیام جو حضرت شاہ ولی اللہؒ' اسمٰعیل شہیدؒ' سرسیدؒ' اقبالؒ' قائداعظمؒ' عبید اللہ سندھیؒ' جمال الدین افغانیؒ' اور دیگر مصلحین و مجاہدین کا تھا اسی قوم کی گھٹی میں ڈالا جا چکا ہے۔ تو ایک نہ ایک دن وہ آدمی بھی میدان میں نکل کھڑا ہو گا' جو پھر سے اس قوم کے محل کو کھڑا کر دے گا۔ جب پوری قوم میں مسلمانوں کی موجودہ حالت کا دکھ درد موجود ہے' جب تک عالم اِسلام ایک دوسرے کے دُکھ درد میں شریک ہے تو بس بات اتنی ہی ہے کہ قوم کی مرکزیت کسی نہ کسی طرح قائم ہو۔ وہ سالارِ زماں عالم اسلام میں ہے کیوں نہ نکل آئے۔ مہدی علیہ السلام کے انتظار کی ضرورت نہیں۔ آخر ہمیں بھی تو اپنی زندگی میں کچھ نہ کچھ کر گزرنا ہے جس سے جمعیت کی زندگی کو اِستحکام اور دوام ملے۔ اگر ہم سب میں جذبہ کی شدّت ہو' اُمّت کے لئے آنسو بہانے کا جذبہ صرف چند ہی میں ہو' تو وقت کا انتظار بھی ختم ہو جائے گا۔ کہیں نہ کہیں سے رحمتٌ لِّلعَالمینؐ کے صدقے وہ مردِ مجاہد نکل آئے گا جسے راہِ عمل القا ہو کر ہدایت من جانب اللہ حاصل ہو گی۔ پھر وقت کے لحاظ سے قدرت خود ہی اپنے منتخب شخص کی رہنمائی کرتی ہے۔ اس اُمّت کی گزشتہ تاریخ میں اگر کعبے کے محافظ صنم خانے والوں سے ساز باز

میں لگے رہے ہیں تو مسلمانوں کا بے سر و سامانی کا واحد سہارا اور تاب و توانائی کا اکلوتا مرکز صرف انوارِ نبوت کی ضیاء پاشیاں ہی رہی ہیں۔ اس طرح اسلام کے فروغ کا عملی پہلو ہمیشہ رَحمت لِّلعَالمین کے صدقے نصیب ہوا ہے۔ اسی کے سہارے اس اُمّت کو زمانے کے لئے رحمت بن جانا ہے۔ فساد' منافقت' اور ہر 'لا' کو مٹانا بھی رحمت ہے۔ خس و خاشاک جلا دینا بھی' شجر تراشی کرنا بھی رحمت ہے۔ کیڑوں مکوڑوں سے زمین پاک کر دینا بھی رحمت ہے۔ ڈاکٹر کی طرح ناکارہ' گندے' سڑے اعضائے جسمانی کاٹ دینا بھی رحمت ہے۔ بات بس ہدایت من جانب اللہ کی ہے۔ اسی لئے اسلام کی رُوح کو سمجھو۔ اسلام کے معنی امن اور سلامتی کے ہیں' پھر بھی فتنہ و فساد' منافقت کی بیخ کنی پر زور دیتا ہے کہ اصل دین تو اتحاد ہے' جمعیت ہے۔ فروغ السلام کے معنی ارکانِ دین کا پھیلانا نہیں ہے' بلکہ اخلاق دین کا پھیلانا ہے' محبت' اخوت کا پھیلانا ہے۔ جو اس راہ پر نہ چل رہا ہو' وہ لاکھ عبادت کرے' خلق اور خدا دونو کے لئے بے کار ہے۔

ماحول اور زمانہ کی مطابقت سے بیمار قوم کو نفس کی اِبتلائوں سے بچانا ہے۔ اس میں پہلی اِبتلاء انانیت کی ہے' میں اور نفسا نفسی کی ہے' اور کچھ اتنی شدّت سے کہ جیسے جمعیت کے تخیل کو بھول ہی گئی ہو۔ مرکزیت یا نقطے کی طرف رجوع ہونا ہی نہ جانتی ہو۔ اس سطح سے جانداروں کے لئے ڈنڈا چاہیے یا لالچ' کھانا' پینا' مالِ غنیمت کہ بنیادی فطرتِ انسانی کی یہی حیوانی ضروریات ہیں۔ جب ان سے شکم سیری ہو جائے تب اعلیٰ اقدار کی طرف لا سکتے ہیں۔ یعنی لطیفہء نفس کی سطح پر جہاں کہ نفس کو تہذیب اور شائستگی عطا ہوتی ہے' اخلاق میں پاکیزگی آنے لگتی ہے' ذاتی مفاد سے نظر ہٹ کر جمعیت کی خاطر زندگی بسر ہونے لگتی ہے۔ تب ہی کہیں وہ والہانہ جذبہ و شوقِ شہادت' حرمت اسلام اور ناموسِ رسولؐ قوم کے رگ و پے میں پیوست ہوتا ہے۔

؎ تیر قضا ہر آئینہ در تُرکش حق است

لیکن کشید آں زکمانِ محمدؐ است

قربان چشم یار پہ دیر و حرم کریں

سجدے جبین شوق کے وقف صنم کریں

سینچیں لہُو سے ذکر کے ایمان کی کھیتیاں

مُوتُو میں غرق کاوشِ بُود و عدم کریں

دُنیا کو پھر سے تازہ پیامِ حیات دیں

تاثیر قم باذنی' سے زندہ اُمم کریں

پھر داستان رمیٔت رَما ہو آج

ینظر بنور اللہ' سے دِل جامِ جم کریں

دل ہو طوافِ دوست میں اور کعبہ گردِ دل

فتنے جگائیں عشق کے دیں پر کرم کریں

شانِ قلندری سے بڑھیں سُوئے فتح باب

زاہد سے کام جو نہ ہوا آج ہم کریں

ذرّوں میں کائنات کے جلووئوں کا عکس ہو

قطرے کو موج موج کو ہمدوشِ یم کریں

الفقر فخری، سے کریں آرائش جنوں

دِلدادگانِ عقل پر کوئی سِتم کریں

)رحمان بابا(

باب ۷

امواج الاَسماء

صفاتِ الٰہی

ذات کا اِدراک ناممکن ہے' اِلاذات کے۔ آگ کو آگ پہچان سکتی ہے۔ ذات کو ذات۔ ذاتِ حق تک رسائی تو بڑی بات ہے' ایک انسان تک کی ذات کا اِدراک ممکن نہیں سوائے اس کی اپنا ذات کے۔ دوسرے انسان کو جاننے کے لئے البتہ اس شخص کی پوشیدہ قوتوں کے عمل میں آنے سے جو نتائج پیدا ہوتے ہیں وہ مشاہدہ اور علم میں آجاتے ہیں۔ اور کچھ اسطرح اس کی ذات کا اِدراک ممکن ہو جاتا ہے۔ ان پوشیدہ قوتوں کو اسکی صفات کہہ لو اور انہیں نام دے لو۔ اس طرح اس شخص کی ذات کا اِدراک اس کے اسماء وصفات کے ذریعے ہو جاتا ہے۔ البتہ ان مختلف صفات سے اس کی وحدت میں

کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اس شخص سے طرح طرح کے افعال ظاہر ہوتے رہیں تو اس کی وحدتِ شخصی تبدیل نہیں ہوتی۔ دیکھا جائے تو اسم اپنے مُسمّیٰ کی خصوصیت بیان کرتا ہے' اور صفت اپنے موصوف کی حالت اور افعال بیان کرتی ہے۔ اسماء کی اصل رُبُوبِیّت ہے اور صفات کی الٰہیت۔ قابل غور بات یہ ہے کہ انسان تک کی ذات اپنے اسماء وصفات' جسمیت اور مکانیّت سے پاک ہے۔ مادّہ' مدت' مقصد' حرکت اور قوت سے بھی مستغنی ہے۔

حق تعالیٰ کی صفت خالقیت، مخلوق کے وجود میں آنے سے پہلے بھی ظہور میں تھی۔ البتہ مخلوق (مربوب) کے وجود میں آنے سے صفت ربوبیت پہچانی گئی۔ حق نے جس صفت کو چاہا' جس پر چاہا' ظاہر فرمایا۔ اس طرح صفات الٰہیت کا مختلف نسبتوں میں اظہار ہے۔ اور رنگارنگ مدارج میں خلقت میں ظاہر ہیں کُلَّ یَومٍ ھُوَ فِیْ شَانٍ' چونکہ افعال غیر متناہی ہیں' اس لئے اسماء وصفات غیر متناہی ہیں۔ اس کے باوجود یہ ایک امتیازی کیفیت رکھتی ہیں۔

ایک کو دوسرے سے متمیز کرتی ہیں اور اسماء کی حقیقت کو قائم رکھتی ہیں۔

حق کے ان لامتناہی اسماء وصفات کا مرجع مقررہ اصولوں پر ہے جو ننانوے ہیں اور اسمائے حسنیٰ کہلاتے ہیں۔ ان اسمائے حسنیٰ کا مرجع بھی سات اصولوں پر ہے جو اُمہاتِ اسماء ہیں حَیٌّ عَلِیْمٌ قَدِیْرٌ مُرِیْدٌ سَمِیْعٌ بَصِیْرٌ کلیمٌ اور جن کا ظہور سبع صفات' حیات' علم' قدرت' اِرادہ' سمع' بصر' کلام میں ہے۔ ان میں سے بعض بعض کے ساتھ مشتمل ہیں' زوجین ہیں' جیسے۔ حَیٌّ عَلِیْمٌ قَدِیْرٌ مُرِیْدٌ۔ یعنی جیسے حیات نہ ہو تو علم نہیں' قدرت نہ ہو تو اِرادہ نہیں۔ اِرادہ نہ ہو تو کلام نہیں' اسی طرح اسماء ضدین ہیں' یا اسمائے متقابلہ' جیسے مُنْعِمٌ مُنْتَقِمٌ قَابِضٌ بَاسِطٌ ضَارٌ، نَافِعٌ اور ذوالوجہین ہیں' جو وہ اِسم سے حاصل ہوتے ہیں۔ دونوں جانب ان کا رخ ہے اور دونوں کے درمیان برزخ ہیں۔ جیسے ذُوالقُوۃُّ المتین (متین رُوح اور وجود کے درمیان) اسی طرح اسماء کی ترکیب سے غیر متناہی اسماء پیدا ہوتے ہیں' جو حد شمار سے باہر ہیں۔ البتہ ان ساتوں اسماء کی حقیقت ایک ہی اصل کی جانب ہے' وہ اللہ ہے۔ یہ اسم جامع ہے' تمام اسمائے الٰہی اور صفاتِ الٰہیہ کا۔

اسمائے الٰہی جن صورتوں میں ظاہر ہوتے ہیں' وہ مظاہر اسماء کہلاتے ہیں۔ عالم مثالی میں وہ صورت یا مظاہر ہیں' جن میں اسمائے الٰہی' علم الٰہی میں ظاہر ہوتے ہیں' اور عالم شہود میں وہ وجود عینی کہلاتے ہیں۔ اس طرح خلقت کی ہر شے مختلف اسماء کی ترکیب کی ایک ظہوری صورت ہے۔ انسان کو لیں تو اس کی روح ذات کا آئینہ ہے۔ مجمل انداز میں ذات کی تجلی ہے۔ جب رُوح نے ارادہ کیا تو اس سے جو فعالی حرکت پیدا ہوئی اس کا نام قلب ہے۔ اسی نکتہ سے دائرۂ موجودات گردش میں آیا۔ قلب اس فعالی حرکت سے اسماء وصفات کا آئینہ بنا' اور عالم حق میں اسماء وصفات کی جدا جدا تجلی کا مادی صورت میں اظہار ہوا۔

حدیث مبارک ہے کہ جس نے 99 ناموں کی حقیقت پالی ہو وہ جنت میں داخل ہو جائے گا۔ اس حقیقت کا پانا' علم الیقین یا عین الیقین تک کی بات نہیں' بلکہ حق الیقین کی بات ہے۔ جاننا ہو جانا ہے اور یہ ایسا ہی ہو گا جیسا کہ کسی شخص کو خود اپنی صفات کا اپنے پر عیاں ہونا ظاہر ہوتا ہے' کہ زندہ ہے۔ علم رکھتا ہے' قدرت رکھتا ہے' ارادہ رکھتا ہے' دیکھتا ہے' سنتا ہے' بولتا ہے۔ یہ عرفان اجمالی طور پر اپنی یکتائیت میں حاصل ہوتا ہے۔ یعنی ایک

وحدتِ ذات میں' اپنے عرفان ذات تک رسائی ہوتی ہے۔ اس لئے ذات کے عارف کو موحد کہتے ہیں۔ دیکھا جائے تو صفات کے ہیرے جواہرات زیادہ تر لوگ چنتے ہیں' وہ بھی ذکر' اذکار' تجلی' انوار اور انعامات کی شکل میں' اپنے سے جداگانہ چیز سمجھ کر' ایک قسم کی دُوئی میں۔ مگر اصل چیز ذات ہے۔ ذات کے لئے بغیر تعین کے حقیقت نہیں آتی بغیر وجود کے بات نہیں بنتی۔ ذات کا سمونا بڑا احسان ہے اللہ کا۔ اس کے لئے اپنے کو فراموش کر دے۔ اور کسی ذات مقدس میں گم کر لے۔ کسی قلندر نے کیا خوب کہا" اے اسماء کے چکر میں گرفتار مُسمی کیوں نہیں ڈھونڈتا"۔ یوں ہم لوگ عام طور سے کوئی اسم مل جائے تو کسی مقصد کے لئے پڑھتے ہیں' اسے آلہ بناتے ہیں۔ یہ بڑی ذلت ہے۔ اسم تو نشانی ہے' آیت ہے۔ اس نشانی کے پس پُشت جو حقیقت ہے اس تک پہنچنا ہے۔ چشم دل وا ہو تو ایک ایک اسم کا عالم وجود میں کوئی نہ کوئی پیکر مل جاتا ہے۔ مگر جس پر نہ بیتی ہو وہ کیا جانے کہ جیتے جی حقیقت تک نہ پہنچیں تو سب جنجال ہے۔ یہ لطافتوں کی باتیں ہیں۔ لطافت کے لئے ایک مثال لیں۔ کوئی کئی دن کا بھوکا ہے' اسے کھانا کھلایا۔ وہ الفاظ کے ذریعہ کہتا ہے کرم کیا۔ اب یہ کرم اتنی نازک چیز ہے جو نہ کھانا تھا نہ پیٹ بھرنا۔ اسی طرح کسی سے عشق ہو گیا تو خیال بہلانے کے لئے کبھی آنکھوں کا تصور' کبھی آواز کا' کبھی قد کا۔ مگر کیا عشق ان چیزوں سے ہوا ہے۔ عشق تو ایک جلوہ سے ہوتا ہے۔ یہی قصہ ہے صفات اور ذات کا۔ ہم مادہ میں ہیں اس لئے ان لطافتوں کا اظہار مادی وسیلوں سے ہی ہوتا ہے۔ جیسے پھول کو دیکھے بغیر نزاکت کا احساس ہو سکتا ہے' نہ خوشبو کا اور بات کچھ ایسی ہے کہ کسی ہستی سے عشق کے بغیر ذات تو دُور' صفات تک کی بھی بِھنک نہیں لگ سکتی۔

عشق نبیؐ کی خوشبو

عشق کی بات یہ ہے کہ انسان اوّل اوّل اپنی حِس و حرکت سے' محسوسات اور ظاہری اجسام کا ہی قرب تلاش کرنے میں مطمئن ہو جاتا ہے۔ جب اس حالت سے ترقی کرتا ہے تو عقل کا نور اس میں چمکتا ہے۔ اور بلا حرکت بدنی عالم بالا میں تصرف کرنے لگتا ہے' اعلیٰ صفات میں قدم رکھتا ہے۔ جیسے ایثار' قربانی' صداقت' خدمت' پاکی' طہارت وغیرہ اور ان امور کا اِدراک کرنے لگتا ہے جو قرب و بعد مکانی سے برتر اور ماوریٰ ہیں۔ حرص و ہوا' شہوت' غضب کے تنگ تاریک کوچہ سے اسے آزادی ملتی ہے۔ عاقبت بینی' طلب کمال کی اس میں رغبت ہوتی ہے اور فرشتوں سے مشابہ ہو جاتا ہے۔ گویا جب انسان نفس' خیالات اور محسوسات کو ترک کر کے ان اُمور کے اِدراک سے مانوس ہو جاتا ہے جو حِس خیال سے بالاتر ہیں تو مجردات میں زندگی گزار رہا ہوتا ہے۔ اب وہ حسن کو بغیر حسین کے دیکھتا ہے اور اب کہیں سبحان اللہ کہنے کا مصداق ہوتا ہے۔ یعنی مقام ملائک میں قدم رکھتا ہے۔ اسماء کا مقام بھی ملکوت تک ہے۔ جب تک ملکوت سے جبروت میں رحمت لِّلعالمینی ہے' محبوبیت ہے' امر ہے' ملکوت میں عالم عمل ہے' عالم جبروت تک رسائی اپنے اختیار اپنے مجاہدوں اپنی قربانیوں کی بات نہیں۔ یہ کرم تو اُدھر سے ہے کہ اس نے چاہا تو اُٹھا لیا' عاشق کو محبوب بنا لیا' گلے لگا لیا۔ کوئی دُوئی باقی نہ رہی۔ اب کہیں مرضیء تخلیق کی تکمیل ہوئی۔

اسی لئے انسان کو علم الاسماء خلیفۃ اللہ بنایا ہے۔ یہ حکم' امر وہی امانت تھی جو عطا ہوئی اور اسی امانت کو واپس کرنا ہو گا۔ امانت یہی خودی ہے مَنْ عَرَفَ نَفْسَہٗ' قیام خودی کا اقرار ہے۔ سجدہ' اسی خودی کو حوالے کر دینے کی نشانی ہے۔ یہ امانت کچھ ہیرے کی طرح سمجھ لیں کہ اسے غلاف میں کی رکھنا۔ دوسروں کو بھی نظارہ کرا دیا۔ یا چراغ کی مثال' کام کر لیا چراغ واپس کر دیا۔ اپنا وجود ہی حق ہے' اس کے علاوہ کیا۔ اس لئے سیدھا سا نسخہ ہے کہ

اپنی خودی کو تُو' میں ضم کر دو۔ زندگی کا کام جو سپرد ہوا ہے' وہ کرو۔ دِل بہ یار دست بہ کار۔ اس میں ایمان و عمل دونوں شامل ہیں۔ اس 'میں' اور تُو' کی توحید میں ہی بارِ امانت اٹھایا جاتا ہے۔ ایک ہاتھ تیرا ایک میرا۔ ایسی اِکائی کی ضرورت ہے۔ یہ تھی نعمت جو اسلام نے دنیا کو دی۔ تعینات سے ماوراء مجردات میں زندگی گزارنا ہی اسلام کا باطن ہے اَلْحَقُّ مَحْسُوسٌ وَالْحَقُّ مَعْقُولٌ والی بات ہے۔ بغیر عشق و محبّت کے اِن لطافتوں تک رسائی ممکن نہیں۔ فطری طور پر انسان میں محبّت کا جذبہ ہے۔ محبّت کی ابتداء خلش ہے' تجسس ہے' روح کی تڑپ ہے' اپنے اصل کے لئے۔ اسی لئے کسی قلندر نے کیا خوب کہا کہ جب تک نسبت ابراہیمی پیدا نہ ہو' قرآن تو بڑی چیز ہے کلمہ تک پڑھنا جائز نہیں۔ یہ تلاش حقیقت روح کی طلب ہے' ضرورت ہے' اس کی فطرت میں ودیعت ہے۔ وہ اپنی ظلمت اور جہالت کی وجہ سے اس تڑپ اور بے چینی کو خواہشاتِ جسم سمجھ کر اسی کے حصول کی طلب میں زندگی گزار دیتا ہے اور روح ویسی کی ویسی تڑپتی رہ جاتی ہے۔

عاشق کے ہر قدم شوق کی اِبتداء بِسْمِ اللہ ہے۔ اور یہ نشانی ہے کہ حق سے رابطہ کا جو فطری شوق ہے وہ نہ ٹوٹنے پائے' اس کی یاد دہانی ہوتی رہے۔ بِسْمِ اللہ کی مثال لیں۔ بِسْمِ اللہ ہر سطح پر ہے' ہر عمل پر ہے' ہر قدم پر ہے' بِسْمِ اللہ نہ تم خود کر سکتے ہو بغیر حق کے' نہ بِسْمِ اللہ تم سے علیحدہ کوئی چیز ہے۔ اس بِسْمِ اللہ میں تم اور حق دونوں شامل ہیں۔ یہ تو حقیقت کی جان ہے یہ لفظ 'ہے' ہے تو 'ہے' نہیں تو نہیں ہے۔ جو سمجھو وہی ہے' اور 'ہے' حق در حق' ایک مستی سی' ایک کیف سا' اللہ ھُو' کیف میں آئو وہی ایک 'ہے'۔ اس 'ہے' کا جو انتہائی شعور میں ہو سکتا ہے وہ ہے نور محمدیؐ' کُن سے پہلے بھی یہی نور محمدیؐ جاری و ساری ہے۔ فیکون خود ایک رحمت ہے' رحمتً اللّعالمینی تجلی ہے۔ اس انوارِ رحمت' نورِ محمدیؐ کا کوئی وجود بھی نہیں ہے کیونکہ عالم تمام ذاتِ باری کا علم ہے۔ یہ اس علم سے بھی پہلے کی چیز ہے' ھُوَ الْاَوَّل حق کا وہ جلوہ جو ہے' وہ ہے' نورِ محمدیؐ۔ چونکہ ہم وجود میں ہیں' اس لئے اس نکتہ کو ہی پکڑنا پڑتا ہے۔ ہم پکڑیں یا نہ پکڑیں' وہ ہمیں ضرور پکڑتا ہے۔ رحمت سے بچ کر کہاں جا سکتا ہے۔ یہ اِلّاِ بِسُلطان والی بات ہے۔ بغیر سلطان کے ساتھ واقعی وہ بات ناممکن ہے۔ اللہ کو ہم نے بت بنا کر اٹھارویں آسمان پر بٹھار کھا ہے۔ حقیقت کی سطح سے دیکھیں تو دُوری اور دُوئی کا سوال ہی نہیں ہو سکتا۔ جب وُسِعَ عَلٰی کُلِّ شَیٍ ہے جو 'ہے' کا شعور آجائے تو 'میں' ہے 'تُو' ہے وغیرہ سب الفاظ ختم ہو جائیں۔ نورِ محمدیؐ کی تجلی تو ذرّہ ذرّہ میں ہے۔ جب اپنا آئینہ صاف ہو گیا تو پھر خیال' امر سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کے آگے نہ خیال ہے' نہ امر۔ اس کے آگے بس 'ہے' ہی 'ہے' اس 'ہے' کے شعور کو عرفان کہتے ہیں۔ 'ہے' کی بھی بس واردات ہی ہوتی ہے۔ کسی مجذوبہ نے کسی دہریہ سے پوچھا 'ہے'۔ اس نے سوچا خدا کا پوچھتی ہے۔ کسی مجذوبہ نے کسی دہریہ سے پوچھا 'ہے'۔ اس نے سوچا خدا کا پوچھتی ہے۔ کہا 'ہو گا' اس نے پھر کہا 'ہے' تو دہریہ نے خیال کیا اور کہا کہ "ہونا تو چاہیے وگرنہ یہ سارا دھندا کس لئے"۔ مجذوبہ نے تیسری دفعہ کہا 'ہے' تو اب عرفان ہوا اور وہ شخص اور مجذوبہ دونوں مل کر ہے ہے ہاہاہا کرنے لگے۔ پھر جب یہ واقعہ اس دہریے نے مجھے سنایا تو یہی کیفیت میری اور اس کی ہو گئی اور اس آواز کا اثر میری بیمار بیوی پر جو دوسرے کمرہ میں تھی یہ ہوا کہ اس نے کہا" آپ اتنے عرصہ سے مجھے سمجھانے کی کوشش کرتے رہے' اب پردہ اٹھ گیا۔ اب میں سب کچھ سمجھ گئی"۔ اور بات بھی یہی ہے کہ حقیقت وارد ہی ہو سکتی ہے۔ سمجھنے' سمجھانے کی بات نہیں۔ یہی حال اسماء و صفات کا ہے۔

رحمت اور احسان

اسماء کا چکر بھی عجیب ہے۔ پڑھنے پڑھانے میں گھِر گیا تو ہزاروں سال عُمر بھی کافی نہیں۔ انہیں جھٹک ڈالنا چاہیے۔ اگرچہ لذیذ نشہ ہے۔ یوں اسماء کا وِرد رکھنے میں کم از کم اتنا تو ہر ایک کو ہو جاتا ہے کہ جیسے گڑ گڑ کہنے میں منہ میں مٹھاس آجاتی ہے۔ لیکن حقیقت تو یہ ہے کہ اسم مُسمّیٰ سے ذرا سا ہی حجاب ہے اور اسم پڑھنا نہیں اپنانا ہے' ہو جانا ہے۔ اپنی جان اور رُوح کی تڑپ کی طرف انسان غور سے اِستغراق حاصل کر لے تو نہ صرف اسماء کی معنویت بلکہ حقیقت طاری ہوتی ہے۔ یہ علم الاسماء کا مقام ہے۔ اس فضل و کرم کا کچھ ایسا حال ہے جیسا غوطہ لگانے کی بات ہو۔ پھر اس بحرِ حقیقت میں کیا کیا موتی نہیں۔

عقل کی سطح سے اسمائے الٰہی کو سمجھنے کے لئے انسان کو ہی لیں۔ کسی انسان کو نام سے' صورت سے پہچانتے ہیں۔ اسم کا تعلق تخیل تک ہے' اور اسم سے آگے صورت ہے۔ پھر اس کے آگے حقیقت ہے' صورت کیا ہے؟ ماحول اور 'میں' کے درمیان برزخ ہے۔ یا ظاہری حواس اور باطنی شعور کے درمیان برزخ ہے۔ حقیقت میں اس سے آگے کی بات ہے۔ برزخِ شیخ ہر آن ہے۔ یہی برزخ کُبرا ہے۔ اپنے نکتہ کی آئینہء شیخ میں دید ہے۔ اس سے پار ہوئے تو روح۔ وہاں عالم امر ہے۔ روح کی جو کھوج ہمارے وجود میں چھپی ہوئی ہے اس کا پرتو خیال ہے۔ اس کا عکس عقل جزوی پر پڑتا ہے۔ عقل جزوی عالم اسباب کی پابند ہے اس لئے کسی تشفی بخش انجام تک نہیں پہنچاتی۔ یہی خیال جب قلب میں اُتر جائے تو اسے ایک رُخ مل جاتا ہے' اور بھٹکتا نہیں۔ قلب میں خیال اُترنے کی دو ترکیبیں ہیں' جو کسی کانٹے سے اٹک جانے سے تعلق رکھتی ہیں یا تو ٹوٹا ہو دل ہو یا احسان میں ڈوبا ہوا۔ ٹوٹے ہوئے دل سے بھی حق کی روشنی مل جانے کی امید ہو سکتی ہے۔ گو کہ غم میں شکایت کا جزو ہوتا ہے' مگر خوش نصیب ہے وہ جو کسی احسان میں اٹک جائے' تاکہ اٹھا لیا جائے۔ فرمان ہے' جو شکر کرتے ہیں۔ انہیں ہم بہت دیتے ہیں۔ نبی کریمؐ سے پوچھا آپ اتنی نماز کیوں پڑھتے ہیں۔ فرمایا' کیا میں شکر گزار بندہ نہ بنوں۔ احسان ہی سب سے لطیف تر ذریعہ ہے' اٹھا لئے جانے کا۔ احسان میں ہی حُسن کی آنکھ کھلتی ہے۔ احسان کھلا ہوتا ہے' شگفتہ ہوتا ہے۔

؎ گر عِشق نبودے و غمِ عِشق نبودے

حسن ازلی پردہ زِ رُخ پر نہ کشودے

احسان کے پیر قلب میں ہوتے ہیں اور بصیرت رُوح میں۔ احسان کی قبولیت کی صلاحیت ان میں ہوتی ہے' جن میں انسانیت کی صلاحیت ہو' ورنہ جانور بھی ٹوٹ کے رام ہو جاتا ہے۔ سب سے بڑا احسان' وجود ہے' ورنہ ہم فرشتوں کی طرح بس اللہ اللہ کرتے رہتے ہے۔ وجود' یوں احسان ہے کہ وجود نہ ہوتا تو نائب نہ بن سکتا۔ اور اس عالم کارزار میں اس کی آئینہ داری نہ ہو سکتی۔ کتنا بڑا احسان ہے کہ وہ اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِیْم ہے۔ رحیم ضرورت کو پورا کرتا ہے۔ رحمن بے وجہ' بے ضرورت' بے اہلیت اور ہر مخالفت کے باوجود دیتا ہے۔ رحمانیت ہر چیز پر غالب آجاتی ہے۔ چاہے ہزار کثافتیں ہوں' ہزار ناُمیدیاں ہوں۔ یہ رَحْمَتً لِلْعَالَمِینی کا احسان ہے۔ اس احسان کو جس نے قبول کر لیا' اسکے لئے نہ کسی بھٹی سے گزرنا ہوتا ہے نہ منزل۔ وہ تو موج ہی موج ہے' پھولوں کی سیج۔ اس نے دامن رحمت پالیا ہوتا ہے۔ اسی لئے وہ دامن کبھی نہیں چھوٹتا۔ یہ ہے اصل چھوٹا راستہ احسان کا' وگرنہ بہت سے بھاڑ جھونک کر بھی پھنک جاتے ہیں' یا غموں رنجوں میں ڈُوب جاتے ہیں' ٹوٹ جاتے ہیں' کوئی ایک سمندر ہوتا ہے جو بچ کر نکل جاتا ہے۔ جس نے رحمت اور احسان کو قبول کر لیا' وہ خوش نصیب ہے۔ جو کھونٹے سے لگ جائے وہ کیسے سُوکھ سُوکھ کر مر سکتا ہے۔ اس سے کیا چکی پسوائیں گے یا پسے گی'

محبّت کا انعام ہے' جب محبّت بے وجہ ہو' خود بخود ہو تو محبّت ہے۔ اسی طرح رحمت کی صِفت ہے کہ بے وجہ رحمت۔ رحمت اور محبّت ہم معنی ہیں۔ فرد کی سطح پر محبّت اور اس کا عالم میں پھیلاؤ رحمت ہے۔ رحمت کی مثال دھوپ کی سی ہے کہ اندھیرے میں بیٹھے رہے تو دھوپ کہاں سے ملے۔ رحمت کے امیدوار اسی وقت ہوسکتے ہیں جب شکر گزار بنو۔ جیسے دولت' دولت کو کھینچتی ہے' اسی طرح شکر رحمت کو۔ بِسْمِ اللہ کی طرح یہ رحمت دو طرفہ حساب ہے' ظلمتوں میں یہ اس لئے نہیں آتی کہ روشنی اس کی سواری ہے۔ یہ روشنی لگاؤ' عشق' شکر' قربانی ہے۔ یوں اچھے اچھے طریقت والے بھی ظلمتوں میں گھرے ہوتے ہیں۔ انہیں رحمت کس طرح نصیب ہو' جب نہ عشق ہے نہ شکر' نہ ایثار ہے' نہ قربانی۔ جب کسی مرکز حق کے طفیل عشق کی پھریری آجائے تو وہ دیکھنا مَازَاغَ الْبَصَرُ ہو جاتا ہے۔ وہ بولنا' وہ سُننا' وہ بات کرتے کہ میں لب تشنہ تقریر بھی تھا۔ وہ سونگھنا وہ کہاں پھیلی ہے خوشبو اور یہ گیسُو کہاں تک ہیں' وہ لامسہ' وہ چھونا آگ کا آگ کو' وہ جانا رب کا رب سے' وہ چھلکنا لذتِ عشق کا' جامِ دیدار کا' جامِ وصال کا۔ جام شہادت کا۔ یہ لطافتوں کی دنیا ہے۔ صفاتِ الٰہی کی لطافتوں کا پرتو ہے جو اجسامِ انسانی پر پڑ رہا ہے۔ صفاتِ الٰہی کے انوار ہیں جن کی تابانی رنگا رنگ انداز میں اسی وجود سے ہوتی ہے۔ صفات اور وجود سے ہی ذات کا ادراک ہوتا ہے۔ اس رنگ میں توحید کو پانا ہے۔ دیکھا جائے تو یہ اسماء وصفات زوج میں آئے ہیں۔ ایک پدری صفت ہے ایک مادری۔ یہ مقناطیس کے دو قطب جیسے ہیں۔ ایک مثبت ایک منفی۔ حقیقت میں جدا نہیں ہوسکتے۔ ایک قطب کے عملی معنی ہی نہیں ہوتے۔ دونوں جب ملیں تب ایک جیسے الرَّحمٰن (پدری) اَلرَّحِیم (مادری) غَفُوْرٌ رَحِیمٌ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ جَبَّارٌ قَھَّارٌ حَیٌّ قَیُّوْمٌ۔ انسان' خود جوہر لطیف ہے۔ اسماء کی لطافتیں' اپنا کر لطافتوں میں قیام کرلے' الطف ہو جائے تب مظہر انوار بنے۔ مثلاً جب حَیٌّ میں زندگی' قَیُّوْمُ میں قیام ملا' تو انوار نے گھیرا' سایہء نور میں آئے۔ جب حق جلوہ گر ہوا تو رائی کے دانے کی طرح وجود پھٹ گیا' پھر پھیل گیا پانی کی طرح اس میں احساس باقی رہا' کہ حضورؐ ہیں' پھر شعور آیا' جیسے بچہ ہو گیا۔ پھر کہا لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ' توحید میں قدم رکھا' توازن میں آئے۔ یہ زوجین ضِدین سب توازن میں ہیں۔ منفی مثبت دو قطب' اگرچہ مقناطیس خود واحد ہے۔ مقناطیسیت کی طرح عمل کی جو برکات یا شعائیں یا نور ہے' وہ بنتا ہے ان ہی دو سے۔ عمل کے معنی ایک 'میں' ایک 'تُو' ایک ہاتھ میرا ایک تیرا۔ دونوں ہاتھ سے تالی بجتی ہے' اس لئے اس حَیٌّ کو خلوص سے پکڑو جو زندہ موجود ہے۔ خلوص میں حَیٌّ والی زندگی اور تڑپ ہوتی ہے' وہ نمو کی بے قراری۔ تم اللہ اکبر کہہ کر بھی جیسے کے ویسے۔ مرغ جیسے بھی نہیں کہ اللہ اکبر اور جاں بحق۔ زندگی کی اس شدّتِ کُن کو اپنائو۔ کائنات کی ذرّہ ذرّہ بے پناہ حرکت نمود کے جوش میں مشغول ہے۔ یہ بھی ارتقاء کی طرف رجوع کرتا ہے' جامد نہیں ہے۔ تم بھی حَیٌّ کے کیف میں ہو کر حرکت نمود میں آئو' حیاتِ جاودانی میں قدم رکھو۔

اس طرح اسماء حُسنہ میں سے قہار و جبار کو لیں۔ قہاریت' جباریت' پیاری چیز ہے' تجلّی' ہے' زندگی ہے جیسے روضہء مبارک کی جالی پکڑ لی' بوسہ بھی نہ دے سکے۔ اپنا خیال تک اس قہاریت حُسن میں نہ رہا' عشق سمٹ کر آنکھوں میں آگیا۔ ایک کھوئی کھوئی سی حالت۔ یہ ہے خشیت حسن' آنکھوں کی ٹھنڈک۔ یہ زمان سے نجات کی حالت ہے۔ اس وجود سے دُوری ہو تو اپنی حقیقت سے قُرب ہوتا ہے۔ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہُ۔ جب سب اِلٰہَ مٹ جائیں تو جو جاری و ساری ہے۔

ایمان و عمل اور وجود طلبی

ایمان کو لیں، تو اپنی جگہ ہے۔ خود واحد ہے، مگر عمل کی جو برکات یا شعاعیں یا نور ہے وہ بنتا ہی انہی دو قطبوں سے ہے۔ یعنی ایمان و عمل، ایک مثبت ایک منفی، ایک 'وہ' ایک 'تم' اسی طرح انسان کے جتنے اعلیٰ اقدار ہیں وہ تمام واحد ہیں۔ جیسے محبّت، کا زوج، نفرت ہو سکتا ہے، مگر عشق کا نہیں۔ کنجوس کا خیرات ہو سکتا ہے، مگر سخاوت واحد ہے۔ بزدلی، اور شجاعت زوجین ہو سکتے ہیں، مگر شہادت واحد ہے۔ ولایت و نبوت زوجین ہیں مگر توحید واحد ہے۔ نفس، منفی صفت ہے، قلب مثبت چیز ہے، مگر رُوح واحد ہے۔ خیر شر زوجین ہیں، مگر رحمت واحد ہے۔ ان سب کو ہاروت و ماروت کے پیکر میں دیکھیں اور غور کریں کہ آخر یہ زوجین انسان کے اندر کیوں ڈالی گئی ہیں وجہ یہ ہے کہ مادری پدری صفت ربوبیت کی شان ہے۔ اور مثبت منفی ملا کر ایک، ہو جاتا ہے۔ اللہ ایک ہے۔ اس روشنی میں زوجِ اسمائے حسنہ کو ایک ایک کر کے غور کریں تو صفات کی وہ تجلیاں ہوتی ہیں کہ قلب و روح جگمگا اٹھتے ہیں۔

عالم امکان کا سب سے نمایاں زوج دن اور رات یا روشنی اور تاریکی ہے۔ ارتقائے زندگی پر غور کریں تو شائد زندگی اور جان کے ہزاروں اقسام اس زوج کے بغیر وجود میں ہی نہیں آتے۔ البتہ سمندر کی تہہ میں کوئی پانچ چھ میل کی گہرائی میں جہاں بظاہر کلی تاریکی ہے، وہاں بھی مچھلیوں کی کچھ اقسام ضرور پائی گئی ہیں۔ اسی طرح ممکن ہے زمین میں بھی، غاروں میں، تاریکیوں میں کچھ زندگی کے نمونے ضرور ہونگے، مگر جب اِرتقاء کی کڑیاں ہم دیکھتے جائیں تو اعلیٰ مخلوق جو بنی ہے، سب اسی زوج کے بوتا پر بنی ہے۔ جس طرح زندگی پہلے سمندر سے رینگ رینگ کر خشکی کی طرف آئی، اسی طرح ممکن ہے کہ یہ تاریکی کی مخلوق بھی وقت گزرنے پر طبعاً روشنی کی طرف نکل آئے۔ ایک درخت کی مثال لیجئے، روشنی اس کو اوپر کھینچتی ہے۔ جسے (ہیلیو ٹراپزم Heliotropism (کہتے ہیں۔ درخت اپنی نشو نما کے لئے اپنی غذا زمین یا تاریکی سے ہی لیتا ہے۔ مگر وہ اس کو ہضم نہیں کر سکتا، جب تک کہ سورج کی روشنی اور ہوا کے اجزاء اس غذا کو حرکت میں نہ لائیں۔ کائنات میں خیر و شر کی یہی رمز ہے۔ جب تک کسی انسان میں شر کی صلاحیت نہ ہو یعنی نفس قوی نہ ہو، وہ کبھی اعلیٰ مقام تک پہنچ ہی نہیں سکتا۔ کوئی نامر دیا ہیجڑا نہ آج تک ولی ہوا، نہ کوئی جرنیل ہوا، نہ کوئی اور اعلیٰ کِردار ادا کر سکا۔ اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہی نفس یا حرارتِ غریزی کیسے مسلمان ہو۔ کیسے کسی فرد کے نصبُ العین کے ساتھ ہم آہنگ ہی نہیں بلکہ معاون اور مددگار ہو۔ نبی کریمؐ نے اس کا نہایت سادہ نسخہ بتایا ہے۔ ایک بہت غریب نوجوان حاضر ہوا، اور کہا کہ یا رسول اللہؐ میں بہت غریب ہوں، اور شادی کی مجھے ضرورت ہے۔ مگر شادی نہیں کر سکتا۔ آپؐ نے فرمایا روزے رکھو۔ یہ جو بزرگوں کا کہنا ہے کم خوردن، کم خفتن، کم گفتن، اس کے بُوتا پر نفس مرتا تو نہیں، اس کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، مگر اس میں ایسی جلا اور لطافت آجاتی ہے جو آنکھوں کی روشنی اور قلب کے ظرف رجوع ہوں۔ جس طرح سورج مادی زندگی کا رب کہلایا جا سکتا ہے، اسی طرح رُوح کے نمود اور فروغ کا سورج، وہ شمس حقیقت ہے، صَلَّ اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمْ جس کا نُور یکتا ہے، اور آپ ہی آپ اور چونکہ اس کی نمود آفاق سے نہیں بلکہ ذرّہ ذرّہ کے انفاس سے ہے، اس لئے اس کا شعور اس وقت تک نہیں مل سکتا، جب تک کہ انفاس اور آفاق کی توحید قائم نہ ہو۔ ایک دیدار کے بعد جو بڑے بڑے اکابر بھی فراق کی بھٹی میں عمریں گذار دیتے ہیں، کاش کہ اس نور کی اکائی اپنا لیں تو پھر ظلمت کی تاریکی کہاں، فراق کہاں، تُو، کہاں، اور 'میں' کہاں۔ مگر ہاں مسلم اور مومن کو دو پیروں سے چلنا سکھایا ہے، دین اور دُنیا۔ یہ آفاقی سورج جب غروب ہوتا ہے تو شب کی تاریکی خصوصاً طلوعِ سحر سے پہلے کی گھڑیاں، ذات کا صفات سے رابطہ قائم کرتی ہیں۔ دو ذات نہیں ہے۔ یوں سمجھ لیں کہ آرسی کی رسم ادا ہوتی ہے۔ یہ ولایت کا کیف ہے۔ یہ ایمان کا نکھار ہے۔ رہی نبوت کی روشنی، وہ علیحدہ بات ہے۔ اس آفاقی دن میں مومن، عمل کے میدان میں ہوتا ہے۔ حقیقت کے میدان میں عمل کیا ہے، ہر وقت یہ خیال، جس کو مقامِ احسان کہتے ہیں کہ وہ مجھے دیکھ رہا ہے۔ اور پھر اس میں بھی ایک کیف ہے اور جو کیف، مستی

کی حد تک پہنچ جائے تو کون کسی کو دیکھتا ہے۔ خود بخود پھول سے خوشبو کی طرح وہ عمل سرزد ہوتے ہیں جس کو لوگ عمل صالح کہتے ہیں۔ آخر کیوں۔ نبیؐ ایک نمونہ ہے' پیروی کے لئے اور چونکہ ہر فرد کے باطن میں وہ شمس ٹمٹمارہا ہے' اس لئے ہر کسی کا رُجحان طبعاً نیکی اور فروغ کی طرف ہے۔ یہ وہی مقام ہے' جہاں حضرت علیؓ کے الفاظ مطابقت کرتے ہیں کہ مَنْ عَرَفَ نَفْسَہٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّہٗ اور اسی لئے جب نمونہ دیکھتے ہیں تو خود بخود ان کا دل گواہی دیتا ہے کہ یہ سچ ہے اور ٹھیک ہے۔ یہ وارثانِ نبیؐ گویا ان ہی کی زندگی کی وُسعت میں بسے ہوتے ہیں۔ شب یلس ؔ تو صبح طٰہٰ اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلُ وَالنَّہَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَاب۔ جب شمس حقیقت اپنی جان میں نصف النہار پر نہ ہو یا ادب اور حیاء کے پردے حائل ہوں تو پھر ایک چاند بھی اُبھر آتا ہے۔ اس کا وجود بھی ظاہر و باطن دونوں میں ہوتا ہے۔ چاند کا گھٹنا اور بڑھنا' اس میں بھی نشانیاں ہیں' فکر کرنے والوں کے لئے۔ یہ چاند اپنا پیر ہوتا ہے کبھی مرید پر شغل مستی چھا جاتی ہے' اور پیر کی مُراد بن جاتا ہے تو کہہ اٹھتا ہے 'میں پیر ہوں' چودھویں رات کا چاند ہوں۔ کبھی تاریک رات آتی ہے تو کہتا ہے کہ 'میں غلام ہوں' بندہ ہوں' یہ طوق میرے گلے سے نہ نکالیے' یہ گھٹنا اور بڑھنا ضروری ہے ورنہ ایسی مستی چھا جائے کہ شمس حقیقت کی روشنی سے محروم رہ جائے اور نبوت کے کارزارِ عمل میں ناکارہ ثابت ہو جائے۔ جب چاند بھی پردوں میں ہو تو اندھیری رات میں آسمان پر تارے کس حُسن و خوبی سے جگمگاتے ہیں۔ آسمان کا حُسن خود ایک منفرد چیز ہے' پھر یہ ستارے۔ یہ وہ اکابر بزرگان دین ہیں جس سے محبّت اور عقیدت ہر جویائے حق کے لئے لازمی ہے اور ہوتی ہی ہے۔ کوئی دُوئی کا سوال نہیں۔ کبھی آپ نے ایک صالح نوجوان کی ہُوک اور نامعلوم تلاش کو بھی اپنایا ہے۔ ظاہری اور باطنی ہر قسم کی صلاحیتیں درجہء اتم تک موجود ہوتی ہیں' مگر بے رُخ۔ اس زندگی میں وہ تاریک رات ہوتی ہے' جب سیاہ بادل بھی آسمان پر چھائے ہوتے ہیں۔ مگر جب حُسن کی پہلی کرن اس کے قلب و نظر کو پار کر جاتی ہے تو ساری صلاحیتیں ایک رُخ ہو جاتی ہیں۔ اس کی قسمت اگر کوتاہ ہے' تو ایک دِنیوی لحاظ سے خوش نصیب بھی ہے۔ زِندگی کے زوج میں گرفتار ہوتا ہے اور عمرے باید کہ یار آید بکنار۔ قسمت اگر بلند ہے تو پھر اس کی سمجھ میں آتا ہے کہ یہ مجاز تو ایک نشانی ہے' حقیقت کچھ اور ہے۔ کبھی آپ نے دیکھا ہو گا کہ ایک ساتھ آسمان پر سورج بھی ہوتا ہے اور چاند بھی' خصوصاً غروبِ آفتاب کے وقت مشرق کے اُفق پر چاند نکھر آتا ہے۔ شمس حقیقت' اس کا نمود تو باطن جان میں ہے۔ اس کے غروب ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ مگر یہ کس کے نصیب میں کہ دائم قائم وہ قلب و رُوح میں نصف النہار پر ہو۔ ہاں قلب سے گزار کر جب قَمْ بِاِذْنِیْ سے روح کو قیام ملا تو یہ وہ صبح صادق ہوتی ہے جہاں نہ سورج نظر آتا ہے نہ چاند' مگر ایک ایمان بالغیب ہوتا ہے کہ یہ سورج کی کشش ہی ہے جس نے مجھے کھینچ کر نکالا۔ سورج کی تاب کون لا سکتا ہے' جب حضرت موسیٰؑ جیسے جلیل القدر نبی بھی ایک ادنیٰ پرتو کی برداشت شائد نہ کر سکے۔ حق جہاں بے نام و نشان ہے وہاں نام و نشان بھی ہے۔ یہ جو برقِ طور کہلاتی ہے اس شمس حقیقت کی ایک ادنیٰ تجلی تھی۔

دن اور رات کے یہ زوجین صرف شعور اور عقل کی باتیں ہیں ورنہ تاریکی بھی کوئی چیز ہے جس سے آپ جہاد کریں یا بھگا سکیں یا اس کو مار سکیں۔ صرف روشنی کے نہ ہونے کو تاریکی کہتے ہیں۔ اسی طرح خوبی کے نہ ہونے کو خرابی کہتے ہیں اور خیر کے نہ ہونے کو شر۔ منفی' منفیت بذات خود نہ کوئی صفت ہے نہ اس کی کوئی حقیقت ہے۔ جیسا کہ پہلے ذکر آچکا ہے جتنے اعلیٰ اقدار ہیں جن کو ہر کوئی' کسی تہذیب اور تمدن کا' تاریخ کے کسی دور کا ہو' کسی مذہب ملت کا ہو' آخر کیوں مانتا ہے' کہ یہ حق ہیں۔ وہ اسی لئے کہ اس کا شعور تک اس کو بتاتا ہے کہ یہ وہی اقدار ہیں جو ذاتِ قیوم کے پرتو ہیں۔ کسی نے خوب کہا کہ خوبی اور نیکی کے حق ہونے کا ثبوت صرف یہی ہے کہ وہ قائم رہتے ہیں۔ ظلمتیں خود بخود چھٹ جاتی ہیں۔ اسی لئے جو فقراء روشنی

کے پروردہ ہیں' ان کا فرمان ہے کہ تم اپنی کمزوریوں' اپنے نفس کے تقاضوں' اپنی اُلجھنوں اپنی بے مائگی کی طرف نہ دیکھو بلکہ ان مثبت صفات کی طرف توجہ رکھو۔ البتہ اتنی بات ضرور ہے کہ گو ہم ان صفات کو مانیں مگر وہ صفات عملاً ہم کو اپنے رنگ میں ڈھال نہیں سکتیں جب تک کہ اس مجسم صفاتِ نوری کی طرف رجوع نہ ہوں جو وجود میں ہو۔ آخر کچھ بت پرست جانتے ہیں کہ روشنی ایک چیز ہے مگر پرستش کرتے ہیں سورج کی۔ موجود' وجود کو طلب کرتا ہے۔ اس کے بغیر بات نہیں بنتی۔ بغیر وجود کے جود کیسے ہو۔ ہاں شمس تک وجودی رسائی کس کس کے نصیب میں۔ البتہ چاند تو میسر ہے وہ بھی اس روشنی سے بنا ہوا ہے اور وجود کی تشفی بھی ہے۔ اس لئے بزرگوں نے کہا ہے کہ اویسیؒ طریقہ سے جو کچھ بھی تم کو ملا ہو یا ملتا رہے پھر بھی ایک وجود کے طالب ضرور بنو اور ہاتھ میں ہاتھ ضرور دو' تاکہ رابطہ ءجُود قائم ہو جائے۔ یہ رابطہ ایسا ہے جیسے کہ دو مومن مسلم دوش بدوش چلتے ہیں کسی متعین مقصود اور منزل کی طرف۔ اس طریقہ میں ولایت اور نبوت دونوں کا پرتو ہے۔ نہ کوئی بڑا ہے نہ چھوٹا ہے۔ سب بھائی ہیں' دوش بدوش چل رہے ہیں۔ جب غیریت کے پردے اُٹھ جائیں تب دوش بدوش چلتے ہیں۔ یہ مومن کی نشانی ہے۔ دوش بدوش چلنے کا مزہ ان سے پوچھو جو چلتے ہیں۔ اسے زوج کی اصطلاح میں ساتھی کہتے ہیں۔ یہ دوستی سے بھی اونچی چیز ہے اور اس میں بے پناہ محرک قوت ہے۔ بقول علیؓ شیر خدا کے تم خود اپنے وجود پہ غور کرو اور فکر کرو تو کائنات کا کوئی ایسا رمز یا راز نہیں جو آشکار نہ ہو جائے۔ دو آنکھیں دیں تم دیکھتے ایک ہو' دو کان دئے تم سنتے ایک ہو' دو ہاتھ دُعا کے لئے اٹھتے ہیں اور ایک ہی مخاطب ہوتے ہیں' دو پیر دیئے اور ایک ہی منزل کی طرف گامزن ہیں۔ اسی طرح ناک کے دو نتھنے ہیں اور سونگھتے ایک ہیں تو پھر یہ دو کیوں۔ سائنس دان کہتے ہیں کہ اگر پیدائشی ایک آنکھ سے دیکھے یا ایک کان سے سنے تو دیکھ بھی لیتے ہیں اور سن بھی لیتے ہیں' مگر ایسے جیسے کہ ایک تصویر' سپاٹ' فاصلے کا اندازہ نہیں ہوتا۔ سہ جہتی اثر کے لئے دو آنکھیں' دو کانوں کا ہونا ضروری ہے۔ انسان کے جسم میں تین اور چیزیں ہیں جو اکائی میں ہیں' زبان' قلب' اور عُضو' جب پتہ پتہ سے لے کر ملائک تک تحلیل و تسبیح میں ہیں تو کیا ہم ان سے بھی گئے گزرے ہیں کہ زبان سے صدق کے علاوہ کوئی اور چیز بھی نکلے' قلب' بقول حسینؓ' کے مسافر خانہ نہ ہو بلکہ کسی کا گھر بنا ہوا ہو تو واحد کی وحدت کو نبھانے کا یہی متحمل ہو سکتا ہے۔ یہی وحدانیت کے پہلو میں اِقرَار بِاللِّسَان وَتَصدِیق بِالقَلبْ' ایک صفتِ حقیقت ہے' ایک صفتِ ذات۔ رہا عُضو' تو یہ بہت بڑی نشانی ہے توحیدِ زمانی کی' کہ زندگی میں کتنی ہی کثرت ہو حَیُّ اور حیات ایک ہے۔

انسان کے اندر جو نفس یا ابلیسی صفات ہیں اور رُوح کی جو ملکوتی صفات ہیں' یہ مقناطیس کے دو قُطب کی طرح ہے کہ ایک کبھی نہیں رہ سکتا۔ زندگی دو قُطبی ہے' اسی لیے زوجین قرآن میں آیا ہے۔ ان دونوں کی میزان زندگی ہے' جس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ مگر ہماری توجہ کبھی مثبت صفات پر ہوتی ہے' کبھی منفی پر۔ میزان قائم کرنے پر نہ فکر کرتے ہیں' نہ عمل۔ انسان کی دوسرے حیوانوں پر فضیلت اس لئے ہے کہ دماغ' قلب' روح کی صلاحیتیں بخش کر ایک امتیازی شرف ملا ہے۔ نفس کل کی دنیا میں کیا رکھا ہے۔ قلب و روح کی دنیا میں اُٹھیں تو اسماء و صفات کی تجلیوں میں آئیں۔ اسی انسانی زندگی میں اسماء و صفات کا رمز پانے کے لئے طبق در طبق اپنے وجود پر غور کریں۔ یہ طبق سات ہیں۔

۱ ۲ ۳ ۴ ۵ ۶

۷ اور اٹھواں حقیقت غیب

مادہ

مادہ توانائی جان قلب رُوح روح اعظم سر خفی اخفاب کا نکتہ ہُولاہوت

اسی طرح اَلحمَد میں سات طبق ہیں اور آٹھواں بھی سبع صفات کا کُن فکان' تحت العرش' فوق الارض یہی سات صفات ہیں۔ قطب عالم ان ہی سات سے مزین ہے۔ اسماء کا رمز اور کیف پانے کے لئے ایک انسان کی مثال لیں۔ جب تک اس کا نام نہ معلوم ہو اسے (ھو) وہ کہہ کر اشارہ کرتے ہیں۔ اسم کو لیں تو کسی شخص کا نام اس کے تعارفِ شخصی' اس کی یکتائی کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ اور جب اسم با مُسمیٰ ہو تو اس کی خصوصیت شخصی اس کے ذریعہ بیان ہو رہی ہوتی ہے۔ اب وہ شخص سامنے ہو نہ ہو' اسم ہی اس کی نشاندہی کر رہا ہوتا ہے۔ یہ اس کا ذاتی اسم ہے۔ جب تک اس تک رسائی نہ ہو اسے اسی نام سے یاد کیا جاسکتا ہے۔ آمنا سامنا ہو تو نام بھی لینا بے ادبی ہے۔ اب اس اسم والے کی صفات اور خصوصیت بیان کرنی ہوں تو ان کے لئے دوسرے اسماء صفاتی کی ضرورت ہوتی ہے' جیسے دیکھنے والا' بولنے والا' سننے والا' زندہ' علم والا' قدرت والا' اِرادے والا'۔ پھر اس کی دوسری صفات بیان کریں تو نام بیشمار ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے خصوصی اسمائے صفاتی سات ہیں' حَیٌ عَلِیمٌ قَدِیرٌ مُرِیدٌ بَصِیرٌ سَمِیعٌ کَلِیمٌ اور کُل اسمائے حُسنیٰ 99 ہیں۔ یہی کچھ انسان کی ہستی میں بھی اپنی جھلک دے رہے ہیں آخر تو ہے نا' خَلِیفَتہ اللہ فِی الْاَرضِ۔ ایک نکتہ پر غور کریں کہ سبع صفات یا اسمائے حُسنیٰ میں سے کوئی ایک بھی صفت لی جائے جیسے دیکھنے والا' تو بغیر کسی وجودی شکل کے اس لفظ یا اس اسم کے کوئی معنی نہیں رہتے۔ حال ہی میں سید عبد الحلیم اثر نے حروفِ مقطعات پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ ان کو سریانی' پشتو' عبرانی زبانوں پر عبور ہے' اور کافی ریسرچ کے بعد انہوں نے اپنے مطالعہ کو موجودہ زمانے کے سامنے پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

حروفِ مقطعات

اس جگہ عبد الحلیم صاحب کی اجازت سے حروفِ مقطعات کے بارے میں کچھ بیان کر دینا بے جانہ ہو گا۔ ان کی نئی تحقیق کے مطابق حروفِ مقطعات کا تعلق سِریانی زبان سے ہے جو رُوح کی زبان ہے۔ اور اہل اسلام میں لوگ ان حروف سے واقف تھے' اسی لئے کفار نے نکتہ چینی نہ کی' گو ان کی نظر ان کے سطحی معنوں سے آگے نہ جاسکتی تھی۔ ان حروف کا مقطع ہونا خود اس بات کی دلیل ہے کہ ان میں سے ہر ایک حرف ایک با معنی کلمہ ہے' جس میں مختلف حسن معانی کا اظہار مختلف سطحوں پر ہے۔ عقل و نفس کی سطح لیں یا قلب و رُوح کی' تو ہر جگہ ان کی تجلی ایک تراشے ہوئے ہیرے کی طرح نظر آئے گی کہ اس کی ہزاروں سطحیں ہیں اور ہزاروں انوار۔ اِنکا حسن' انکا بانکپن' ان کا سراپا' ان کا کیف ایک عاشق کے لئے ہزاروں کنائوں' اشاروں اور گوہر معانی سے پُر ہے۔ اسی لئے کوئی بھی زبان ان کی تشریح سے قاصر ہے۔ ان ہی حروف کے رازِ سربستہ میں تجلیاتِ باری تعالیٰ کے انوار

بھی ہیں۔ ان ہی میں احسنِ تقویم کے باطنی حُسن وخوبی کی چمک دمک ہے۔ ان ہی میں اس ذاتِ گرامی سے نسبتوں کا اظہار ہو رہا ہے' جو ذاتِ باری کے بے شمار عنوانوں کا مظہر ہے صَلَّی اللّٰہُ عَلَیہِ وَسَلَّمَ۔ ان ہی حروفِ مقطعات سے وحدتِ وجود بہ کلی حسن شہود اپنی رعنائیوں کا کُنْ فَیَکُوْن کی صُورت میں اظہار کر رہا ہے۔ ان ہی مخفی الفاظ میں نور محمدیؐ کی تجلی ظاہر باطن کائنات میں بتائی جا رہی ہے۔ اس اندازِ بیان کو نہ کوئی دنیا کی زبان ادا کر سکتی ہے نہ عربی' عبرانی' نہ سریانی۔ یہ باتیں مقاماتِ رُوح' سرِ' خفی' اخفا سے تعلق رکھتی ہیں۔ اس لئے روح کی سریانی زبان کے ذریعہ ان کی طرف کچھ اشارے کئے جاسکتے تھے۔ ان کی فہم' ان کا عرفان تو کسی اور سطح سے ہونا تھا۔ یہ کم از کم وحدت الوجود کے کیف کی بات تھی۔ یہ عالم عشق وامر کی بات تھی' اس لئے الفاظ کے ذریعہ کیسے بیان ہوتی ہے۔ تب ہی تو ان حروف کے معانی نامحرموں کے لئے کیا حقیقت رکھ سکتے ہیں' گو محرموں کے لئے یہ ایک کھلا دیوان ہیں۔ ان حروفِ مقطعات کے گوہر معانی تو ان عُشاقان' ان شہسوارانِ توحید پر روشن ہیں' جو اپنا لئے گئے ہوں۔ یہ کلمات تو ان کے محبوبؐ کی شان اور توصیف کے بیان میں ہیں اور محبوبؐ کے ساتھ یکتائیت توحید حاصل ہونے کی وجہ سے خود ان پر وارد ہیں :۔

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا

میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

عبدالحلیم صاحب کے مطابق سریانی زبان میں ان حروف کے معانی دیکھے جائیں تو ایک ایک حرف ایک ایک کلمہ ہے' بیان ہے

حٰم۔ اشیاء کا احاطہ اور سب پر شمولیت کے' وہ اللہ جس نے بارش کے پانی کی طرح آیت آیت کر کے مُتواتر اور متوالی وحی کے ذریعہ نازل فرمایا ہے۔

طٰسم۔ گلا گھونٹنا حرام ہے۔ روشنی برسنے کو ہے۔ یہ ہیں واضح نوشتے کی آیتیں مگر تم شائد اپنا گلا گھونٹ لوگے اس لئے کہ لوگ ایمان نہیں لا رہے ہیں۔ ہم چاہیں گے تو آسمان سے ان پر ایسی آیت اُتاریں گے جس کے لئے ان کی گردنیں جھک جائینگی۔ اور یہ تو ہمیشہ ہوا ہے کہ لوگوں کے پاس جب بھی کوئی نصیحت آئی تو لوگ اس سے منہ موڑنے لگے۔ چنانچہ ان لوگوں نے بھی جھٹلایا۔ سو اب ان کے پاس اس کی خبریں آنے ہی کو ہیں جس کا یہ لوگ مذاق اُڑاتے ہیں۔

الٓمٓ۔ اوّل ہے' بزرگ ہے' واحد ہے' معبودِ حقیقی ہے' جسکی وحدانیت صحیفوں میں بیان کی گئی ہے۔ وہ جو کہ اپنی ذات میں ہوئیت واحدہ رکھنے والا احد ہے' واحد ہے' وَحْدَہٗ لَاشَرِیکَ ہے' وہ جس نے بارش کے پانی کی طرح آیت آیت کر کے متواتر اور متوالی وحی کے ذریعہ نازل فرمایا ہے۔

کٓھٰیٰعٓصٓ۔ اے میرے ذی عزت واحترام بندے' آپکو ان تمام لوگوں کی طرف' جو اس خلاء محشر میں جمع ہیں' ضرور جانا پڑے گا۔ ان انوار کے ساتھ جن سے ان کے وجود قائم ہیں تا کہ وہ آپ سے مستفیض ہوں۔ کیونکہ ان سب کا اصل مادّہ آپ ہی سے ہے۔

یہ اور دوسرے حروفِ مقطعات اپنے ظاہری معانی کی خوبی میں ہی کیا کم تھے۔ ان میں سے ہر ایک کے بعد آنے والی سُورتیں ان کی وضاحت کے طور پر ہی ہیں۔ مختصراً یوں سمجھ لیں کہ ان کے ذریعہ رُوح کو پیمانِ الست یاد دلایا گیا ہے۔ اس نورِ محمدیؐ سے جو جاری و ساری ہے۔ اس کی نسبت اور اُنسیت اور یکتائی وجود یاد دلائی گئی ہے ساتھ ہی اس کے جسم کی ظاہری اور باطنی خوبیوں کو پاک و صاف کر کے خَلِیفَتَہُ اللہِ فِی الاَرضِ کے مقام تک پہنچانے کی کوشش کی گئی ہے۔ ایک عاشق کے لئے اس سے زیادہ انعام و اکرام اور احسان کیا ہو سکتا تھا کہ وہ ظاہر' باطن اور ستّر ہزار پردوں میں بھی آپ محبوبؐ کا جلوہ دیکھ سکے۔

مصر کے مشہور صوفی بزرگ حضرت عبدالعزیز بن مسعود دباغؒ فرماتے ہیں' حروفِ مقطعات میں سے ہر حرف کے اسرار ہیں' ہر حرف کے سات اسرار ہیں جو معانیء سابقہ کی مناسبت سے پیدا ہوتے ہیں۔ نیز سات اسرار اور بھی ہیں جن سے عربی زبان کو مناسبت ہے' لیکن جب کلام غیر عربی ہو تو اسکے مناسب اور اسرار ہیں۔ خدا ہمیں مُحَمَّدٌ صَلَّی اللہُ عَلَیہِ وَسَلَّم کے طفیل توفیق اور علم دے۔ حضرت دباغؒ فرماتے ہیں کہ اہل کشف یہ بھی دیکھتے ہیں کہ سیّد الوجود سے نکل کر بادہء نور' نور کے ڈوروں کی شکل میں تمام مخلوق کی طرف جاری ہے اور انبیاء اور فرشتوں تک پھیلا ہوا ہے۔ اس طرح یہ اہل کشف استفادہ کی عجیب و غریب کیفیت کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ مثلاً ایک صالح شخص نے کھانے کے لئے روٹی کا ٹکڑا لیا اور اس میں وہ نعمت نظر آئی جو نبی آدم کو عطا کی گئی ہے۔ تو اس روٹی میں نور کا ڈورا نظر آیا۔ اس نے اس نور کا جو ڈورے اور دھاگے کی شکل میں نظر آ رہی تھی پیچھا کیا تو دیکھا کہ اس نور کے ڈورے سے جا ملا جو نورِ محمدیؐ سے جا ملا تھا۔ پھر دیکھا یہ نور کا ڈورا ایک ہے پھر تھوڑی دور تک جا کر ڈوروں کی متعدد شاخیں نکلنی شروع ہو گئیں۔ ہر شاخ اس نعمت سے ملی ہوئی تھی' جو ان ذرّات کو عطا کی گئی تھی۔

یہی بات اِسم کی ہے اور یہی صفت کی۔ اسی لئے تمام اسماء و صفات کے اظہار کی تابانی اسی نورِ محمدیؐ کے طفیل ہے۔ اس نورِ محمدیؐ کے اظہار کے لئے وجود کا ہونا ضروری ہے۔ خواہ وہ وجودِ انفرادی ہو یا وجودِ کُلی۔ اور یہ بھی ہے کہ کسی مظہر میں ان اسمائے صفات کا اظہار ایک وحدتِ کلی میں ہوتا ہے' ایک وحدت وجود میں' ایسی ہستی کے لئے۔ فرد کی سطح پر بھی وحدتِ وجود ہے اور کائنات عالم کے ذرّہ کی سطح پر عَلٰی کُلِّ شَیءٍ کی صورت میں بھی وحدتِ وجود۔ یہ نہ دیکھنے کی بات ہے' نہ سمجھنے اور تدبر کی۔ یہ ایک کیفیت کا سا انداز ہے جو وحدتِ کلی والے کو نصیب ہے۔ یہ وحدتِ وجود کا کیف ہے' کیسا پڑھنا پڑھانا' بس وہ تو' ہے' کی کیفیت ہے۔ نہ اس کے لئے الفاظ ہیں نہ اور کوئی بیان اور شُہود کی صورت۔

یوں کسی کو یاد کرو تو شکل سامنے آجاتی ہے۔ شکل بھی غائب تو اسم سے اس کی یاد ہو جاتی ہے۔ یادِ اُو سرمایہء ایمان بود۔ یاد کرتے کرتے اس کا رنگ اپنے میں سمانے لگتا ہے۔

اللہ اللہ گو کہ اللہ می شوی: ایں سخن حق است و اللہ می شوی

جب اسم کو سمو کر محبوبؐ کی ذات کو اپنے میں سمولیا تو شدّتِ ذکر میں محبوبؐ ہی اپنے میں بس گیا۔ جب تعینات کے پردے ہٹے تو 'مَیں' 'تُو' کا فرق اُٹھ گیا۔ سب نسبتیں اُٹھ گئیں۔ تو بس 'وہی ہے' 'غیر کی گنجائش کہاں۔ شِرک کون کرے' 'کس کا کرے' یہاں عشق نے اپنا سب کچھ بھسم کر ڈالا۔ باقی ہے تو محبوبؐ کی صورت یَبْقٰی وَجْہُ رَبِکَ۔ اس سے ایک قدم آگے دیکھنے والے کو بھی اپنا احساس نہیں ہے۔

نظارہ نظر میں شامل ہے۔ نظارہ میں شامل کوئی نہیں۔

بس ایک جلوے کی لطافت ہے' کیف ہے' مادّیت سے ماوراء۔ وحدتِ شہود ہے' وجود سے ماوراء یہاں صفات بھی غائب' اسماء بھی غائب' بس 'ہے' کی کیفیت ہے' لذت ہے۔ یہ تو رہیں حقیقت تک رسائی کی باتیں۔ مگر عام مسلمان کے لئے دین کی منزل پر شِدّت لانے کے لئے اسم گرامی نبیؐ کریم وہ سادہ نسخہ ہے جس کی حمیّت اور غیرت ہر کلمہ گو کے رگ وپے میں سمائی ہے۔ اسکی حُرمت وعزت کی خاطر وہ از خود رفتہ ہو کر سب کچھ قربان کر دیتا ہے۔ درود تاج اسی ذات مبارک سے شعوری اور لاشعوری رابطہ قائم کرانے کا ذریعہ ہے۔ مسلمان کو مِن حیثُ القوم' اسی درود تاج کو اپنی مشعل ہدایت واستعانت بناتا ہے۔ جتنی جس کے نصیب میں۔ یہ اور بات ہے کہ ہر سطح کے افراد کے لئے اس کی لطافتیں اور انوار جدا ہوں۔ مگر رحمت عالم ہے' بلا تخصیص ہے۔ فقراء کو توحید فکر اسی کے طفیل نصیب ہے' ایک والہانہ' عاشقانہ نسبت اور رابطہ ایک قلندر ہی جانتا ہے۔ ہر اِسم کی حقیقت اپنانا' ہر اِسم کی حقیقت کو سمونا' ہر اِسم کی حقیقت ہو جانا' قلندر ہی کا حصہ ہے۔ یہی جذبہء قلندرانہ کچھ نہ کچھ حد تک اس قوم کے رگ وپے میں صدیوں سے سمایا ہے۔ نبی کریمؐ پر ایمان کی یہ رحمت کُن' اسلام کے پیرویان کے لئے عام ہے۔ عقل کی دنیا سے نکل کر دل کی دنیا میں اسی حقیقت کو پا جانا ہے۔ فی زمانہ قوم کے لئے یہی ایک نصبُ العین اور رابطے کی بات ہے۔

باب۸

نجم الثاقب اُمّت

ہر شخص ہے ملّت کے مُقدّر کا ستارا

انسان کا مقام:۔

اُمّت کی وہ خونی شفق ختم ہوئی۔ رات کی پُر سکون تاریکیوں نے اپنے پُر کیف دامنوں میں تھکے ہاروں کو جگہ دی۔ اپنی آغوشِ شفقت ومحبّت میں اپنوں کو لپیٹا کہ سرد وگرم عالم کی بھٹی میں سے گزر جانے والوں کو اپنے اُوپر بھروسہ نصیب ہو۔ اور لو! وہ نجم الثاقب بھی اُفق پر اُبھر آیا۔ پُر کیف

شب میں اس کا حسن عالم افروز دل و جان کی گہرائیوں اور عالمِ امکان میں ایک ہی کیف' ایک ہی ہم آہنگی' ایک کیف سکُوت اندر باہر' ایک خشیتِ جمال' حسن کائنات ہیں۔ ایک سحر جیسا' ایک ایسی یکتائی وجود کہ دِل عاشق پکار اٹھے یہ میرا ہی تو حسن ہے جو اس ستارے میں دمک اٹھا ہے۔ یہ مجھ عروسِ اُمّت کی آئینہء زمان میں' جھلک ہی تو ہے جو اس ستارے کا رُوپ لے کر فلک میں دمک اٹھی ہے۔ اے دیکھنے والی آنکھ' اے چشم بصیرت اس کیف کو جو باہر ہے' اپنے اندر حجابوں میں جگہ دے اور اس کیف کو جو اندر ہے' بے نقاب کر کے باہر عالم امکان میں رونق بخش۔ یہ اندر باہر ایک ہی تو کیف ہے۔ باہر دیکھو تو اس ستارے پر آفتاب کی درخشانی ہی تو ہے جو یوں دمک دمک کر' غیب میں آفتاب کی موجودگی کا پتہ دے رہی ہے۔ اندر جھانکو تو اُمّت کی شب دیجور میں اُمّت کے رُوئے درخشاں کی جھلک ہے۔ باہر دیکھو تو ستارے کا حسن' اُمّت کے حسن کی رونمائی کر رہا ہے۔ وحدت کی فضا میں' رحمت کی تابانی کی جھلک دیکھو۔ یہ اپنا حسن باطن اُمّت کا حسن' نجم الثاقب' سب ایک ہی تو ہے۔ اس حسن مجمل کی تابانی اسی شمس حقیقت کی وجہ سے ہے' صَلَّی اللّٰہُ عَلَیہِ وَسَلَّمَ' جو اپنے باطن وجود میں درخشاں ہے۔ ہر مسلم مومن کے باطن میں اس کی تابانی ہے۔ اُمّتی ہونے کا شرف ہے تو اُمّت کے نجم الثاقب کو اپنے ہی باطن میں درخشاں دیکھو۔ صبح اسلام ہو کے رہے گی۔ لَارَیبَ فَیہ اُمّت کی صبح فروزاں آئے گی' ضرور آئے گی' ضرور آئے گی۔ صبح تو خیر آتی رہے گی۔ شک بھی کیا۔ یوں بھی اس نجم الثاقب اُمّت کا حسن ہی کیا کم ہے۔ اس سُہانی رات کا بھی تو لطف لو۔ دیکھو تو رُوئے تابانِ حقیقت کیسا اپنے قلب و جان و روح کو اپنی طرف کھینچ رہا ہے۔ بس عروسِ اُمّت کے حسن و جمال کی اسی شب عروسی میں آئینہ بندی ہونے والی ہے۔

نورِ محمدیؐ

بھیانک رات تو مہجور اور وہم و دُوئی میں گرفتار لوگوں کے لئے ہے۔ تم تو اپنے ہو چکے ہو' تمہارے محبّت کو تو سرِ میدان دیکھا جا چکا ہے' تمہارے ایمان کو تو سرِ مقتل' پابہ جولاں' سر بکف' کفن بر دوش پر کھا جا چکا ہے۔ تم تو آگ اور خون کے دریا سے گزرے ہو۔ قید و زنداں کی بھٹّی میں سے کندن بن کر نکلے ہو۔ تم تو وہ پارس پتھر ہو چکے ہو کہ مٹی کو بھی تمہارا لمس نصیب ہو جائے تو سونا بن جائے۔ ذرا وہم و دُوئی کے پردے چاک کر ڈالو۔ یہ نجم الثاقب تم ہی تو ہو' اپنے آئینہ باطن میں جھانکو' اپنے جمالِ ایمانی' اپنی عقل عین الیقینی کو دیکھو! کیسی پختہ یک رُخی لئے ہیں' نورِ نبوت سے سیراب ہیں' رحمتوں کے سائے میں ہیں' حَرِیصٌ عَلَیکُم بِالمُومِنِینَ رَءُوفٌ رَّحِیمٌ پر پورا بھروسہ کئے ہیں۔ تم پر تو مہر ولایت ثبت ہو چکی ہے۔ جب ان کی اُمّت ہو تو کیسی ذلت؟ کیسی خواری؟ تمہارے ساتھ جو ہونا تھا اس میں غیر کے دخل کی گنجائش کہاں تھی؟ چودھویں صدی میں آرائش و مشاطگئی باطن اسی طرح کرنی تھی۔ نئے انداز میں اُمّت کی تابناکی جلال و جمال ہونی تھی۔ مشیّت ایزدی اور رحمت رحمت لِّلعالمینی نے تو کبھی تمہارا ساتھ نہیں چھوڑا۔ زندہ و

پائندہ حقیقت کبھی بھی عالم امکان میں سبب اور نتیجہ کی پابند نہیں ہو سکتی تھی۔ یاد ہے جب ۶۵ء آیا' صبح بدر آئی تو قوم کس طرح کلمہ لَااِلٰہَ اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَسُولُ اللّٰہ کا پیکر بن کر میدانِ عمل میں صف آراء ہو گئی تھی۔ ابھی کل ہی کی تو بات ہے کہ عروسِ اُمت نے شہیدوں کے خون کی مہندی لگائی تھی۔ وہ صبح بدر جب قوم کی وحدت و یکتائی میں نبی کریمؐ، صحابہؓ، حسنینؓ' اولیائے کرامؒ تمہارے ساتھ ہی کھڑے تھے۔ جب شہدا' ملائک اور اجنا سے تمہاری غیبی امداد کی گئی تھی۔ اس غیبی امداد کا انداز بھی تمہیں یاد ہے؟ اس کی تصدیق خود مجاہدوں کے وجود دے رہے تھے کہ ابتدائی تین روز' دن رات جنگ میں لگے رہنے کے باوجود تمہارے بازئوں میں سے وہ عقل کو حیرت میں ڈال دینے والی قوت نکل رہی تھی۔ یہ تمہارا جوشِ ایمان تھا جو صدیوں تمہارے خون

میں نسلاً بعد نسلاً جاری و ساری رہا تھا۔ اور جو اس بات کا پکا ثبوت تھا کہ تمہارا رِشتہ اللہ ٗ رسولؐ اور اسلام سے ایک مضبوط وحدت کی ڈوری میں ہمیشہ بندھا رہا ہے۔ یہ وہ رشتہء باطنی تھا جو ساری مِلّت اسلامیہ میں اس وقت ظاہر کی سطح پر بھی آ گیا تھا۔ حق اور باطل کا یہی معرکہ بدر اگر ہزار بار بھی اسی طرح دہرایا جائے تو فطرت کے اصولوں کے مطابق یہی کامرانی ہر بار نصیب ہو۔ کیونکہ اس وقت قوم اسلام کی حفاظت میں سینہ سپر تھی اور اس ایمان کے ساتھ کہ کفر کی پھونکوں سے یہ چراغ کبھی نہ بجھ سکے گا۔

پھر ۱۷ء کی جنگ اُحد بھی آئی اور حوصلہ شکن شکست و صلح حدیبیہ بھی۔ مگر ظاہر کی شکست ٗ باطن کی فتح ہے ٗ فتح مبین ہے۔ اُمَّت کو پھر سے اپنے باطن میں قدم جمانے کا سبق ملا ہے۔ مرکزیت باطنی سے اپنی تقویت پانے کا راستہ ملا ہے۔ ظاہری سہاروں ٗ خواہشاتِ نفسانی ٗ مادی حرص و ہوا سے کنارہ کشی کر لینے کا غیرت مند اصول اپنایا ہے۔ اب کہیں آ کر حیا اور حیات کی قدر پہچانی ہے۔ قوم اور اُمَّت کی خاطر اپنی زندگیوں کا حق ادا کر دینا سیکھا ہے۔ اب چودھویں صدی کے خاتمے پر ہے۔ وقت کی میزان بھی وارداتِ جہان میں عجب ہوتی ہے۔ اس صدی کے ختم ہوتے ہوتے عروسِ اُمم جوانی کی منزل میں قدم رکھ چکی ہو گی۔ پہلے اُمَّت تھی ٗ اب اُمم کا سوال ہے۔ پہلے حیات تھی اب اَلحیات سے رابطہ ہے۔ العشق سے سابقہ ہے ٗ اِلاسلام کو زمانے میں پھیلنا ہے۔

راہِ فروغِ باطن

اُمَّت کے اسی الم نشرح کو اپنے باطن میں دیکھو ٗ اس صدی کا شرح صدر یہی ہے۔ اپنی اپنی منازل ٗ مقامات ٗ عاقبت ٗ آخرت کی فکر میں کب تک ٗ اب تو گروہ در گروہ عالم انسانیت میں صُور پھونکا جا رہا ہے۔ قیامت صُغریٰ یہ بھی تو ہے کہ اپنے جسموں میں چلتی پھرتی مردہ رُوحیں پھر سے حیات پا رہی ہیں ٗ جاگ رہی ہیں ٗ اُٹھ رہی ہیں۔ یومِ حساب ٗ اچھے برے کی چھانٹی خود بخود ہوتی جائے گی۔ تاریکی چھٹ کر روشنی پھیلتی جائے گی۔ قانونِ فطرت کے مطابق ہر نا اہل کی جگہ اہل کو ملتی جائے گی۔ اپنے اندر دیکھو کہ حقیقت کی روشنی ٗ کس انداز میں رفتہ رفتہ ہر گوشہء جسم و جان و قلب و روح میں پھیل چکی ہے۔ اُمَّت محمدیہؐ ایک ہے۔ ایک ہی جسم ہے۔ میرے تیرے کا سوال نہیں ٗ میری تیری خرابیوں ٗ اچھائیوں کا سوال نہیں۔ جسم کے سب اعضاء ایک جیسے نہیں ہوتے ٗ ہر ایک اپنی انفرادیت لئے مگر سب ایک ہی یکتائیت ہیں۔ اپنا ذاتی خیال چھوڑ کر اپنے باطن میں کلمہء لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہُ مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللہ کی تابانی دیکھو۔ حسن اُمَّت کی جھلک تمہارے اندر ہی مل جائے گی۔ اس آئینہء توحید میں دیکھو گے تو اندازہ ہو گا کہ خود وہی ہے۔

خود کوزہ و خود کوزہ گر و خود گل کوزہ!!

تم لا اور غیر کی طرف نظر کیوں رکھو۔ وہ تو خود بخود مٹنے والا ہے۔ اندھیرے ہٹانے کی کوشش میں کیوں پاگل بنو۔ روشنی کی طرف نظر رکھو ٗ بھروسہ رکھو ٗ روشنی خود پھیل کر رہے گی۔ باطنی روشنی کا پردہ تو تمہارے ظاہر کے اختیار نے کر رکھا ہے۔ اپنے کو بے اختیار کر دو۔ تمہاری باطنی روشنی کو پھیلنے کی راہ مل جائے گی۔ یہ بے اختیاریء عشق ہی کا شیوہ ہے۔ سب کچھ یار کا۔ بس تجلی دیکھ لی اور عاشق ہو گئے۔ اپنا سب کچھ یار کے قدموں میں لا

ڈالا۔ اپنا تھا بھی کیا۔ سب کچھ یار ہی کا تو تھا۔ اور یہ عشق بھی اسی کا تو نجم الثاب کو باہر دیکھو یا اندر' بات ایک ہی ہے۔ ظاہر' باطن کی تصدیق کرتا ہے۔ دونوں جُدا تو نہیں۔ ایک ہی توحید تو ہے۔ عبدیّت بھی یہی ہے کہ ظاہر سجدۂ عاجزانہ میں' باطن کے آگے سرنگوں ہو جائے۔

اس صدی میں اُمّت کے فروغ کے لئے راہِ باطن ہی کھلی ہے' اسی طرف رجوع ہونا ہے۔ باطن میں وہ مرکزیت اب بھی حاصل ہے جو اسلام کی جان ہے۔ باطن کی راہ وہ یک رُخی ہے جو نورِ نبوت کی روشنی اپنے اندر پا جانے کی بات ہے۔ یہ ایک بے ساختہ لگاؤ ہے۔ جوہر مسلمان کے خون میں نسلاً در نسلاً چلا آرہا ہے۔ اس کا تعلق نہ مجاہدوں سے ہے' نہ ریاضتوں سے۔ یہ ادھر ہی کے فضل و کرم کی بات ہے۔ چھوٹے چھوٹے آئینے جب بھی شمس نبوت کی طرف رُخ کر لیتے ہیں' تو بڑا آئینہ رحمت نشر کرنے لگتا ہے۔ اس کی تابانی اب عالم اسلام میں اس صبح اُمید کی بشارت دے رہی ہے کہ اسلام کا دن پھر سے طلوع ہونے والا ہے۔ حضورؐ کی زندہ حقیقت کا یقین نظر آنے لگے گی۔ یہ اپنے اپنے ایمان اور بھروسے کی بات ہے۔ اسی کے وسیلہ سے فروغِ عمل کی راہ کشادہ نظر آرہی ہے۔

نصبُ العین' جہاد

حقیقت محمدیؐ رحمت لِّلعَالَمِیْنی کا یہ تصور یا تخیل صرف جذباتی حد تک کی بات نہیں ہے۔ یہ ٹھوس زندہ حقیقت ہے جو مرکز عشق کے طفیل قوم کو نصیب ہے۔ جب دائم قائم نصبُ العین قوم کو میسر ہے تو پھر زوال کی تو اب گنجائش نہیں رہتی۔ ماضی کو نصب العین بنالینا غلط تھا۔ نصبُ العین تو حال اور مستقبل کی بات ہے جس پر عالم اسلام گامزن ہو چکا ہے۔ چاروں طرف تاریکی چھٹ رہی ہے۔ قوم نے زندگی کی حقیقت کو قومی زندگی کے حصول میں پالیا ہے۔ جہاد' قربانی اور شہادت کو اپنی حمیت قومی بنالینا سیکھ لیا ہے۔ یار کے نام' ناموسِ رسول' عزت اسلام کی خاطر فدا ہو جانے کی اب قدر پالی ہے۔ اب ان کے پہاڑ جیسے عزم کو نہ دنیا کی عیش طلبی' نہ اپنی جان بچا کر رکھنے کی ذلیل تمنا' نہ اقتصادی کش مکش' نفسا نفسی' نہ باطل کی مفسدانہ چالیں روک سکیں گی۔ لڑائیاں بھی ہاریں تو کیا' اپنا یقین تو نہیں ہارا۔ انہیں بالآخر اپنی کامیابی اور اسلام کے فروغ پر ایمان نصیب ہو رہا ہے۔ یہ یقین' اعتماد' اور بھروسہ ہی قوموں کی زندگی میں سب کچھ ہے۔ آج اسلام کو ہماری جانیں قربان کرنے کی اتنی ضرورت نہیں ہے جتنی کہ اس یقین' اعتماد اور بھروسے کی ہے کہ دین مبین اسلام کا فروغ ہو کر رہے گا۔ تائید غیبی ہمارے ساتھ ہے۔ رحمت عرصے سے بے تاب ہے کہ ناموسِ اسلام کی خاطر مسلمان میدانِ عمل میں آجائے' تو دو جہان کی نعمتیں اس کے دامن میں ڈال دی جائیں۔ اب وقت آگیا ہے۔ اللہ اور رسولؐ کے ناموس کی خاطر' مسلمان پھر سے میدان کارزار میں آگیا ہے۔ جب یہ ہے تو اللہ اور رسولؐ ساتھ ہی تو ہوں گے! کیا دشمن اور کیا اس کا ساز و سامان' گھبرانا کیا۔ جب کار سازِ عالم اور رحمت عالم کا ساتھ ہے تو کنکریوں سے بھی ہاتھی مارے جائیں گے۔ قادرِ مطلق کی قدرت کیا انسانی منصوبوں کے آگے مجبور محض ہے۔ مشرق وسطیٰ کی طرف نظر ڈالیں۔ جب دولت عثمانیہ کے ٹکڑے ٹکڑے ہوئے تو کس کا دل خون کے آنسو نہ رویا۔ بظاہر مغربی ممالک نے اسلام پر ضرب لگائی۔ اپنی جانب سے عرب قومیت کی بنیاد رکھی۔ آج دیکھیں وہی یورپ کا مردِ بیمار ترکی ایک مضبوط سلطنت ہے۔ وہی منتشر عرب ملک' ایک مستحکم' عرب قوم بن کر' ایک ہی جسم و جان ہو چکے ہیں۔ یہ جماعت بندی اور اب عرب اسرائیل جنگ پر عالم اسلام کی ہمدردی اسی باطنی جمعیت بندی قائم رہنے کا ثبوت ہے جو دولت عثمانیہ اور عالم اسلام کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جانے کے باوجود بھی قوم کو ایک مضبوط باطنی رشتہ میں جکڑے رہی۔ اب

یہی باطنی تعلق ایک ستارۂ درخشاں بن کر اُفقِ اُمّت پر روشن ہوا ہے۔ لیلائے شب کی محمل میں ایک نوعروس کے حسن کی رونمائی کر رہی ہے۔ جبین شب اُمّت پر نجم الثاقب ایک تابندہ گہر کی طرح چمک رہا ہے۔ ساری فطرت امّت کے حسن و جمال کی آئینہ داری کرتی نظر آرہی ہے۔ نجم الثاقب کی چمک دمک اور دل کی دھڑکن ایک ہی آہنگی میں ہیں۔ چشم حق بیں میں اس چمکدار ستارے کی ضیاء اور قلب میں حقیقت کی تجلیوں کا کیف' ایک ہی یکتائی میں ہیں۔ سارے کا سارا ماحول ایک ایسی پُر سکون یکتائی میں ہے' کہ دل سے اُمنگیں اُٹھ اُٹھ کر آسمان کے اس دُرِ یکتا کو بار بار چوم لیتی ہیں۔ قلب' چشم' ماحول' آسمان' زمین' تاریکی شب' نجم الثاقب ایک ہی موج حسن میں ہیں۔ آج فطرت بھی امّت کے عروج حسن کے ساتھ تجلی وحدت میں ہے۔ حیاتِ اُمّت کو جینے کا نیا معیار عطا ہوا ہے۔ فرد اور قوم نے اپنی قسمت کو دیکھ لیا ہے۔ الفروغ کو اپنا لیا ہے۔ تب ہی تو شمشیر ہاتھ میں لے کر میدانِ عمل میں اُتر آئی ہے۔ جہاد کے فرض کو اس زمانہ کا اوّلین فرض سمجھ لیا ہے۔ کمزور عربوں کو دیکھیں تو آج ان ہی کمزور ہاتھوں نے زور ید اللّٰہی کا ثبوت دیا ہے۔ اسرائیل کی مضبوط دفاعی باریو لائن جس پر اس کو ناز تھا' توڑ دی گئی۔ مستحکم مورچے تباہ کر دیے گئے۔ کنکریوں سے ہاتھیوں کو دھنکی ہوئی روئی کی طرح کر ڈالا گیا۔ اس کے پس پشت قادرِ مطلق کی قدرت ہی کار فرما ہے۔

انسانی منصوبوں کے آگے حق کب مجبورِ محض ہو سکتا تھا۔ آخر کو پتہ پتہ اس کے حکم کے بغیر حرکت نہیں کرتا۔ مرضیء الٰہی ہی عالم میں ہر جانب کار فرما نظر آتی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ثواب میں ان پیکرانِ ایمان کو بھی شامل کر لیا جاتا ہے جن میں توفیق ایمان و عمل بھی اسی کی عطا کردہ ہوتی ہے۔ مرضیء الٰہی کے ساتھ ساز گاریء عمل کی اسی قسم کی صورت ہوتی ہے۔ اچھے لوگ اچھے اعمال کی جانب رجوع ہوتے ہیں اور بُرے خود بخود تاریکیوں کی جانب۔ اور بڑھ بڑھ کر کوشش کرتے رہتے ہیں۔ بس نیت کا فرق ہے۔ مومن ہر عمل کو من جانب اللہ سمجھتا ہے اور لطف اُٹھاتا ہے۔ کافر ہر عمل کو اپنی جانب منسوب کرتا ہے اور خسارہ میں رہتا ہے۔

تم اللہ کی مرضی کو دیکھنا سیکھو۔ جب مرضیء الٰہی تمہارے حالات بدلنے کے لئے مقرر ہے' رحمت بے قرار ہے کہ جلد تر' تم انعام واِکرام کے مصداق بن جاؤ' تو اپنے قلوب میں ایمان کی روشنی میں تم سب کے سب جتھوں کے جتھے میدان عمل میں کیوں نہیں نکل آتے۔ تمہیں باطنی سطح پر ایک رشتہ میں مضبوطی کے ساتھ قائم بھی رکھا ہے۔ غیرت و حمیت اسلام کوٹ کوٹ کر تمہارے سینہ میں بھری ہے۔ جسم و جان' عقل و ہنر سب ہی خدا نے عطا کیا ہے اور ایسی بے نظیر عالمگیر جمعیت بندی اور اخوت تو کسی مذہب یا قوم کو عطا نہیں ہوئی' پھر ناامیدیوں میں کیوں گرفتار ہو؟ حساب کتاب کی دنیا میں کیوں پھنسے ہو؟ سبب اور نتیجہ کے جال میں کیوں الجھے ہو؟ دیکھو تو تمہاری ذرا سی کوشش اور وہ رحیم دس بار' دس گناہ اس کا پھل دیتا ہے۔ فَاذْ کُرُونِیْ اَذْکُرْکُمْ کسی اور دوسری قوم سے تو نہیں کہا گیا۔ اُدْعُونِی اَسْتَجِبْ لَکُمْ کہہ کر اپنی عطا کرنے کی تڑپ کا اظہار کسی سے بھی نہیں کیا گیا۔ تم ہی تو ہو جس سے فرمایا ہے نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْہِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِیْدِ۔ وَفِیْ اَنْفُسِکُمْ۔ ھُوَ مَعَکُمْ۔ اَیْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْہُ اللّٰہِ تو وہ تو ہر طرح تمہارے ساتھ ہیں۔ تم بھی اس کی تصدیق بسم اللہ کہہ کر ہر دم ہر آن' ہر عمل کے شروع میں کرتے ہو۔ ایک ہاتھ تمہارا ایک ان کا۔ تمہارا ظاہر میں' ان کا غیب میں۔ تمہارے باطن میں یہ تمہاری ساری مادّی' جسمانی' ذہنی' قلبی' رُوحانی پوشیدہ صلاحتیں اور قوتیں ان ہی کی تو ہیں۔ اور ظاہر میں تمہارے ہاتھوں پاؤں چلتے ہیں' عقل و ذہن کام کرتے ہیں' محبت اور عشق کی تجلی تمہاری زندگیوں پر پڑتی ہے' بصیرت روحانی عطا ہوتی ہے۔ سوائے اس کے ہے کیا' جو تمہارے ہی اندر موجود ہے۔ ظاہر باطن وہی

ہے۔ اوّل آخر وہی ہے۔ بس وہم دُوئی سے نکلے اور عمل کا میدان تمہارے آگے کشادہ ہوا۔ اس کے بعد نہ غم ہو گا نہ خوف' آخر کس چیز کا غم اور کس چیز کا خوف۔ جب سب کچھ اس ذاتِ حق کی حقیقت کے ساتھ ہم آہنگ ہو کر زندگی گزاری جا رہی ہے۔ یہ نا اُمیدیاں' یہ وہم' یہ کش مکش' یہ ابتلائیں سب کی سب اس وقت تک تھیں' اور ان کے لئے تھیں' وج ابھی اپنی انفرادیت سے ہی نہیں نکل سکے۔ اپنی 'میں' کے چکروں میں ہی گرفتار ہے۔

تم مجاہد ہو' تمہیں قدرت نے اپنے مقصد کی تکمیل کے لئے چُن لیا ہے۔ جیسا زمانہ ویسی کوشش۔ تمہیں تلواروں سے تاریکی کے پردے چاک کر کے اپنے لئے راہ نکالنی ہے۔ غازی یا شہید۔ اس کے علاوہ جمعیت کی صفوں میں دوسرے کی گنجائش نہ ہو گی۔ زمانہ کروٹ لے رہا ہے۔ نئی زندگی جنم لے رہی ہے۔ وہ پرانی قدریں سب ختم ہو جائیں گی جو زمانہ کا ساتھ نہ دے سکیں۔ ناکارہ انسانوں کی میدانِ جنگ و عمل میں کوئی گنجائش نہیں۔ وہ کاہ و گیاہ کی طرح خس و خاشاک کی طرح' صاف کر دیئے جائیں گے۔ اور جن کو حق نے منتخب کر لیا ہے ان کے ساتھ تو حق ہو گا۔ خواہ یہ زندگی ہو خواہ ابد الآباد کی زندگی۔ مومن ان مادی تخیلات' ان دنیوی زنجیروں سے کبھی کا آزاد ہو چکا ہوتا ہے۔ اس نے جیتے جی اسی زندگی میں اُمّت کے جمعی رُوپ کی تابانی میں ابدی زندگی حاصل کر لی ہوتی۔ اس کی زندگی اس انفرادی جسم و جان کی زندگی نہیں رہتی۔

اس اُمّت کی منزل اِنّاللّٰہِ وَاِنّآاِلَیہِ رَاجِعُوْن ہے۔ شاہراہِ صراطِ مستقیم اس کے آگے کشادہ ہے کیونکہ تلوار کی دھار سے باریک پل صراط سے بار بار گذر چکی ہے۔ یہی اس کا نصبُ العین ہے۔

قانونِ قدرت ہے کہ قوموں کا عروج و زوال ہوتا ہے۔ اگر یہ زوال رُکا رہتا ہے تو صرف نصبُ العین سے فرد کی حد تک دیکھیں تو جن افراد میں کوئی نصبُ العین نہیں ہوتا تو بدن کے انحطاط کے ساتھ دماغ' جوش' روح سب ختم ہونی شروع ہو جاتی ہے۔ نصبُ العین والے دائم اور پائیدار' وہ حسن' خوبی' حق ہیں۔ اور ایسا بھی ہوتا ہے کہ کسی شخص میں نصبُ العین' عقل سلیم کی نظر میں ہوتا ہے' مگر گرفت میں نہیں ہوتا۔ اس حالت میں اس فرد کے نصبُ العین کو وجودی شکل دینے کے لئے کوئی مثبت چیز ہونی چاہیے۔ جیسے ذاتِ مبارک نبی کریمؐ۔ تاریخ دانی سے ہمیں جو نبی کریمؐ کا تصور ملتا ہے وہ ایک محدود جذباتی حد تک کی بات ہے۔ ٹھوس زندہ حقیقت نہیں۔ حضورؐ کی زندہ حقیقت کا' موجودگی کا شعور نہیں ہوتا۔ اس رحمت لِّلعالمین تک یہ پہنچ کسی وسیلے سے ہی ہو سکتی ہے۔ اور قوموں کی زندگی کے لئے فرد کی زندگی سے کہیں زیادہ بسیط انداز میں دائم قائم نصبُ العین کی ضرورت ہے۔ رحمت کا دامن قوم کو نصیب ہو جائے تب ہی کہیں پائدار فروغ کی راہ پر قدم رکھ سکتی ہے۔ کیونکہ جب اس رحمت کا یقین قوم کو ہو جائے تب ہی ایمان میں پختگی آتی ہے' اور فروغ عمل کی راہ کھلتی ہے۔ یوں اچھے اچھے فقراء جنہیں اپنے مقام کا پتہ بھی ہو' کبھی نفس سے لڑائی شروع کرتے ہیں' کبھی ظلمات میں گھِر جاتے ہیں' ظاہری باطنی جنگیں بھی لڑتے ہیں۔ مگر جنھیں رحمت کا دامن نصیب ہو جائے وہ پھولوں کی سیج میں رہتے ہیں۔ یہی اولیاء کی صف میں آ جاتے ہیں۔ یہ ایسا نسخہ ہے جس میں قسمت کو بھی دخل نہیں۔ ورنہ یوں چاہے رُوح میں بھی قیام ہو تب بھی نفع و نقصان سے نہیں نکلتے۔ رحمت ہی تقدیر پر غالب ہے۔ جب خوف و رجا سے نکل جائیں تب ہی راہ کھلتی ہے۔ رحمت کا دامن نصیب ہو جانا ایسی کیفیت ہے جب ذکر اندر سما کر رُوح کی غذا بن جائے پھر اس کا خون آنکھوں سے ٹپکے۔ یعنی صفات میں آ کر پھیلے تب بات ہے۔ یہی قلندری ہے۔ جب خوف و رجاء سے نکل جائے تب قلندر کہلاتا ہے۔ ایسوں کو ہی ایمان بالغیب نصیب ہوتا ہے۔ اور ایسا اعتماد جس میں شک کی گنجائش ہی نہیں رہتی۔ یہی لَاریبَ فِیہِ ہے۔ جو آنکھ بند کر

کے سر قربان کرنا جانتے ہیں۔ وہی مستی کی کیفیت میں' رحمتوں کے سائے میں ہوتے ہیں' دائم قائم خوبیوں میں بسے ہوتے ہیں۔ ان کی نظر ماضی سے ماوراء مستقبل کی طرف ہوتی ہے۔ اسلام نے بھی ماضی کی صرف مذہبی خوبیوں کو اپنایا اور حال اور مستقبل میں انسانی اعلیٰ اقدار' لطافتوں' ادب معاشیات وغیرہ کو نظر میں رکھا' اس لئے نصبُ العین پر نظر کسی نہ کسی طرح ہر زمانہ میں رہی اور باوجود باطل کی تمام کوششوں کے اسلام مٹ نہ سکا۔ گوبر ہمنیت یہودیت نے زر پرستی اور اقتصادیات کو بلند کر کے جگہ جگہ منافرت کا جذبہ اُبھارا اور اقتصادیات کی جدوجہد ہی نے دنیا میں کش مکشوں' جنگوں کا سلسلہ جاری رکھا۔

مگر اسلام کا نصبُ العین بہر حال یہ نہیں تھا کہ معیارِ زندگی بڑھایا جائے بلکہ سادہ بدوؤں کی طرح وہ غیرتِ اسلام تھا جس کی جانب مصلحین نے مختلف زمانوں میں قوم کو توجہ دلائی۔ اسلام کے نام پر جان دے دینا مسلم اور مومن کا شعار رہا۔ یہی وہ جذبہ تھا جس کو دیکھ کر دنیا کی دوسری قومیں مسلمان سے ڈرتی تھیں اور اسی جذبہ کو مختلف طرح سے ختم کر دینے کی صدیوں سے کوششیں اغیار نے کیں۔ مگر اب پھر سے تلواروں کے سائے میں مسلمانوں کو زندہ رہنے کا سبق مل رہا ہے۔ عالم مثال سے تو اسلام کے عروج کی لہریں چل پڑی ہیں۔ اس نوید کی بشارت تو بہت سوں کو ہو رہی ہے۔ صرف دیر یہی ہے کہ قوم بھی اس کے لئے تیار ہے کہ نہیں۔ کیونکہ وہی قومیں زندہ رہتی ہیں جو مرنا جانتی ہیں۔ لیمنگ تک جو صرف جانور ہیں اپنی نسل کو بچانے کی خاطر لاکھوں کی تعداد میں جانیں دے دیتے ہیں۔ یہ جذبہ کچھ اس قسم کی چیز ہے کہ اس میں خدا کی قسم نہ زاہد کی تمیز ہے نہ گنہگار کی۔ سب کے دلوں میں نور ہے کیونکہ ہم مسلمان پیدا ہوئے ہیں اور یہ بھی کتنی بڑی رحمت ہے کہ ہمیں مسلمان پیدا کیا۔ بس اتنی سی بات ہے کہ جو بھی رحمت کو محسوس کر کے نشر کرنے کی کوشش کرے گا وہ کامیاب ہو گا۔ یہ ہم میں سے ہر ایک کے لئے ہے۔ جتنا سادہ ہو وہی بہتر کر سکتا ہے۔ ورنہ علم کے جھول راستہ خراب کرتے ہیں۔ یہ ایک سیدھے سادے جٹ جیسے انسان کی بسم اللہ ہے وہ اونچ نیچ کے چکر میں نہیں پڑتا' بس یار پر فدا ہونا جانتا ہے۔ اُمّت کی راہ کھلنا بس اسی جذبہ بے اختیار کے تحت ہے۔ سراپا رحمت ہیں۔ اُمت کی حیاتِ تازہ' فتح مبین کی بشارت یہی کیفیت ہے جو عام ہونی ہے۔ باپ کی شفقت پر یقین رکھو۔ پردہ اٹھا دیا جائے تو اس محبت کو دیکھ کر کپڑے پھاڑ دو گے۔ سوچو تو کہ جب کبھی بھی ماں باپ بچے کو سزا دیتے ہیں تو ان پر کیا گزرتی ہے۔ اور انہیں کس جذبہ کے تحت ایسا کرنا پڑتا ہے۔ اس لئے کڑوے پر بھی دل سے الحمدللہ کہنا سیکھو اور ہر ابتلا' سختی اور آزمائش کے پیچھے محبّت پدری کو دیکھو۔ شکست تک کو فتح کی تیاری کے لئے رُخ دو۔ دیکھو تو کہ انسان جب اللہ کے نام پر جان دینے اُٹھتا ہے تو نشہء جہاد پر تو ہزار فقیری قلندری قربان۔ کیونکہ جہاد نہ ملک کی خاطر ہوتا ہے نہ قوم کی خاطر۔ بلکہ ایک جذبہ ہوتا ہے۔ اسلام کی خاطر جَذبَۃ مِنَ جَذبَاتُ الحُق۔ یہ جو مسلمانوں کی تکلیف پر 99 فی صد کو دکھ ہوتا ہے کتنی خوش نصیبی کی بات ہے۔

مسلمانوں سے تو اسوقت بس اتنی درخواست ہے کہ مثبت خیال رکھو۔ صرف یہی سوچو کہ فتح ہو۔ جان پیش کرنے کے ساتھ ساتھ یہ چیز بہتر ہے کہ اپنے حوصلے اور ایمان کو پیش کریں۔ جمعیت نے جب حیُّ وقیُّوم پر بھروسہ کر لیا تو فتح کا بغیر دیکھے یقین آ جانا مشکل نہ ہو گا۔ اس مثبت یقین سے بہت جلد بات بن جائے گی۔ ہماری قوم کے خون میں نور ہے۔ اس کو رحمت پر ایمان آ جائے تو بہت جلد چمک اُٹھے گی۔ ہمالیہ پہاڑ کو بھی اتنا یقین نہیں جتنا مجھے ہے کہ فتح ہماری ہے۔ خواہ لاکھ ہم تکا بوٹی ہو جائیں۔ یہ صرف ایمان کے بل بوتے پر نہیں کہہ رہا' بلکہ دیکھ کر کہہ رہا ہوں۔ دکھایا گیا ہے۔ یہ

عین الیقین سے بھی بڑی بات ہے۔ سب سے ایک عاجزانہ درخواست ہے کہ سب کے سب مل کے یقین کریں۔ بڑے مزے کا زمانہ آرہا ہے۔ حال اور قریب سے ذرا آگے مستقبل پر یقین رکھنا ہے۔ زندگی بس تلواروں کی جھنکار میں ہے۔ دل میں جو چاہے وہ ہو گا۔ منفی مت سوچو' مثبت پر نظر رکھو۔

۷۱ء کی جنگ میں شکست ہونے پر اچھے اچھوں نے آنکھیں نیچی کر لی ہیں۔ مگر اللہ تعالیٰ کا کُن جو ہے اس میں کیسی ذلت۔ کیا کوئی دشمن لات مارے تو ہائے کر کے بیٹھ جائیں گے یا غصہ میں اُٹھ کر اسے چار لات ماریں گے۔ یہ اچھا ہوا کہ ۶۵ء میں ایوب نے کہا تھا کہ ہم نے اپنا جوہر معلوم کر لیا ہے۔ اس وقت قوم کی نظر مثبت پہلو پر تھی۔ اب شکست میں ہم نے منفی پہلو معلوم کیا ہے' دونوں چیزیں ہونی چاہیے تھیں۔ لَااِلٰہَ اور اِلاَّاللّٰہُ تب ہی کلمہ پورا ہوتا ہے۔ اس شکست سے کس کا دل زخمی نہیں ہوا مگر ماحول کو دیکھتا ہوں تو ہر ایک میں ایسی صلاحیت اور طاقت ہے جو بے پناہ ہے' لاجواب ہے' اس کو رخ عطا کریں۔ یہ منحصر ہے' جن کے ہاتھوں میں باگ ہے۔ یہ ہو جائے تو بہت کچھ کر سکتے ہیں۔ اللہ نے پاکستان بخشا ہے۔ یہی اسلام کا جھنڈا بلند کرے گا۔ اسلام کی نشاطِ ثانیہ کا ذریعہ بنے گا۔ اللہ زندہ و پائندہ ہے تو ہم کیوں نہ مثبت نظر رکھیں۔ اپنے اندر پوشیدہ غیبی طاقتوں پر بھروسہ رکھیں۔ غیبی امداد کی بات یہ ہے کہ جو لوگ اپنی حدودِ جسم تک میں نظر رکھتے ہیں وہ فرائض زندگی تک محدود رہتے ہیں۔ مگر نوافل تو چار قدم آگے ہیں۔ جب سانحات و حادثات آتے ہیں تو یہ اثر پذیر ہوتے ہیں۔ جس نے نوافل کو بڑھایا اس کا دیکھنا' بولنا' پکڑنا' اللہ کا ہو جاتا ہے۔ ان حادثات کے وقت انسان عجیب عجیب کام کرتا ہے۔ حضرت علیؓ نے درِ خیبر اکھاڑا حالانکہ یہ انسان کا کام نہ تھا۔ کوئی اور طاقت اندر سے کام کر رہی تھی۔ سائنس دان کہتے ہیں کہ حادثات میں تلی اور جگر کا بے انتہا خزانہ عمل پذیر ہوتا ہے۔ یوں عام زندگی میں ہم ہزاروں حصہ بھی استعمال نہیں کرتے۔ اور دماغ کی بابت تو سائنس دانوں کا یہ کہنا ہے کہ ہم نے ابھی لاکھواں حصہ بھی اسکا معلوم نہیں کیا۔ یہ تو غیبی طاقت اپنے ہی اندر سے آتی ہے۔ چھوٹے بچوں تک نے اسی شدّت میں ابو جہل کو مارا تھا۔ یوں ہم سوا لاکھ بار آیۃ الکرسی پڑھیں تو فرشتے نہیں آتے۔ صرف اپنے کو جگانے سے سارے فرشتے اپنے میں سے آتے ہیں۔ اب اس انتظار کا وقت ختم ہوا کہ آسمان سے کوئی ہمدردی مدد کو آئیں گے۔

اب تو اپنی بے پناہ قوتوں پر نظر رکھنی ہے اور ان کو استعمال کرنا ہے۔ اپنی حقیقت انسان آپ پہچان لے تو پتّہ پتّہ' ذرّہ ذرّہ آپ کی معاونت کرتا ہے۔ پھر اپنے اندر کے فرشتے کیوں نہ کریں۔ ۶۵ء میں ہر ایک کے اندر باطنی صلاحیتیں جاگ اُٹھی تھیں۔ اپنا باطن جاگا تھا۔ غیبی امداد کے لئے ہاتھ اُٹھا کر دعا نہیں کرنی۔ گو اس کا بھی کچھ اثر ہوتا ہے۔ مگر اصل رمز کچھ اور ہے۔ کلمہ پڑھ کر روشنی اور جوش اپنے ہی اندر پا کر عمل پیرا ہونا ہے۔ پوری کی پوری قوم کو ایک جسم ایک جان بن کر ڈبونے کے لئے تو تھوڑے بھی کافی ہوتے ہیں۔ تم محبوبؐ سے شِدّت کا رابطہ قائم کر لو' دولتِ سرمدی تمہیں حاصل ہو

گی۔ اسی تعلق کو اپنی زندگیوں کا چراغ بنالو' ارے جب وہ دست کرم تم سے ہاتھ ملانے کے لئے بیتاب ہے تو تم بھی تو اپنے ہاتھ کو کچھ پاک و صاف کر کے سُبحَان سُبحَان کہتے ہوئے آگے بڑھو۔ ارے مر کر تو دیکھو' ھُوتُوقَبلَ اَن تَمُوتُو۔ اس جسم میں اگر کچھ بھی سُبحانیّت آگئی تو اپنے اُوپر فوری عاشق ہو جائو گے۔ یہ سمجھنے کی بات نہیں ہے۔ پکڑنے کی بات ہے۔

ذرا پہچانو تو کہ اللہ کی صفات گنوانے اور پڑھنے کے لئے ہیں یا اپنے اندر اُجاگر کرنے کے لئے؟ کسی چیز میں فنا کا امن لا ہو جانے میں ہے خواہ پتھر سے ہی عشق کیا ہو۔ اگر دُھن ایسی ہو کہ اس میں کھو جائے' فنا ہو جائے' تو سارے قوائے باطنی عمل پذیر ہو کر راہ کھولتے ہیں اور عمل اس کی تصویر بنتا چلا جاتا ہے۔ قومی حیات کے لئے جتنا جئے اتنا ہی قوم کی لا ہوتی جائے گی اور زمانے کے لحاظ سے راستے نظر آتے جائیں گے۔ کندن بننے کے لئے خون دینا ہی ہوتا ہے چونکہ قربانی کے پیدا کئے ہوئے مخصوص حالاتِ عجز میں رحمت کے ایسے طلب گار ہوتے ہیں کہ پا لیتے ہیں ورنہ آس و زعم دونوں رحمت کے دروازے کھلنے نہیں دیتے۔ اپنی غیرت' اپنے حوصلے' اپنی اُمیدیں' اپنی غیرت سب ٹوٹیں تب بھی بات نہیں بنتی جب تک ٹوٹنے والی چیز نہ ٹوٹے یعنی دل۔ دل جب ٹوٹتا ہے تو اس کے شگاف میں سے رحمت آتی ہے۔ رحمت کے تحت ہی صحیح جذبہ میں شِدّت آتی ہے۔ اور جب شدّت آ گئی تو ہار ماننے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ سب کچھ ہار جانے کے بعد بھی ایسا شخص ہِمّت نہیں ہارتا۔

فروغِ اسلام

اسلام کے فروغ کا منصوبہ اب شروع ہو رہا ہے۔ یقین اور مکمل اعتمادی اور شدّتِ طلب اگر چند میں بھی ہو تو کافی ہے۔ جو لوگ پہاڑ جیسا عزم رکھتے ہیں وہ توڑ جوڑ کے قائل نہیں ہوتے۔ یہ اسباب اور نتیجوں کے چکّروں میں پھنسے ہیں۔ صرف جذبے اور جوش میں نظر اور اعتماد مُسبّبُ الاسباب پر رکھتے ہیں۔ یہی ایمان اور یقین قوم کے لیڈروں میں ہونا ہے یا چند ایک میں یہ بھروسہ ہو تو پیروں میں لغزش کب آتی ہے؟۔ کسی گُمان' یا شک و شُبہ کا گزر ہی کب ہو سکتا ہے؟ تذبذب یا خوف کب پیدا ہو سکتا ہے؟ ان میں سے کسی کا بھی سوال ہی پیدا ہی نہیں ہوتا اور نہ ایسا کیسے ہو گا' اب کیا ہو گا؟ ایسا ہو تو کیا ہو اور ویسا ہو تو کیا ہو؟

ہم نے لڑائی ہاری تو کیا۔ جنگ اُحد بھی تو ہاری تھی اور صلح حدیبیہ بھی تو کی تھی مگر پھر کیا ہوا؟ اپنا یقین تو نہیں ہارا کہ بالآخر کامیابی ہے۔ اوروں کو پاکستان کے ختم ہونے کی باتیں کرنے دیجئے۔ آپ اپنا یقین مضبوط رکھیں اور اتنا مضبوط کہ دوسروں پر یہ آپ کی خود اعتمادی اور یقین اثر کر جائے۔ بالکل اسی طرح جیسا قرونِ اولیٰ میں مسلمانوں کا تھا۔ یہ یقین لوگوں تک پہنچا دینا ہے کہ اسلام کا بول بالا ضرور ہو گا۔ اور ضرور ہو گا۔ یہ ہر ایمان والے کا حصہ ہے۔ وقت ہے کہ جن لوگوں کا یقین اور ایمان چٹان جیسا ہو وہ لوگوں سے تعلق بنائیں اور ان میں یہ یقین پھیلائیں۔ قائد اعظم میں یہی بات تھی۔ اسی یقین کے سہارے آدھی جنگ انسان اسی وقت جیت لیتا ہے جب وہ یہ یقین کامل رکھتا ہے کہ فتح اس کی ہے۔ ایمان بالغیب یہی ہے کہ کامیابی سے پہلے یہ یقین ہو کہ کامیابی ہماری ہے' ورنہ دیکھ کر اور کامیابی کے وقت تو سب ہی ایمان لے آئیں گے۔ اب یہی یقین اور بھروسہ کہ اسلام کو سربُلند ہونا ہے ایک عرصہ دراز تک ہمیشہ قائم رکھنا ہے۔

سر سید کا صبر دیکھیں کہ غدر کی بربادی کے بعد' مسلمانوں کو اُٹھانے کے لئے کیسے صبر سے برسوں کوشش میں لگے رہے۔ انہیں یقین تھا کہ قوم اُٹھے گی۔ جھونپڑی میں ہی سکول کھول دیا اور برسوں اسی بھروسہ پر اور عزم اور یقین کے جذبے میں اپنے کام میں لگے رہے۔ اسی طرح ہم بھی ایک لمبی مارچ پر لگے ہیں۔ خصوصی واقعات سے پہلے جو جھلکیاں سی ملی ہیں ان میں یہی ہے کہ کیا ہند اور پاکستان بلکہ تمام نظامِ عالم میں ایک تبدیلی آنی ہے۔ سارے عالم میں تبدیلی ہوئی تو ہم بھی فائدے میں رہیں گے۔ اگر ایمان بالغیب نہ ہو سکے تو ایمان بالشہود۔ تھوڑا سا دیکھ کر کچھ نہ کچھ قوم کی ہمت

بڑھتی جائے گی۔ مسلمانو! حق کی طرف ہاتھ بڑھائو۔ اس میں نیک یا گنہگار کی بالکل تمیز نہیں۔ ہاتھ پیچھے ہٹانا تو ایسا ہے جیسے کہ اسلام کے خلاف جی رہے ہو۔ رحمت کے لئے کچھ اعلیٰ اقدار جیسے خدمت' محبّت' ایثار' قربانی' شہادت کا احسان ہو تو ہاتھ خود آگے بڑھنے لگتا ہے۔ چاروں طرف آگ اور خون بھی ہو تب بھی ''من و ساقی بہم سازیم'' کا انداز اپنائو۔ یار ساتھ ہے تو پھر ابتلائوں کو بھی جڑ سے اُکھیڑ کر پھینک دو۔ اتنا مضبوط ساتھ ہو تو پھر کیسی نا امیدیاں۔ آنکھ کھول کر دیکھو وہ روشن زمانہ آنے والا ہے کہ ہوش نہیں ہوں گے۔ خدا کی قسم آپ دیکھیں گے پورے پاکستان کے کونے کونے سے یہ ہوا اُٹھے گی۔ حق کے ارادوں' حق کی مشیّت پر پختہ ایمان مردوں کو ہوتا ہے۔ یوں کسی ایک فرد تک کو دیکھیں کہ جب کوئی اس کا گھر لوٹنے آئے تو کیسا بپھر کر لڑتا ہے۔ جب اسے اپنی کامیابی پر یقین ہوتا ہے تو جم کر لڑتا ہے۔ اور جب یقین ہی نہ ہو تو ڈھیلا پڑ کر چھوڑ دیتا ہے۔ اور غیبی امداد کے وسائل اور بھروسے ڈھونڈنے لگتا ہے۔ زِندہ قوموں کا تو پہاڑ جیسا حوصلہ اور ایمان ہوتا ہے۔ اسلام کے فروغ کا راز یہی پختہ ایمان رہا ہے کہ بالآخر فتح اُنکی ہے۔ مسلمان خدا کی مرضی کے تحت ہی مصروفِ عمل ہوتا ہے۔ فتح پر یہی یقین و ایمان اس مجاہدانہ عزم رکھنے والی قوم کا شیوہ رہا ہے۔ یہی وہ قوم ہے جو کاندھے پر کفن اور ہتھیلی پر سر رکھ کر اسلام کی حرمت کی خاطر بارہا میدانِ کارزار میں نکل چکی ہے۔ یہ وہی بے جھجک اور نڈر قوم ہے جس سے ہمیشہ اغیار تھراتے رہے ہیں۔ لِلّٰہِ الحَمَد کہ ایسی قوم کا نجم الثاقب اب پھر اُفق سے اُبھرا ہے۔ اس آیت اللہ پر قلب و جان و روح لبیک پکار اٹھے ہیں' جس کی باز گشت آج اُمّت کے ہر فرد کے باطن میں محسوس ہو رہی ہے۔

عام حُریّت کا جو دیکھا تھا خواب اِسلام نے

اے مسلماں آج تو اس خواب کی تعبیر دیکھ

باب۹

غم اُمّت

اُمّتِ واحدہ

اسلامی جماعت کو اُمّت واحدہ کے لقب سے نوازہ گیا۔ خیر اُمّت کا لقب عطا ہوا۔ اخوۃ کو اسلام کی بنیاد قرار دیا گیا۔ انسان کو انفرادیت کی نفسا نفسی سے ہٹا کر جمعیت کی وُسعتوں' جمعیت کی برکتوں میں فروغ کی راہ پر گامزن کیا۔ یہ عین فطرت کے قوانین کے مطابق بات تھی۔ جسمانی اور ذہنی سطح پر دیکھیں تو کہاں ایک فرد کی کوششیں اور کہاں جمعیت کا عمل' انفرادی کوششیں بس ایک زندگی تک ہی محدود رہ جانے کی بات ہوتی ہے اور جمعیت

کے عمل میں بے پناہ وُسعت کے علاوہ ایک دوام ہے' سلسلہء جاریہ کی بات ہے۔ اسی لئے صدقہء جاریہ کو بھی فضیلت دی گئی کہ حیاتِ قومی کی راہیں ہمیشہ کھلی رہیں۔ اس جمعی اندازِ حیات کی جانب قرآن نے بار بار اشارہ کیا ہے۔ سب کے سب مل کر اللہ کی رسّی کو مضبوط پکڑ لو۔ منتشر نہ ہو جائو۔ دعائیں تک جمعی انداز میں ہیں۔ اے اللہ ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں۔ اے اللہ ہم کو سیدھا راستہ دکھا۔ اے اللہ قومِ کافرین کے مقابلہ میں ہمیں نصرت عطا فرما۔ اے اللہ! ہم نے اپنے نفسوں پر ظلم کیا۔ یہ جمعیت کا احساس ہمارے دلوں میں راسخ کرنا کتنا بڑا احسان ہے۔ مسلمانوں کو رنگ' زبان' نسل کے تفرقوں اور انتشار سے بچا کر ایک کر دیا۔ یہ بتا کر کہ ہم نے سب کی تخلیق ایک نفس واحدہ سے کی' انسان کو انفرادی حیات کے تخیل سے ہٹا کر الحیات میں اعتقاد عطا کیا۔ قرآن کریم کی ہدایت کے ذریعہ بار بار قوانین فطرت' سنت الٰہی کے پیچھے جو ذات کار فرما ہے' اسکی طرف رجوع کیا۔ تا کہ انفرادیت کی شرک اور شیطنیت سے بچیں اور جمعیت میں وحدتِ تخلیق کو پائیں۔ نبیء کریمؐ نے فرمایا کہ اُمّت ایک جسم واحد کی طرح ہے کہ کسی ایک عُضو میں تکلیف ہو تو سارے جسم کو تکلیف

ہوتی ہے۔ یہ احساس ہی زندگی کی نشانی ہے۔ اگر ایک بھائی کی تکلیف سے ہم خود وہ تکلیف محسوس نہ کریں تو ہم اُمتی کب کہلا سکتے ہیں' حیادار کب کہلا سکتے ہیں۔ حیات اور حیا ہم معنی الفاظ ہیں۔ آخر نبیء کریمؐ جو پیٹ سے پتھر باندھ لیتے تھے' وہ کیا بات تھی۔ کیا نبیء کریمؐ کے پاس کھانے کو روٹی کا ٹکڑا نہ تھا۔ یہ اُمّت کا درد ہی تو تھا کہ بھوکوں کے خیال میں اپنے کو بھی ان کے ساتھ شریک کر لیتے تھے۔ اس دردِ اُمّت کی انتہا تو دیکھیں کہ معراج میں بھی اپنے مقامات' تجلیات اور انوار کی فکر نہیں' بلکہ وہاں بھی اُمتی اُمتی اور وہاں سے اُمّت کے لئے انعام' اَلصّلٰواۃُ معْراجَ المُؤمنین' باطنی جمعیت بندی کا' قلبی اور روحانی یگانگت پیدا ہو جانے کا انعام و اکرام اور اس تصدیق کے طور پر اظہارِ نماز۔

نبیء کریمؐ کی سب سے بڑی سُنت یہی دردِ اُمّت کا اپنانا ہے۔ اسی لئے تو ارشادات ہیں کہ ایک مومن کا قتل سارے عالم کا قتل ہے۔ جمعیت میں سے کسی ایک نے جمعیت کی بیخ کنی کی تو سب پر ابتلا آئی۔ کسی ایک نے نیکی کر دی تو سب پر رحمت آئی اور جنت تک میں ٹولیوں کی ٹولیوں میں داخل ہونے کی بشارت دی۔ رَحْمَتی وُسِعَ عَلٰی کُلِّ شیٍٔ فرما کر رحمت کو عام کر دیا۔ رحم' فضل' کرم سب جمعی انداز میں ہونا بتایا۔ بارش سب پر' سورج کا فیضان سب کے لئے۔ یہی ربُوبیت کا انداز ہے۔ اَلْخَلْقُ عَیَال اللہ۔ اس میں اچھے بُرے کی تمیز نہیں۔ اسلام نے اسی قانونِ خداوندی کو اپنا کر زمانہ کو رحمت کا پیغام دیا۔ دین کے پیرویان نے اسی جمعی انداز کو اپنا کر اپنا سب کچھ قوم کی خاطر قربان کر دیا۔ نہ دُعائیں صرف اپنے لئے رہیں' نہ عیش و آرام کی اشیاء کی تلاش صرف اپنے لئے رہی۔ ایثار' خدمت' محبّت' درگذر کو اپنی روز مرہ زندگی میں اپنا کر' رحمت کے سایوں میں ہونے کا عملی ثبوت دیا۔ دوسروں کا دُکھ درد اپنا کر' رحمت کے سایوں میں ہونے کا عملی ثبوت دیا۔ دُوسروں کا دکھ درد اپنا کر ہی اپنی ذہنی اور قلبی تسکین پائی: جس کام میں لگے سب کے سب نے آمنَّا وَصدَّقْنَا کہا۔ وقت جہاد آیا تو سب کے سب نے ایک دوسرے سے پیش قدمی کرنا سیکھا اور اپنا سر سب سے پہلے پیش کرنا چاہا۔ حیاتِ قومی کی یہی نشانی تھی۔ اُمّت واحدہ کی اس توحید کو سب نے پالیا۔ جمعیت کی اس توحید کو سر مستی میں بھی' عجز و عبودیت میں بھی' گویا ہر رنگ میں' اپنایا۔ یہ غلط فہمی کہ میں منفرد ہوں اور یکتا ہوں صرف نفس اور شعور کی وجہ سے تھا۔ جمعیت کے رنگ میں اُمّت پر یہ صداقت روشن ہو گئی کہ انسانی زندگی تو

صدہا نسلوں کے تسلسل کا نتیجہ ہے۔ فرد ختم ہوتا ہے مگر جمعیت برقرار رہتی ہے۔ کلمہء توحید کیا پڑھا کہ خود جماعت کی جماعت کلمہء توحید بن گئی۔ ایک وحدت میں آگئی۔ کائنات تخلیق میں وحدتِ انسانیت کے مقصد سے آشنا ہوگئی۔ گویا انسانی جماعت نے اپنے شاہکار تخلیق ہونے کے مقام کو پالیا۔

وہ چیز جس نے اُمّت کو اجتماعیت بخشی وہ غم تھا جو انسان کو شاہکار تخلیق ہونے کی حیثیت سے عطا ہوا تھا اور وہ ایمان جو نبیء کریمؐ کی محبت کے طفیل انہیں عطا ہوا تھا۔ ان دونوں چیزوں کا تعلق انسان کے باطن سے ہے اسی لئے اَلاِسْلَام کا راستہ باطنی راستہ ہے۔ اور مومن ہونے کا تعلق باطن سے ہے۔ باطن کی دُنیا محبّت و عشق کی دنیا ہے۔ تخلیق عالم کی بناء محبّت ہے۔ ذرّہ ذرّہ کی فطرت میں ودیعت ہے۔ یہی فَاَحْبَبْتُ اَنْ اُعْرِفَ کے فرمان خداوندی کی بنا ہے۔ اسی حُب نے تخلیق کی صورت لی۔ تو یہی بنیادِ وجود پڑی۔ اجسام میں کشش، نباتات میں نمو، حیوانات میں تسلسل، نسل اور انسان میں عشق و محبّت کا اظہار اسی حُبِّ ازلی کے طفیل ہے۔ گویا یہی ہر ذرّہ کائنات کی ابتداء اور یہی انجام ہے۔ اسی حُب کے سہارے حق کی جانب سے رجوع ہے۔ یہی اِنَّالِلّٰہِ وَاِنَّااِلَیْہِ رَاجِعُوْن کی راہ ہے۔ اسکی تکمیل محبوبیت ہے۔ حسن کامل کا اظہار ہے۔ گویا عشق ہی جذبہء اولین ہے، عشق ہی بنائے وجود، عشق ہی تکمیل انسانیت ہے اور عشق ہی انجامِ آخر۔

عشق ذریعہء اِرتقائے باطن

اس عشق کی پہلی منزل، انفرادی حد تک عشق کی ہے۔ پھر فرد سے پھیل کر کائنات میں تجریدی رنگ میں اس عشق کا اظہار ہے اور آخر میں حقیقت تک رسائی ہے۔ مگر عشق کرنا کیسے سیکھا جائے۔ عاشقی کیسے پیدا ہو۔ اس عشق کا تفریدی رُوپ کونسا ہو اور کیسے سے محبّت کرے کہ تجریدی رنگ آئے۔ نسخہ سادہ سا بھی ہے اور آسان بھی۔ کسی شمس تبریزیؒ جیسے کا دامن ہاتھ میں آجائے تو وہ ذاتِ حق خود راستہ کھولتی ہے۔ بقول مولانا رومؒ شمس تبریزیؒ آفتاب ہیں، انوارِ حق ہیں، نورِ مطلق ہیں۔ تو جب نگاہِ کرم ہوگئی، اپنی تاریکیوں سے نکلے، باطن نورِ حق کی تابانی دینے لگا تو یہی جسم خاکی اب عشق کی مستیوں میں افلاک میں پھیلا۔ جب تجریدی رنگ اپنایا تو اشیاء کی ماہیت یہی عشق پائی۔ نے کی فریاد بھی یہی عشق، مے کا جوش بھی یہی عشق تفریدی رنگ میں یہی عشق مجنوں کا جنوں بنا اور یہی لیلیٰ کا حسن۔ تجریدی رنگ میں آئے تو معلوم ہوا کہ عشق اور حسن دونوں ہی اس حق کی تابانی ہیں۔ اب تجریدی رنگ میں ہر جگہ حسن رُخسارِ حق پایا جدھر رُخ کیا وَجْہُ رَبِّیْ کی تجلی ملی۔ یہاں تک کہ تجریدی رنگ میں پھیلتے پھیلتے اپنی حقیقت کو پایا۔ اب معلوم ہوا کہ یہ حسن رُخسارِ حق کی ہی جھلک ہے جس سے زندگی کی تابندگی ہے۔ وہی عشق کی وارفتگی میں نمایاں ہے۔ وہی حُسن کی جلوہ سامانیوں کی شان ہے۔ عاشق کے لئے بار بار مرنا ہی مرنا ہے۔ طرح طرح سے فِدا ہونا ہے۔ طرح طرح سے اپنی جان قربان کرنا ہے۔ فنا در فنا کی منازل سے نکل کر ہی بقا ہے۔ ہر فنا کے بعد رُوح کی نئی بقا ہے، اور نئی شکل ہے۔ یہ ارتقائے باطنی عشق کی زندگی میں ہی ممکن ہے۔ بقول مولانا رومؒ انسان جب جمادی سے مرا تو نباتی سے مر کر حیوان بنا، حیوان سے مر کر آدم۔ پھر آگے موت سے کیوں ڈرے۔ پھر آدمی بن کر جب موت آتی ہے تو فرشتوں کے بال و پر بھی اکھاڑ لیتا ہے۔ پھر دوبارہ ملکوتی حالت سے بھی قربان ہو کر وہ ہو جاتا ہے جس کا وہم بھی نہ آئے۔ اور بالآخر ارتقائے باطن کی منزل اِلَیْہِ رَاجِعُوْن کو جیتے جی فنا در فنا ہو کر پالیتا ہے۔ یہ ارتقائے باطن عشق کے سہارے ہی انسان کو نصیب ہوتا ہے۔ اور جذبہء شوقِ شہادت میں ایک آنِ واحد میں شہیدانِ منازل کو طے کر کے جاوداں ہو جاتا ہے۔ شہید میں انفرادیت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

حقا کہ بنائے لاالٰہ است حسینؓ

حق کی خاطر جمعیت کی حیات کی خاطر اپنے کو فدا کر دیتا ہے۔

فدائیت کی یہ شدّتیں اسی غم کے طفیل ہیں جو انسان میں فطری عطیہ ہیں۔ اور یہ غم رُوح میں اپنے اصل سے جدائی کا غم ہے جس کی جانب مولانا رومؒ نے فرمایا۔

بشنو از نے چوں حکایت می کند وز جُدائی ہا شکایت می کند

یہ رنج یا نا امیدی والی بات نہیں۔ بلکہ اس غم میں شدّتیں ہیں' حیات ہے پھیلاؤ ہے' حق پر قربان ہو جانے کا جذبہ ہے' خلقت میں پھیل جانے کا جذبہ ہے' پیکر محبّت وخوبی کے حضور نذرانہ پیش کرنے کا جذبہ ہے' اسی کی یاد برقرار رکھنے کا جذبہ ہے۔ یوں کسی مجازی محبوب کا غم بھی معمولی غم نہیں۔ اس کی اصل بھی تو وہی غم ہے جو روح کو اپنے اصل سے جدائی کی وجہ سے ہے۔ وہ ہجر' فراق' جدائی کی آگ' ستر ہزار بھٹیوں میں جلنے سے کیا کم ہے۔ اس میں کیوں وہ جھلس کے رہ جائے یا آنسو بہا بہا کر سراپا رنج بن کر رہ جائے۔ معبود سے شکوہ' محبوب سے شکوہ' خلقت سے شکوہ' تقدیر سے شکوہ۔ تو اس کا منفی پہلو اپنانے سے زندگی کو ختم ہو جانا ہے اور اس کا انجام بھی کچھ نہیں سوائے اس رنج کی آگ اور حق سے تعلق منقطع ہو جانے کے۔ اسی لئے خودکُشی کو حرام کہا۔ ایسے انسان کو اگر مثبت اقدام عطا کیا جائے' فدائیت' عشق ومحبّت' کے جذبہ کو خلقت میں پھیلانا سکھا دیا جائے شاعری' مُصوّری' موسیقی' آرٹ' ادب' باغبانی' صنعت وحرفت' حکمت وجِدّت' ریاضت' خدمت خلق' جہاد وغیرہ تو اس جذبہ کو اور پھیلنے کا موقع ملتا ہے اور دوام عطا ہوتا ہے۔

یہ ہے حُبِّ حق کی شان کا پرتو عالم خلق میں اور اسی کے سہارے زندگی انسانی کو عروج ہے۔ اور اگر ربُوبیّت کے پیکر کی مثال لیں تو جیسے ماں اپنے بچے کی جدائی میں بجائے گھل گھل کر مر جانے کے اپنے دوسرے بچوں یا دوسروں کے بچوں سے وہی شفقت برتے تو اپنے کلیجہ میں بھی ٹھنڈک محسوس کرتی رہتی ہے اور ربوبیت کی بھی ضامن بنی رہتی ہے۔ لہٰذا شانِ اِنسانیت یہی ہے کہ اس غم محبّت کو بجھنے نہ دے۔ بلکہ شمع کے سوز کی طرح اسے اپنی زندگی کا سوز وگداز بنالے اور دوسروں کے لئے نہ صرف روشنی بلکہ ربُوبیت ورحمت کا ضامن بن جائے۔ مردِ میدان وہی ہے جو اس خون کے دریا میں ڈوبے نہیں' پار نکلے۔ یہ مشکل کُشائی اور ہی کے کرم سے ہوتی ہے۔

غم اُمّت

اپنا غم بھول کر اُمّت کا غم اپنا کر کوئی دیکھے تو رحمت کے دروازے کھلیں۔ اس وقت معلوم ہو کہ اس زندگی میں حیات ہے۔ تسکین قلب ہے' پائندگی ہے۔ خالق کی نظروں سے خلقت کو' محبوب کی نظروں سے اُمّت کو دیکھے تو بے پناہ رحمت کی کارفرمائی اس کاروبارِ جہاں میں نظر آنے لگے گی۔ اس وقت معلوم ہو گا کہ جو خود رحمت عالم ہیں' اُنکی بے قراری اُمّت کے لئے کس شدّت کی ہے۔ ایک گڈریا تک اپنے گلّہ کا خیال دن رات رکھتا

ہے۔ کسی جانور کو تکلیف ہو تو راتوں پہلو بدلتا ہے۔ دیکھ بھال کے لئے پہروں جاگتا ہے۔ پھر جو رحمت عالم کو اپنا محبوب بنالے' اپنے ایمان کی صداقت دکھانا چاہے' وہ انکی بے قراری کو' جو اُمّت کے لئے تھی' کیسے نہ اپنائے گا۔

یہی تو اپنے محبوب سے محبّت کا ثبوت ہو سکتا ہے کہ دن کو انکی اُمّت کے کام کئے جائیں اور رات کو جاء نماز آنسوئوں سے تر ہو۔ یہی دردِ اُمّت تو ذکر و اذکار کا عملی پہلو ہے۔ بغیر عمل میں لائے' بغیر عملی اقدامات کئے اس جذبہ کو دوام اور پائیداری کہاں نصیب ہو سکتی ہے۔ یہی تو کلمہء طیبہؐ کی عملی تفسیر ہے۔ پہلے اپنی لا پھر خلقت میں اِلاَّ للّٰہ اس کے بعد رحمت کے انداز میں مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہ۔ اس غم میں یہ عالم جبرُوت اور رحمت کی بارش ہے۔ باطنی سُنت کا اظہار ان آنسوئوں سے ہوتا ہے۔ یہ بے اختیار آنسو، شکر کے آنسو' یاد کے آنسو' غم کے آنسو' رحمت محمدیؐ کے طفیل ہیں۔ روح و قلب کو ان آنسوئوں سے سکون ہے۔ کیسا شکوہ یا شکایت کا پہلو۔ یہ تو وہ دولت ہے کہ نعمت دو جہاں کے بدلے بھی انسان دینے کو تیار نہ ہو۔ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے رنگا رنگ کائنات بنائی' تشفی نہ ہوئی' شاہکار بنایا انسان' پھر اس پر خود عاشق ہو گیا۔ معشوق کو تحفہ دینا چاہا' ایسا کہ اس کی نظیر نہ ہو۔۔ ساری کائنات ڈھونڈھی ایسی چیز نہ ملی' اپنی صفات دیکھیں' وہ بھی اس میں تھیں۔ تھانہ آخر کو اللہ کی صورت پر۔ باہر کچھ نہ ملا تو اسی کے اندر جھانکا۔ وہاں غم تھا' غم جدائی جو ساری کائنات میں نہ تھا۔ یہ غم اسے نذرانہ دیا۔ دیکھیں تو انسان کے سارے کارہائے نمایاں اسی غم کی عکاسی کرتے ہیں۔ دیوانِ غالب پڑھیں یا مثنوی مولانا رومؒ، دونوں ہی اسی غم کی تفسیر ہیں۔ اس غم کو انفرادی سطح سے بلند کر کے غم اُمّت میں بدل دیں تو اس غم کو نئی وسعت ملتی ہے۔ اُمّت کا غم ایسا ہے جیسا شمع کے اندر سوز۔ اس شمع کی روشنی ماحول کو روشن کر دیتی ہے۔ یہ جان من جانِ عالم والی بات ہے۔ یہ یٰسین والا شربت ہے کہ پینے والا بھی لطف لے۔ یہ فِی عَیْنِہٖ بَکَاءٌ والی بات ہے' جس کی آنکھ میں آنسو نہیں وہ کیا۔ یہ اندر ہی اندر خاموش گھلتے رہنے والی بات نہیں بلکہ اندر ہی اندر خاموش شِدّتِ حیات کی بات ہے۔ فراق میں بھی وہی کیفیت ہے اور وصال میں بھی وہی کیفیت ہے۔ گویا عشق کے بیج کو خون کے آنسوئوں سے سینچا ہے۔

نِسبتِ محمدیؐ

یہ مقام جبروت ہے۔ حقیقت محمدیؐ تک رسائی ہے۔ جب یار گلے لگالے تب بھی شدّتوں میں اور زیادتی۔ جبروت خون کا دریا ہے بغیر بجھے ہوئے' بغیر مرے ہوئے اسے پار کرنا ہے۔ آپکے قلب میں کوئی بیٹھا ہے۔ اس پر اللہ نُوْرُ السَّمٰوٰت کا پرتو پڑے۔ پھر یہ نور زمین وجود پر چھلکے تو غم عشق کی چوکھٹ سے تیری آنکھ جبروت میں دیکھتی ہے۔ غم عشق کی بزخ کو جذب کر لے۔ مرے نہیں' پار نکلے' تب حَیٌّ وقَیُّوْم تک رسائی ہو سکتی ہے۔ یہ قَیُّوْم والا قیام' یہ حَیٌّ والی حیات' صحیح معنوں میں ایمان سے پیدا ہو سکتے ہیں اور ایمان کھلے معنوں میں نبی کریمؐ سے محبّت کا نام ہے۔ جیسا کہ حضورِ اکرمؐ نے فرمایا ایمان میری محبّت کا نام ہے اور مزید تصدیق کی کہ تم میں سے کوئی مومن نہیں ہو سکتا جب تک مجھے اپنی اولاد' اپنی جان سے زیادہ نہ چاہے۔ اب یہ نسبت محمدیؐ ہی کی بات ہے کہ غم اُمّت اپنے میں پیدا کرنے کے لئے ایکٹنگ ہی کر کے دیکھیں تو وہی رنگ چڑھ جاتا ہے۔ اور حضورؐ کی محبت تو لازماً اُمّت محمدیؐ سے محبت ہو جانا ہے۔ محبّت کا یہ رشتہ تو ہمارے خون میں ودیعت ہے۔ حضورؐ پر ایمان و محبّت کا ثبوت سوائے اس کے کیا ہو سکتا ہے کہ انکی سے تر ہوں۔ نبی کریمؐ کا غم ہم بھی اپنائیں' اسی سُنّت کو اپنائے ہوئے ہماری عبادت' بندگی' سب کچھ یہی گم اُمّت بن جائے۔ پھر دیکھیں کہ یہ غم کس کس طرح اللہ کے کرم یا نبی کریمؐ کی رحمت کو جذب کرتا ہے۔ محبّت و ایمان کی اس ہم آہنگی میں ہمیں بھی کچھ ایسی نسبت عطا ہو جائے گی اور معلوم ہو گا کہ کیوں

حضرت اویس قرنیؓ سے اُمّت کے لئے دعا کرنے کے لئے کہا گیا تھا۔ اگر ہم اپنی ریاضت ‘زہد و تقویٰ اور علم کے جھول اتار کر ننگے ہو جائیں گے ‘عاجز ہو جائیں‘ تو جیسے سورج کی روشنی میں جسم‘ وٹامن جذب کر لیتا ہے ایسے ہی ہماری عاجزی‘ ہمارا غم اُمّت‘ رحمت کو جذب کر لے گا۔ جمعیت کو نظر انداز کر کے پھر اللہ اور رسولؐ سے آس لگائے رکھنا کیا معنی‘ ایمان محبّت کامل کا دوسرا نام ہے۔ ایمان ہی حقیقت محمدیؐ کا ڈورا ہے جو ملکوت سے اوپر جبروت میں ملتا ہے۔ اس کے لئے عشق و محبّت کی برزخ کی آگ سے گذرنا ہے۔

غم دوست کو غم جہاں بنا کر پینا ہے۔ کرنے‘ رونے‘ سر ٹپکنے سے بھی یہ کام نہ ہو گا کہ رحمت نازل ہو۔ رحمت تو دو طرفہ بات ہے وہ بِسْمِ اللہ والا تعلق کہ ہر کام ہر قدم پر ساتھ۔ جب تک اس زندہ ساتھ کا احساس نہ رہے تعلق کیسے قائم ہو۔ جب تک کلمہء توحید کی توحید مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللہُ اپنے فکر و ہوش میں نہ سما جائے‘ محبّت کا رشتہ کیسے قائم ہو۔ ایمان کو کیا جلا ملے۔ محبّت ہی نورِ نبوت کی موجودگی کا احساس دلاتی ہے شَاھِداً وَّمُبَشِّراً وَّنَذِیْراً سے رُوشناس کراتی ہے۔ جب شمع محفل ہی اپنے دلوں سے بُجھا دی جائے تو کیا محفل جمے۔ جب تک دین کے پانچ ارکانِ توحید میں اس زندہ ساتھ کی عملی مشق نہ کی جائے‘ ایمان و محبّت میں تقویّت کہاں سے آئے۔ ہر نماز میں اَلسَّلَامُ عَلَیْکَ اَیُّھَا النَّبِیُّ اسی رابطہء محبّت کو اُستوار کرنے کی بات ہے۔ تم مجھے یاد کرو میں‘ تمہیں یاد کروں والی بات ہے۔ جب اِدھر سے یہ تعلق دن رات قائم رکھنے کی کوشش ہو تو دامن رحمت کیونکر نہ نصیب ہو گا۔ اُمتی ہونے کی حیثیت سے کئی ایک کو ملکر یہ حقیقت محمدیؐ کا ڈورا‘ یہ ایمان کا رشتہ مضبوط کرنا ہے۔ عشق و محبّت کی برزخ سے افراد ہی نہیں قومیں بھی گذر جاتی ہیں۔ اسی لئے سب کو اس میں خون صرف کرنا ہے۔ انفرادیّت سے نکل کر‘ اجتماعیت میں آجائیں تو قیام محبّت کو ملے گا۔ اسلام کے فروغ کی بناء یہی ایمان تو تھا جو سادہ لوح بدّو بھی محبوبؐ کے نام پر فِدا ہو جاتے تھے۔ ایمان کے لئے مرکزی شخصیّت کی ضرورت ہوتی ہے۔ ہمارا رشتہ محبوب سے ٹوٹا ہے۔ اور اپنے کو کلمہ گو کہتے ہیں حالانکہ اسلام کا پہلا قدم ہی وصل کے مقام سے شروع ہوتا ہے۔ جب تک یار ساتھ نہ ہو کیا کلمہ پڑھا‘ کیا عمل کیا۔ آج دیکھیں تو اسلام کے رُکن سچّے دل سے پیروی کرنے کے بعد بھی ملّت کی خواری ہے۔

بات یہ ہے کہ ایمان کو کوئی نہیں دیکھتا‘ محبّت کا تعلق قائم کرنے کی طرف کسی کی نظر نہیں جاتی۔ اور یہ محبّت کا تعلق اُستوار کرنے کے لئے غم اُمّت کو اپنانے کی طرف کسی کا خیال نہیں جاتا۔ اب گویا ہمارا مرکز سے رابطہ ٹوٹ گیا ہے۔ اسے اُستوار کرنے کی ضرورت ہے۔ ہمارا حال یہ ہو گیا ہے کہ اگر کوئی سختی آتی ہے تو پھر کہتے ہیں کہ بچالے گا۔ مگر وہ جذبہ کہ تیری خاطر جان دوں‘ کہاں ہے۔ پہلے جہاد کا نعرہ لگتا تو بیوی‘ روٹی سب کچھ چھوڑ کر جہاد میں شامل ہو جاتے تھے۔ آج یہ نہیں‘ رابطہ ہے تو بس اتنا کہ خیال مدینہ کی طرف چلا جاتا ہے۔ حالانکہ ان کا وجود‘ حقیقی وجود‘ رحمت کا روپ ہے۔ جو ذرّہ ذرّہ میں نہاں اور عیاں ہے۔ اور یہی رحمت کا روپ بدرجہء اتم انسان میں موجود ہے۔ دل پاک ہوں‘ خلوص ہو‘ ایمان و محبّت کی جھلک ہو‘ تم آپس میں رفاقت کا دائرہ بڑھے گا۔ پھر قوم میں توحید فکر آجائے گی۔ اُمّت کا درد اپنانا ہر ایک کا شیوہ ہو جائے گا۔ حرمت و ناموس رسولؐ پر فدا ہو جانا ہر مسلمان سیکھ لے گا۔ وہم و گمان راستہ کھوٹا نہ کرینگے اور جس خود اعتمادی سے ایک سوار گھوڑے کو خندق پار کرانے کے لئے چھلانگ لگوا دیتا ہے‘ اسی ایمان‘ بھروسے اور خود اعتمادی سے یہ اُمّت اپنی راہ پر گامزن ہو جائے گی۔

نصبُ العین کا تعین

جس قوم نے محبوب کے نام فدا ہونا ہی سیکھ لیا اس کے لئے اس کا نصبُ العین تعین ہو گیا۔ یعنی غم اُمّت، دردِ اُمّت کو اپنایا، اس نصبُ العین میں دائم اقدار بھی ہیں، تسلسل بھی، حیات کی شدّتیں بھی، اس میں اعلیٰ اقدار و سنّتِ الٰہی سے ہم آہنگی بھی ہے اور رحمت کے نشر کا ذریعہ بھی۔ نظر عمیق سے دیکھا جاوے تو قانونِ قدرت ہے کہ قوموں کا عروج اور زوال ہوتا ہے۔ اگر یہ زوال رُکا رہتا ہے تو صرف نصبُ العین سے۔ فرد کی حد تک ہی دیکھیں تو جن افراد میں کوئی نصبُ العین نہیں ہوتا ان کے بدن کے اِنحطاط کے ساتھ دماغ میں جوش، رُوح، سب ختم ہونے شروع ہو جاتے ہیں۔ اور ایسا بھی ہوتا ہے کہ کسی شخص میں نصبُ العین جو ہے وہ عقل سلیم کی نظر میں تو ہوتا ہے مگر گرفت میں نہیں ہوتا۔ اس حالت میں اس فرد کے نصبُ العین کو مادی وجودی شکل میں عمل پیرائی دینے کے لئے کوئی مثبت چیز ہونی چاہئے، جیسے ذاتِ مبارک نبی کریم صَلَّی اَللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمُ۔ یوں صرف تاریخ دانی کے بل بوتا پر جو انسان کامل کا نصب العین یا تصور قائم ہوتا ہے وہ ایک محدود جذباتی حد تک کی بات رہ جاتی ہے۔ یعنی تصور یا تخیل ایک قسم کا ضرور ہوتا ہے۔ اور ذہنی اور قلبی لگاؤ سا بھی ہو جاتا ہے مگر ٹھوس زندہ حقیقت نہیں بنتا۔ حضورِ اکرمؐ کی زندہ حقیقت اور موجودگی کا نہ احساس ہوتا ہے، نہ شعور، نہ تجربہ۔ عشق کا راستہ کسی نورانی وسیلے سے حاصل ہو جائے، تب ہی کہیں حقیقت محمدیؐ تک رسائی ہو سکتی ہے اور ایک نسبت قائم ہو سکتی ہے۔ یہ تو رہی فرد کی حد تک کی بات۔

اس سے کہیں زیادہ بسیط انداز میں دائم قائم نصبُ العین کی ضرورت قوموں کی زندگی کے لئے ہوتی ہے۔ اس لئے جب رحمت کا دامن قوم کو نصیب ہو جائے تب ہی کہیں فروغ کی راہ کھل سکتی ہے۔ اور ظاہر ہے کہ رحمت کا دامن اسی وقت نصیب ہو گا جب حضورؐ کی زندہ حقیقت کا یقین قوم کو نصیب ہو۔ اس نکتہ پر جتنا بھی سوچیں تو اپنے زوال اور پستی کا راز سمجھ میں آجائے گا۔ بات لے دے کے ایمان کی رہ جاتی ہے اور ایمان ان ہی معنوں میں کہ 'ایمان میری محبّت کا نام ہے'۔ جس نے بسم اللہ ہی سے دامن رحمت پکڑا وہ رحمت میں رہے گا۔ کلمہ پڑھ کر اپنے محبوبؐ پر ایمان لانے کی تصدیق کرے گا۔ ان پر فدا ہو جانے کے لئے بے قرار ہو گا۔ یہی ولایت و قرب ہے جو سادہ لوح بدّوؤں تک کو حاصل تھی۔ اور یہی سادہ ایمان انکی زندگیوں کی سادگی اور شدّت بنا ہوا تھا۔ جس قوم نے محبوبؐ پر فدا ہو جانا اپنی زندگی کا نصبُ العین بنالیا اور انکی اُمّت کا غم اپنی زندگی کا چراغ بنالیا، اس کا مقابلہ پھر کونسی قوم کر سکتی تھی۔ لہٰذا یہ عشق نبی صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمُ ہی ایسا نسخہ ہے جس میں قسمت کا بھی دخل نہیں۔ یہی عشق تقدیر پر غالب ہے۔ یہی عشق، خوف اور رجا سے نکالتا ہے اور ایسا اعتماد بخشتا ہے کہ لَارَیْبَ فِی کوئی شک نہیں، وہم نہیں، گمان نہیں۔ گویا ایمان بالغیب کی کیفیت نصیب ہوتی ہے۔ عشق کی خود اعتمادی میں یقین ہوتا ہے کہ بامُراد رہیں گے۔ یہ وہی لوگ ہیں جو آنکھ بند کر کے سر قُربان کرنا جانتے ہیں۔

یوں ماضی کی اسلامی تاریخ کو ایک خیالی نصبُ العین بنا کر زندگیاں گذارنا اور اس میں راہِ فروغ ڈھونڈنا غلط ہے۔ نصبُ العین تو مستقبل کی بات ہے۔ انسانی ارتقاء میں بھی ایک اسٹیج ایسی آتی ہے کہ اصل سے کوئی ظاہری تعلق نہیں رہتا۔ جیسے دو چیزیں جو اپنی اپنی اصلیت رکھتی ہیں ملانے سے ایک نیا مرکب بن جاتا ہے جو اپنی خصوصیت آپ رکھتا ہے۔ اسی طرح انسانی ارتقاء کا حال ہے۔ یہ اِرتقاء تو حضرت آدمؑ کے زمانہ سے چلا آرہا ہے اور اسلام فی زمانہ کوئی نئی چیز نہیں ہے۔ اسلام نے انبیائے سابقین کے زمانوں میں اپنی اِرتقائی منازل طے کیں۔ ان تمام اِرتقائی مدارج میں ان تمام اعلیٰ اقدارِ انسانیت کو اپناتا رہا جو انسانی ادب، معاشیات اور لطافتوں کی آئینہ داری کرتی ہیں۔ آج ہم اسلامی نظریہ کی بات کرتے ہیں۔ کسی کے نزدیک اسلام

ایک دیرینہ سماجی، معاشرتی نظامِ حیات ہے، جس میں ارکانِ دین کی پابندی شامل ہے اور اسلامی زندگی ایک اپنی علیحدہ تہذیب ہے۔ مگر تہذیب تو دین نہیں ہو سکتی۔ تہذیب کا تعلق ظاہری زندگی سے ہے، دین کا باطنی کیفیت سے۔ باطن میں کیا ہے اس سے ظاہر پرستوں کو کوئی مطلب نہیں۔ انکی نظر صرف باہر کے لیبل پر ہے۔ اندر کیا ہے اس کی پرواہ نہیں۔

دین، شرع کا تعلق تو اپنے باطن سے ہے۔ عشق و ایمان سے ہے، اور اسی کے بل بوتا پر تو ظاہری زندگی میں بھی ایک شعور اور نکھار آتا ہے۔ دین کی جان تو جمعیت بندی اور اخوۃ کے رشتہ کی بات ہے۔ اُمّت کا درد اور غم اُمّت سمو لینے کی بات ہے۔ تمام ارکان دین اسی رشتہء اخوۃ و محبت کو اُستوار کرنے کے لئے مقرر ہوئے ہیں جب باطن میں دین اپنا لیا، محبوبؐ اور انکی اُمّت کو صداقتِ قلب سے زندگیوں کا چراغ بنا لیا، تو نہ بے دلی سے ارکانِ دین ادا ہوں گے، نہ سوچ بچار کر کے عمل ہو گا۔ اعمال تو اس عشق و محبت کے جذبہ کے تحت خود بخود پھوٹ پھوٹ کر نکل رہے ہوتے ہیں، جیسے بچہ یا عزیز بیمار ہو تو غم خود بخود پھوٹ نکلتا ہے۔ دین محمدیؐ قبول کر کے اُمّت سے کم از کم اتنا رابطہ قائم ہو جانا لازمی بات ہے۔

غلبہء اِسلام، اخلاق سے

اِسلام کی بابت ایک اور نظریہ پیش کیا جاتا ہے۔ وہ یہ کہ اسلامی نظریہ، غلبہء اسلام ہے۔ دنیا میں پھیلنا، اپنی جغرافیائی حدوں کو توڑ کر دنیا کو مسخر کرنا۔ یہ نہ فطرت سے ہم آہنگی کی بات ہے نہ دائمی اقدار کی، نہ شرفِ انسانیت کی کہ طاقت کے بوتا پر اسلامی پیام دنیا کو پہنچایا جائے۔ نہ ہی اسلام نے معاشیات یا اقتصادیات کا نظریہ پیش کیا نہ کبھی انفرادی یا اجتماعی معاشی حالت کو بہتر بنانے اور اقتصادی مساوات قائم کرنے کو اتنی اہمیت دی کہ جمعیت کی نگاہیں مادیت کے جنجالوں میں پھنس کر رہ جائیں۔ نبیء پاکؐ نے تو یہ فرمایا تھا کہ میں اس لئے مبعوث کیا گیا ہوں کہ اخلاق کو تم تک پہنچاؤں۔ لہٰذا غلبہء اسلام تو اخلاق کو عام کر دینے کی بات تھی اور حضورؐ اکرمؐ خود مجسمہ ہیں اسلامی نظریہ کا۔ اس نظریہ کی وضاحت کرنا ہو تو حضورؐ کی زندگی کی وضاحت کریں۔ علماء کہتے ہیں کہ اسلامی نظریہ قرآن میں ہے۔ پھر بھی اس میں کئی معنی نکالتے ہیں اور آج تک ایک رائے قائم نہ کر سکے مگر حضورِ اکرمؐ کی زندگی میں تو کوئی دو معنی نہیں نکلتے اور اولین ایمان لانے والوں میں زیادہ تر جاہل بدّو تھے۔ علم، فلسفہ، نصبُ العین کا سوال ہی نہ تھا، مگر انہوں نے یہ نظریہ عملی طور پر زندگی گذار کر دکھا دیا۔ وہ یہ کہ اس سنت الٰہی کا بول بالا ہو جس کو نبیء پاکؐ نے رزم میں، بزم میں، خانگی زندگی، معاشرتی زندگی میں کر کے دکھایا۔ ان کا یہ فطری عمل اس لئے تھا کہ نبیء کریمؐ کی محبّت میں انکے دل، دماغ، خیالات، عمل سب ایک ہی رُخ ہو گئے تھے، انفرادی دُوئی کا وہم و گمان مٹ چکا تھا، وگرنہ اس دُوئی کی تو کروڑوں سال پرانی جڑیں ہیں۔ نسل انسانی میں یہ دُوئی مٹتی ہے اپنے کو کسی پیکر حسن و خوبی میں ضم کر دینے سے۔ یہ ان سادہ لوح لوگوں کو نبیء کریمؐ کی ذات میں میّسر آ گئی اور نبیء کریمؐ کی ذات سے ان کی توحید ہو گئی۔ جب وہ اس طرح اندر باہر ایک ہو گئے تو اعمال، خیالات ایک رُخ ہو گئے مگر یہ بھی عجیب کرم کی بات ہے کہ ایک دفعہ ہم ارادہ کر لیں کہ ہاں یہ ہونا چاہیے تو رحمت محمدیؐ کے طفیل یہ ہو جاتا ہے۔ یہ سب کچھ اِدھر ہی کا کرم ہے۔ وگرنہ کیا انسان، کیا اس کے مجاہدات اور ریاضتیں اور کیا اس کا عشق۔ دراصل یہ عشق کا نور، محبوبؐ سے ہی چلتا ہے اور ہمارے قلوب کو لپیٹ لیتا ہے۔ یہی نور عشق ہی کی بات تو تھی کہ عربوں کو سامان عیش اور دنیا کی آرائش، مجازی محبتیں میسر تھیں۔ حضورؐ نے ان چیزوں سے ان کو علیحدہ کر دیا۔ انکی ساری مادّی خوشیاں لے لیں۔ تب بھی وہ ان پر قربان ہوتے تھے۔ بات یہ تھی کہ نبیء کریمؐ نے انہیں اپنی محبّت

دے دی جس میں دوام تھا۔ اور انہوں نے اس محبّت کے صدقے میں مال' دولت' جان' آرام' بچے سب قربان کر دیئے۔ اب انہیں عارضی جسمانی خوشیوں کے عوض دائمی رُوحانی خوشیوں کی جھلک مل گئی تھی۔ انہوں نے جو دیا جسم کی خوشی تھی اور جو پایا رُوحانی خوشی تھی۔

قوم کی لوحِ محفوظ میں عشق متحرک ہے۔ ہماری قوم کی ڈی این اے چین' یا لوحِ محفوظ بہت اعلیٰ ہے۔ دردِ اُمّت غیرتِ اسلام' عشق محمدیؐ اس کے خون میں بسا ہے۔ دنیا نے اس کا مظاہرہ ۶۵ء کی جنگ میں دیکھ لیا تھا۔ فروغ اسلام کا بیج اسی جنگ میں پڑا تھا۔ قوم نے اپنا جوہر جان لیا۔ کلمہ لَاۤ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللّٰہِ کی حرمت میں ساری قوم ایک قالب ایک جان ہو گئی۔ صدیوں کے بعد قوم کے لئے شہادت کا دروازہ کھلا۔ اس وقت اپنی اپنی انفرادی فکروں سے نکل کر اُمّت کا درد دنیا بھر کے مسلمانوں کے قلوب میں اُبھر آیا۔ یہی کچھ بیت المقدس ہاتھ سے جانے پر ہوا۔ یہ غم اُمّت ہی نشانی ہے اپنے ایمان کی حیات کی۔ اسی طرح ۷۰ء کی شکست سے کس کا دل زخمی نہیں' کس کی آنکھیں عالم اسلام کی خاطر خون کے آنسو نہیں رو رہیں۔ یہ غم اُمّت ہی ہے جو آہستہ آہستہ عالم اسلام کے سینوں میں سُلگ رہا ہے۔ اس غم کا منفی پہلو تو یہ ہو گا کہ اپنی ابتلاء پر آنسو بہاتے رہیں' غیروں کی طرح کہتے رہیں کہ اب پاکستان ختم ہوا یا ربوبیت اور رحمت کے پہلوئوں سے قطع نظر کر کے یہ کہیں کہ ہم عذابِ الٰہی میں گرفتار ہیں جو لوگ رحمۃً لِّلعٰلمین کے دردِ اُمّت سے ناواقف ہیں وہ یہی کہیں گے کہ ہم سے خفا ہیں۔ مگر سوچیں کہ ماں جو بچے کو سزا دیتی ہے تو کیا اس میں بچے کی بھلائی مدِّ نظر نہیں ہوتی۔ محبّت میں صادق وہی ہے جو کڑوے پر بھی الحمد للہ کہے محبوبؐ سے اس حالت میں اور شدّت کا رابطہ قائم کرے' قصیدہ بُردہ شریف' نعت امام زین العابدین میں نہ اپنی فریاد ہے' نہ تکلیف کا اظہار بلکہ محبوبؐ سے شدّت کے رابطہ کا اظہار ہے۔ ہم بھی اپنی تکلیفوں اور سختیوں میں یہ محبّت کا رابطہ اور مضبوط کریں اور یہ بھی دیکھیں کہ سخت پتھر ہو' رُکاوٹ ہو تب ہی چھلانگ لگائی جاتی ہے۔ جب ہر طرف سے طوفان اُٹھ رہے ہوں تب ہی انسان عجیب عجیب کام کرتا ہے۔ حضرت علیؓ نے درئہ خیبر اکھاڑا یا چھوٹے بچوں نے ابو جہل کو مارا تو انسان کا تو کام نہ تھا۔ یہ غیبی طاقت اپنے اندر سے ہی آتی ہے۔ یہ فرشتوں کی امداد بھی اپنے ہی اندر سے وقت کی شدّتوں میں نکلتی ہے۔ ہم اپنے اندر سے رحمت کی ان بے پناہ قوتوں کو اُبھرتے دیکھیں تو مشیّت اپنے اندر سے ہی کارفرما نظر آئیگی۔

فَتْحٌ مُّبِیْن' لَارَیْبَ فِیْہِ

یہی یقین' اعتماد اور ایمان راسخ کی بات ہو جائے گی کہ محبوبؐ ساتھ ہی ہیں۔ ہم اپنا یقین اپنے کو خیر اُمّت ہونے پر کیوں نہ رکھیں۔ محبوبؐ سے اپنا اتنا مضبوط رابطہ کیوں نہ سمجھیں کہ دوسروں کو بھی اس خود اِعتمادی پر یقین آ جائے۔ ہم میں سے ہر ایمان والے کا کام ہے کہ یہ یقین لوگوں میں پہنچائیں کہ اسلام کا بول بالا ہو گا۔ یہ ایمان چٹان جیسا ہونا ہے۔ کامیابی سے پہلے فتح کامل کا یقین' اپنا ایمان بالغیب بن جائے۔ نظریں' سبب اور نتیجہ' توڑ جوڑ سے ہٹ کر مُسبّبُ الاسباب پر رکھنی ہیں۔ پھر دیکھیں کہ چند سال بعد اسلام کا وہ زمانہ آئے گا کہ آج تخیل میں نہیں آتا۔ لَارَیْبَ فِیْہِ' اسلام ہی زمانہ میں سربلند ہو گا۔ راہ ہموار ہو چکی ہے۔ عالم مثال میں بہت کچھ کیا جا چکا ہے۔ فتح مبین کی بشارت ہی نہیں بلکہ فتح مبین دکھا دی گئی ہے۔ اللہ نے پاکستان بخشا۔ یہی اسلام کا جھنڈا بلند کرے گا۔ دشمنوں کا غرور سب مٹے گا۔ انکے ہتھیار' انکے فریب کام نہ آئیں گے۔ اس یقین کو ایک عرصہء دراز تک قائم رکھنا ہے۔ صبر کا مقام یہی ہے کہ ثابت قدم ہو جائیں اس ایمان پر۔

اُمّت کے غم کو اس مثبت پہلو سے اپنائیں۔ اس اعتماد اور یقین کی روشنی پھیلائیں۔ فکر امت تازیائیہ عمل بنے گی۔ راستہ خود نکلے گا۔ اس اعتماد و یقین کو اپنے شعور کی سطح پر لے آئیں تو عمل کا میدان کُھل جائے گا۔ ماحول کو دیکھیں۔ ہر ایک میں ایسی صلاحیّت اور طاقت ہے جو بے پناہ ہے۔ لاجواب ہے' دوسروں پر بھروسہ کیا کرنا' خود اعتمادی تو ہم نے ۶۵ء میں سیکھ لی تھی۔ ہماری اندرونی طاقتیں جاگ اٹھیں تھیں۔ بِسمِ اللہ کہہ کر سب کلمہء شہادت کی غیرت بن گئے تھے بِسمِ اللہ ایک ہاتھ ہمارا ایک اس کا' دونوں ساتھ۔ من و ساقی والی بات۔ ہم نے اپنے زُعم' حوصلے' امیدوں یا طاقت پر بھروسہ نہیں کیا تھا' بلکہ عجز میں محبوبؐ کی محبّت اور غم اُمّت کو اپنا کر' اپنے ہاتھ میں یہ سُبحانیت پیدا کر لی تھی کہ ایک ہاتھ ہمارا ایک تیرا۔ ہم عاجز بن کر محبوب کی رحمت کے حقدار ہو گئے تھے۔ غم میں گھلنے کی بجائے ہم نے تلوار کی دھار پر زندہ رہنا سیکھ لیا تھا۔ ہم میں اس وقت وہی سادہ ایمان آ گیا تھا جو قرونِ اُولیٰ کے مسلمانوں میں تھا۔ اسی غم اُمّت' فکر اُمّت کو اپنا کر تو انہوں نے رحمتوں کے دامن تک رسائی کی تھی' محبوبؐ سے نسبت قائم تھی۔ اسی غم اُمّت کی شمع سوزاں سے اپنی حیات اور عالم کی حیات کو روشنی بخش کر خود زمانہ پر رحمت کی تجلی بن کر چھا گئے تھے۔

باب ۱۰

میں کیا کرُوں

فتح النَّفس

ہر انسان کا فطری سوال ہے "آخر میں کیا کروں؟" اس کا جواب خود اس کی اپنی فطرت' اپنے باطن سے آنا ہے۔ بیرونی سطح سے کسی قسم کا تعین نہ کوئی رُخ عطا کر سکتا ہے' نہ رہنمائی' نہ جذبہء عمل کو قیام۔ حیات و قیام اپنی ہی ذات میں ہے اور ان ہی کی بے ساختگی میں اسے عمل پیرا ہونا ہے۔ میں کون ہوں' کیا ہوں کی بھی انسان کو اتنی فکر نہیں جتنی کہ میں کیا کروں کی۔ کیا کروں کے ذریعہ ہی وہ کیا ہوں کا نشان پا سکتا ہے اور اپنے کردار ہی سے اپنا جائزہ لے سکتا ہے۔ یہ کروں کہ شِدّت وہی کُن ہے جو ذرّہ ذرّہ میں نمود کی بے تابی ہے۔ اس شدّت میں کروں کو نہ حد ہے' نہ تعین۔ ہے تو بس اتنا ہی کہ ہے' ہو رہا ہے' یا اس ہو رہا ہے سے بھی بے خبری۔ البتہ اس ہوش و حواس کی دنیا میں جسے ہم عالم مادّی کہتے ہی' یہ لازم ہے کہ تعینات کے آئینہ میں

ہی رُونمائی کر کے یہ فیصلہ کریں کہ میں کیا کروں۔ اس فیصلہ کو نہ اپنی فطرت سے کوئی غیریت ہو' نہ زندگی سے' نہ منازل اِرتقاء سے' نہ کائناتِ عالم سے۔ کائنات میں یکتائیت ہے' توازن ہے' میزانِ توحید ہے۔ خالق و مخلوق میں کوئی دُوئی نہیں۔ اسماء وصفات و مجردات میں اپنی اپنی یکتائیت ہے' مگر دُوئی نہیں۔ زوجین' ضِدین' ظواہر عالم میں اپنی اپنی انفرادیت ہے' مگر دُوئی نہیں۔ خود اپنے جسم کے مختلف اعضاء میں انفرادیت کے ساتھ یکتائیت توحید ہے۔ یہی حال اپنی ساری ظاہری اور باطنی صلاحیتوں کا ہے کہ زوجین ہیں' ضِدّین ہیں' مگر غیریّت نہیں۔ بات بس یک رُخی کی ہے۔ ہر شے کا مثبت پہلو دیکھیں اور پائیں۔ اِنعام واِکرام خداوندی پر نظر ہو نہ کہ اپنی نامرادیوں پر۔ اس طرح بندے اور مولیٰ کا لگاؤ قائم رہے تو شکرانہء زندگی ادا ہوتا رہے وگرنہ غیریّت ہو تو ہزار محرومیاں' ہزار پریشانیاں۔ عام انسان کی زندگی ہو یا خواص کی' حیوانی سطح کی زندگی ہو یا تہذیب یافتہ نفس کی' ہر بات ہر سطح کی ان ہی اِنعام واِکرام کی طرف نظر رکھنے سے بنتی ہے۔ یہ یک رُخی فطری طور پر ہر ایک بچہ میں ہوتی ہے۔ اسے شفقت پر بھروسہ میں ایک راہِ عمل ملتی ہے اور پروان چڑھتا ہے۔ بڑے ہونے پر جب بھی وہ ربُوبیّت سے رابطہ منقطع کر لیتا ہے تو محرومی و تاریکی وجمود میں گھِر جاتا ہے۔ شمس حقیقت کی موجودگی میں اپنی تاریکیوں اور ظلمتوں سے نکل کر اپنے رحمت کے احسان کو پانا ہوتا ہے ورنہ تاریکیوں میں ٹھوکریں کھاتا پھرتا ہے۔ رحمٰن سایوں میں ہر ذی ہوش کو خود اعتمادی نصیب ہوتی ہے۔ اور مراد کو پہنچتا ہے۔ رحمٰن سے نظر ہٹا کر اپنی 'میں' کے فریب میں پھنس جائے تو انجام کار نامرادی۔ رحمانیّت کی تجلی اور شیطنت کی ظلمت ہر انسان کے اپنے اندر ہے۔ رحمٰن کے اِنعام واِکرام کا شکر گزار ہوتے ہوئے وہ تکالیف میں بھی مطمئن زندگی گزارتا ہے وگرنہ اپنے شیاطین کے زیرِ اثر وہ نامرادیوں اور شکوہ شکایت میں دن گزارتا ہے۔

ایک سطحی نظر سے انسانی زندگی کو دیکھا جائے تو جسمانی مادّی تقاضوں کے حصول میں' اپنی حرص وہوس کی حد ہے نہ حساب' انجام اس کا بھی محرومی۔ لاکھ انسان اپنی جسمانی' ذہنی' نفسیاتی صلاحیتوں کو خود تربیت دے کر پوری شِدّت واِنہماک اور یک رُخی سے کام کرے تب بھی اسے نہ تو تسلی نصیب ہوتی ہے نہ تسکین۔ کیسی ناکامیاں بلکہ کامیابیاں ہوں تب بھی انسان کے اندر وہ سوال اپنی جگہ رہتا ہے کہ اور کیا کروں؟ یہ فتح النفس کیسے حاصل ہو۔ نفس کو دبانا' مارنا' یا فنا کرنا' تو گویا' فطری صلاحیتوں سے بیزاری' رُوگردانی اور اِنحراف ہے۔ اپنی بات ہو تو خیر' یہ تو خالق کے مقصد تخلیق تک سے گویا برسرِپیکار ہونا ہے' اپنے وجود تک سے مغائرت اور منافرت کا پہلو ہے۔ ہر فرد کے لئے بہر حال اپنا وجود ایک حقیقت ہے مگر دیکھنے میں یہی آیا کہ نفس اور مادّی سطح تک ہی اپنی زندگیوں کو محدود کر کے بہت سوں نے لاکھ ہاتھ پیر مارے' بڑے بڑے کارنامے کئے' مگر آج نہ ان کا پتہ ہے نہ ان کے کام کا پتہ' سوائے اس کے کہ ان کے فسانے زیب داستان ہو کر رہ گئے ہیں۔ یہی حال ان ریاضتوں اور مجاہدوں کا ہوا' جو رحمتوں کی تجلی نا پا سکے۔ تو اس ورطہء نفس میں گرفتار انسان کا یہ حال کہ جیتے جی بھی عذاب میں' اور مرنے کے بعد بھی عذاب میں۔ یہی حرص وہوس' حسد' بغض اور نامرادیوں کے سانپ اور بچھو ان کی رُوح اور لاشعور کے لئے سوہانِ جان بن گئے۔ بار بار اور لاکھ بار انہوں نے تسکین و تسلی کی تلاش میں ان کی کیفیات میں سے پھر سے گُذر کر دیکھا مگر اپنی آگ میں جلتے رہے۔ اس گردابِ فنا میں وہی عمل باعث تسکین فطرت نظر آئے جو دوسروں کے لئے فی سبیل اللہ کئے۔ یہی اعمال اپنے انجام کو پہنچے۔ اپنے نفس کی خاطر جو کچھ بھی کیا اس کی ناتمام تمنائیں عذابِ دائمی بن کر رہ گئیں۔

رب کی رحمت کی تلاش

اس گرداب سے وہی نکلے جنہیں رحمت کی تجلی ملی۔ انہوں نے رَبَّنَا ظَلَمْنَا اَنْفُسَنَا کا صحیح مصداق ہو کر یہ کہا ہے اے رب ہم نے اپنی فطری صلاحیتوں کا شکرانہ ادا نہ کر کے اور انہیں اعلیٰ مقاصد کے لئے بروئے کار نہ لا کر ان صلاحیتوں کے ساتھ بھی ناانصافی کی اور اپنے ساتھ بھی۔ ان فطری صلاحیتوں کے مزاج و خمیر میں جو پھیلنے اور بلند ہونے کی رحمت تھی' اس کی طرف توجہ نہ دی۔ اب توصیح توبہ کے معنی یہی ہیں کہ اس کے ذریعے نئے دروازے کھلیں۔ شکرانہ کے طور پر نئے عزم' نئے حوصلے کے تحت زندگی' اپنے مقرر کردہ اعلیٰ نصبُ العین کی طرف قدم رکھے۔ یہ رحمتوں کی شناسائی اپنے ہی اندر پانی ہے۔ یہ کُن کا پھیلاؤ جوشِ نمود ہے۔ اپنے حسن باطن کی خود آگہی کی پہلی جھلک ہے۔ دوسرے معنوں میں پہلی بِسْمِ اللہ ہے۔ ساتھ نام اللہ کے۔ تمام اسماء و صفات' خوبیوں اور صلاحیتوں پر بھروسہ ہے اور رحمت کو پہچانتے ہوئے ھُوَ مَعَکُم کا شکرانہ۔ اب اس محرک کیفیت میں زِندگی گزارنی ہے کہ ساری کی ساری کائنات اسی ربُّ العالمین کے دامن رحمت میں پل رہی ہے' پروان چڑھ رہی ہے۔ جیسے ہی انسان اس شکرانہء بندگی کی ادا کو پانے لگتا ہے' اس کے سب کام ایک ہی رُخ اختیار کرنے لگتے ہیں۔ میرا رب وہ جس کا مجھ سے بلاواسطہ تعلق ہے' اس تعلق کا مضبوط ہونا تو خیر عاشقوں کے نصیب میں ہے' مگر عام انسان کم از کم اتنا تو کرے کہ اپنی انانیت اور خود مختاری یا وہموں' وسوسوں' ظلمتوں سے نکل کر اپنے رب کی رحمت کو ہی اپنے اندر اور باہر کارفرما پائے۔ ظاہر ہے کہ اس کا رب وہی جتنا اس کو شعور اور اسکے شکر کا احساس ہے مگر جُوں جُوں اس کا شعور منزل بہ منزل لاشعور اور لاشعور کے لاشعور تک ہم آہنگ ہوتا چلا جائے' وہ اپنے رب کے ساتھ استحکام پکڑتا چلا جائے گا۔ اور اگر بے لگام ہو کر زندگی گزارنا چاہے تو شائد اسے اپنی صلاحیتوں اور قدرتوں کے انعامات کا پتہ ہوتے ہوئے انہیں بروئے کار لانے کی تڑپ آجائے مگر اپنی سطحی زندگی کی بناء پر اسے اپنے رب کا احسان ماننے کی نہ طلب ہو گی' نہ فرصت۔ نتیجتاً وہ ایسے کاموں میں لگا رہے گا جن کا انجام ناتمامی' نامادی' یا جھوٹی جھلک ہے۔ ارشادِ باری ہے کہ سوائے وَجْہُ رَبّ کے سب کو فنا ہے تو وہ چیز جس کی قدر و قیمت دائمی ہے ربّ ہے۔ اپنے اندر اس ربّ کی آئینہ داری جن اقدار کے ذریعہ ہوتی ہے' ان ہی کی قدر و قیمت دائمی ہے۔ اور یہ سوائے اعلیٰ اقدار کے کیا ہو سکتی ہے۔ خلوص' عمل' انہماک کار' جمعیت بندی' خدمت' محبت' صداقت' شہادت' ولایت' رحمت' وغیرہ ہی وَجْہُ رَبّ کی رُونمائی کرتی ہیں۔ انہی کو اپنی مشعل راہ بنا کر جواب پالے کہ میں کیا کروں! ان تمام اقدار کا تعلق جمعیت سے ہے' عالم انسانی سے ہے۔ اپنے نفس اور لطیفہء نفس کی سطح سے ہے۔ اب مقام قلب میں آنے کی بات لگاؤ اور محبت کی یک رخی سے لے کر عشق کی درافتگی اور بے ساختگی پر ختم ہوتی ہے۔ یہاں اس سوال کا جواب اور بھی آسان ہو جاتا ہے کہ میں کیا کروں۔ بلکہ اس سوال کے پوچھنے کی یوں ضرورت ہی نہیں رہتی کہ خود بخود اس کی باطنی فطرت' محبوبؐ کی تڑپ میں یک رُخی قائم رکھتی ہے۔ بات بس عشق کے جاگنے کی ہے۔ عاشق کے لئے سب کچھ اس کا محبوبؐ' سب کچھ اس کے محبوبؐ کے لئے' سب کچھ اس کے محبوبؐ کے نام پر۔ اس لئے اس کا محبوبؐ ہی اس کا ربّ ہے اور وہی حقیقی معنوں میں اس کی رُوح کی پرورش کرتا ہے۔ لہٰذا عاشق کو یہ بتانا کہ کیا کرے فضول ہے۔ اس کے لئے تعین راہ موجود ہے۔ اِلاّ اعلیٰ مقامات کے کہ وہاں اُٹھا ہی لیا جاتا ہے۔ رحمتوں کے سایوں میں پروان چڑھتا ہے۔ خود امر الٰہی کے اِجراء کا ذریعہ بنتا ہے۔

کیا کروں کا مسئلہ تو ان ہی کے لئے کٹھن ہے جن کی منازِل مقامِ نفس تک ہی محدود ہیں۔ ان کے لئے تعین راہ کے ذرائع مذہب و ہدایت ہیں یا فیض صحبت۔ ان کا اصل حاصل یہ ہے کہ انسان کے ان ہی اعمال میں صداقت و خلوص اور دوام ہے جو دوسروں کی خاطر ہوں' جمعیت اور عالم انسانی کی خاطر ہوں۔ ان کے لئے گھر' ماحول' مذہب' معاشرہ مملکت ہی اجتماعی نظریہ کو فروغ دے سکتا ہے۔ وگرنہ فرد تو لاکھ پڑھ جائے یا ہنر مند و عقلمند ہو جائے اپنے اعلیٰ اقدار اور جمعیت کی فلاح کی طرف خود بخود بہت کم رجوع ہو سکتا ہے۔ چونکہ جمعیت کی زندگی ہی میں فروغِ افراد ہے' اس لئے اب یہ سوال کہ میں کیا کروں ایک زیادہ مستحکم صورت اختیار کر لیتا ہے کہ ہم کیا کریں۔ رب کے احسانات و انعامات کا شکرانہ اب وہ اختیار کر لیتا ہے کہ ہم کیا کریں۔ رب کے احسانات و انعامات کا شکرانہ اب وہ جمعیت کی خاطر خلوصِ عمل سے ادا کر سکتا ہے۔ جمعیت کے لئے جو کام کیا جائے اسے دوام بھی ہے اور بقاء بھی۔

شُکر

ہر فرد کے لئے ایک سادہ نفسیاتی نسخہ جو اللہ تعالیٰ نے خود بتایا ہے یہ ہے کہ "جو شکر کرتے ہیں ہم انہیں زیادہ دیتے ہیں" ایک حدیث مبارک بھی ہے۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ آدھا گھڑا پانی آیا جو شکر گزار بندہ ہے وہ کہتا ہے آدھا بھرا ہوا ہے اور جن میں شکایت کا جذبہ ہے وہ کہتے ہیں آدھا خالی ہے۔ اللہ نے اپنے ان اِنعام واِکرام پر جو اس نے انسان کے وجود میں خود عطا کئے ہیں اور جو ماحول اس کے لئے میسر کرتا ہے بار بار توجہ دلوائی ہے۔ اگر ان انعامات کی گنتی کرائی جائے تو سمندروں کے پانی کو روشنائی بنا کر ان انعامات واِکرام کو بیان کیا جائے تو بھی نہ لکھے جا سکیں۔ اپنے جسم کو ہی لیجئے جب ذرا سا ڈاڑھ میں درد یا گھٹنے پر ذرا سی چوٹ ہی لگ جائے تو ہم تڑپ اُٹھتے ہیں' مگر یہ کبھی خیال نہیں گزرتا کہ جو ساری عمر بغیر درد یا چوٹ کے گزار دی اس کے پس پشت کتنا بڑا نظام انسان کے باطن میں اللہ تعالیٰ نے ودیعت کر رکھا ہے اس کی آگہی ہم کو یوں نہیں ہوتی کہ اس نظام میں ہم سے کوئی بیگانگی نہیں ہے۔ نہ صرف وہ ہمارا ہم ساز و ہمدم ہے بلکہ کوئی بیگانگی کا پردہ ہی نہیں رکھا۔ مگر یہ بھی کتنا بڑا احسان ہے کہ ہم کو چونکانے کے لئے کبھی گھٹنے پر چوٹ لگا دی' کبھی کسی اور طرح ہمیں خود اپنی ہی طرف متوجہ کیا۔ بہ مصداق بالا حدیث' اگر تمہاری ایک آنکھ پھوٹ گئی اور تم بجائے اس کے صدمے میں رونے کے اور ناشکری کو جگہ دینے کے جو آنکھ بچ گئی ہے اس کے سچے دل سے شکر گزار ہو' تو قسم ہے اس ذاتِ پاک کی' کہ نہ ہی صرف وہ تمہاری پھوٹی آنکھ واپس آجائے گی بلکہ تمہاری بصیرت کی آنکھ بھی روشن ہو جائے گی۔ (یہ تجربہ کی بات کہہ رہا ہوں) یہ تو ہوا ٹھوکر کھانے کے بعد ہوش میں آنا۔ جب بھی ہوش میں آجائے اپنے آپ کو خوش نصیب سمجھے۔ (کہ اس رحیم کریم کا رخ تمہاری طرف ہے اور وہ تمہیں نظر انداز نہیں کر رہا' نہ ہی سزا دے رہا ہے) مگر حقیقتاً انسان کا مقام یہ نہیں ہے یہ تو ایک جانور بھی ڈنڈے پڑیں تو سیدھا ہو جاتا ہے۔ اور پھر بھی سیدھا نہ ہوا تو حقیقتاً اسفل السّافلین سے ہے۔ جو قہر کے رُوپ میں احسان کو نہ دیکھے اور اِنعام کی بشارت نہ پائے۔ اس پر بس اللہ رحم کرے۔ ہاں تو انسان کا کم از کم مقام وہ ہے جو عام زندگی میں کسی خاص تکلیف میں یا ابتلاء میں نہ ہو۔ جیسے غالباً نوے فی صد انسان ہیں جن کے روزمرہ کے مشاغل ہیں۔ زندگی اچھی خاصی گزر ہی جاتی ہے۔ ان کے لئے راستہ بہت سہل ہے اور وہ یہ کہ اللہ کے انعامات پر جو تمہارے اندر اور باہر ہیں ان پر ایک لمحہ کے لئے غور کریں۔ یہ زیادہ مشکل نہیں ہے۔ ایک منٹ کے لئے اپنے ہاتھ سے اپنے نتھنوں کو بند کرے اور سانس روک لے' جب دم گھٹنے لگے اور بے چینی شدّت پکڑے تو ہاتھ چھوڑ دے اور پھر جو

گہری سانس لے تو یہ سانس خود بخود بغیر الفاظ کے پکارتی ہے شکراً الحمدللہ، شکر الحمدللہ۔ تو ذرا غور کرو، تم جو بغیر احساس کے سانس لئے جارہے ہو اور اللہ تعالیٰ نے جو پاک ہوا تمہیں دی ہے اس کا کس زبان سے شکریہ ادا کرسکتے ہوں۔ کر کے دیکھو۔ اور بار بار کر کے دیکھو یہ کوئی چِلّہ کاٹنا نہیں ہے۔ بہت معمولی بات ہے۔ اور جب یہ بات دل میں جم گئی تو پھر شکر گزار ہونے کے معنی تمہاری سمجھ میں آجائیں گے۔ اور دل پر نقش ہوں گے۔ اس کے بعد جیسے نئی نورانی دنیا تمہارے لئے کھل جائے گی۔

کچھ طبعیتں ایسی ہوتی ہیں، خصوصاً نسوانی طبقہ میں، جو طبعاً ہمیشہ کمی کی طرف نظر رکھتی ہیں اور شکوہ شکایت ان کی فطرت میں موجود ہوتا ہے۔ یہاں پر ایک دلچسپ نقل بے جانہ ہوگی جو غوث علی شاہ قلندرؒ نے اِرشاد فرمائی ہے۔ ایک بزرگ تھے اور ان کی ایک محترمہ بیوی بھی تھیں۔ بیوی نے کہیں سُن رکھا تھا کہ بزرگ ہوا میں اُڑ کر کہیں جاتے ہیں تو اس نے اپنے شوہر سے شکایت کی کہ تم بھی بزرگ ہو ہمیں کبھی اُڑ کے نہیں دکھایا! انہوں نے کہا آج رات کو کوٹھے پر سو جانا اور دیکھ لینا۔ چاندنی رات تھی اور یہ آسمان کی طرف دیکھتی رہی دیکھا کہ ایک شخص ہوا میں اُڑتا چلا جارہا ہے۔ صبح میاں نے پوچھا کیوں بی بی دیکھ لیا نا۔ بیوی نے جواب دیا اچھا وہ تم تھے، میں جب ہی سمجھ گئی تھی۔ میاں نے پوچھا وہ کیسے؟ تو بیوی نے جواب دیا، ٹیڑھے جو اُڑ رہے تھے۔ کہتے ہیں فقیر اور عاقل میں یہی فرق ہے۔ تو بالا حدیث کے معیار سے ناپا جائے تو فقیر اِن بندوں میں آتا ہے جو شکر گزار بندے ہیں اور عاقل وہ جو گھڑے کو آدھا خالی دیکھتا ہے۔ دونوں ہی سچ کہتے ہیں مگر کتنا فرق ہے!

ہماری ابتلائوں کو اپنے اعمال کی سزائوں پر مضمر کرنا یا اپنے اعمال پر جن کو ہم نیک سمجھتے ہیں، جزا کی امید لگائے بیٹھنا، ایک نادانی کا پرتو ہے۔ اگر ہم جزا و سزا کے چکر میں پڑے رہے تو بہت گھاٹے میں رہیں گے، چاہے جہاں تک ہمارا شعور کام کرتا ہے، یا پیدائش سے موت تک ہم کلامِ الٰہی یا سنت نبویؐ سے ایک بال برابر بھی علیحدہ نہ ہوئے ہوں۔ ہاں تو وہ کون سا راستہ ہے کہ جو بے خوف و خطر ذمہ دار بنے گا، گارنٹی لے گا کہ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَ لَا هُمْ يَحْزَنُونَ O یہ صرف رحمتوں کو انوار کی دنیا میں پاتا ہے۔ سَبَقَتْ رَحْمَتِی عَلٰی غَضَبِی اور اس نورانی دنیا میں قدم رکھنے کا سب سے سہل اور لذت آفریں راستہ ہے، شکر گزار بندہ بننا۔ بظاہر یہ کٹھن سی بات معلوم ہوتی ہے کہ میری آنکھ پھوٹ جائے یا میرے بڑھاپے کا فقیر مطلوب کی ہر شے میں حسن و خوبی دیکھتا ہے جو واقعی وہاں موجود ہوتی ہے اور سچ کہتا ہے۔ عاقل ہر شے میں اپنے معیار پر مبنی کوئی کمی یا کسر دیکھتا ہے اس سے متنبہ کرتا ہے اور وہ بھی سچ کہتا ہے۔ اکلوتا فرزند اللہ تعالیٰ اُٹھالے تو بھی میں شکر گزار رہوں۔ مگر اے بدبخت تیری دُوسری آنکھ تو باقی ہے اور کیا کیا کچھ نہیں ہے۔ اس کا شکر کیوں نہیں ادا کرتا! اور تو اپنے بڑھاپے کا سہارا اپنے لڑکے کو گردانتا ہے۔ توبہ کر توبہ! نہ وہ رزاق ہے، نہ وہ ربّ ہے۔ سہاروں کو چھوڑ اور جو دی ہوئی نعمتیں ہیں ان پر غور کر اور شکر گزار بندہ بن اور تو دیکھے گا کہ واقعی یہ جذبہ بصیرت جب تیرے دل میں اُتر جائے تو یک لخت تو ایسی روشنی میں آئے گا کہ انبساط سے تیرا جگر شق ہو جائے گا اور شکرانہ میں دل یہی پکار پکار کے کہے گا کہ سر کو سجدۂ شکر میں جھکا اور پھر عمر بھر نہ اُٹھا۔ کر کے دیکھو، نہ عقیدے کی ضرورت ہے نہ ایمان کی۔ چاہے تم کسی مذہب یا کسی فرقے سے بھی ہو۔ ایک دفعہ کر کے تو دیکھو۔ ہاں البتہ جب کسی آگ میں جل رہے ہو یا دردِ قولنج اُٹھ رہا ہو اس وقت ایسا خیال بھی کیوں آوے۔ ایسے وقت میں جب قولنج اُٹھا ہو دوا کا کیسے خیال آجاتا ہے۔ صحت کی طرف کیسے خیال جاتا ہے۔ یہ مثبت پہلو کہاں سے اُبھرتا ہے۔ یہ رحمت کی ٹپ ٹپ تمہارے اندر ہی موجود ہے۔ وہ خود بیتاب ہے۔ کیسا شکر کا مقام ہے۔ ذرا سا شکر کو موقع دو

پھر دیکھو رحمت کھلتے کھلتے کس قدر شاندار شجر کی صورت اختیار کرتی ہے جس کی جڑیں نفس ہی میں مستحکم رہتی ہیں اور خدا جانے وہ درخت کہاں تک اُوپر پہنچتا ہے!

اکثر لوگ جو روحانیت کی طرف مائل ہیں اور مالک کے کرم سے وہ کامیاب بھی رہے ہیں اور فتح بھی پائی ہے ان کی ابتداء عموماً کسی ایسی گہری ٹھوکر یا سانحہ سے ہوئی ہے جو قلب کی گہرائی تک کو ہلا گیا ہے۔ مگر ان لوگوں کے عروج کی کوئی انتہا نہیں ہے جن میں شکر گزار ہونے کا جذبہ طبعاً موجود تھا۔ اور اسی کی ربوبیّت پر وہ پروان چڑھتے رہے۔ اَلَّذِیۡنَ قَالُوۡا رَبُّنَا اللّٰہُ وَاسۡتَقَامُوۡا عَلَیۡہِ ان لوگوں نے اللہ کو رب کہا اور اس پر قائم ہو گئے۔ جب رب کو دیکھیں تو مزہ ہے۔ پھر ظلمتیں ستاتی نہیں۔ اکثر طریقت کے راستوں میں نہ صرف یہ کہ اپنے نفس سے جہاد بلکہ سینکڑوں ظلماتی صورتوں سے واسطہ پڑتا ہے اور یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ ان ہی مجاہدوں میں اُلجھ کر زندگیاں صرف کر جاتے ہیں اور نورانی انسباط کی دنیا کی آرزو باقی رہ جاتی ہے۔ مگر اس زندگی میں اللہ ہی رحم فرمائے تو یہ میسر آئے وگرنہ بعد کا حال تو وہی جانے۔ مگر یہ عجب کرشمہ اور عجوبہ ہے کہ وہ جو صرف زبان سے نہیں بلکہ رُوئیں رُوئیں سے شکر میں زندگی گزارتے ہیں' ان کو واقعی نہ کبھی داڑھ کا درد ہوتا ہے نہ گھٹنے پر ٹھوکر لگتی ہے۔ یہ تو عجب معجزہ ہے۔ کہ باطن و ظاہر کائنات کا ہر ذرّہ اپنا دوست رکھتا ہے اور دوست کی خاطر سب کچھ نثار کرنے کے لئے بے چین معلوم ہوتا ہے۔ حقیقت میں یہ کائنات کا ذرّہ ذرّہ نہیں بلکہ یہ وہی رَحۡمَتًا لِّلۡعٰلَمِیۡنِ کا پرتو معلوم ہوتا ہے۔ اگر رحمت کے معنی سمجھنے ہوں تو کچھ دن کے لئے ہی سہی' ایکٹنگ کر کے ہی سہی۔ شکر گزار بندے بننے کی کوشش کرو تو جیسے بچوں کی ایکٹنگ پر ماں' باپ مسکرا دیتے ہیں' اسی طرح تمہاری اس ایکٹنگ پر رحمت کِھل کِھلا کر ہنس پڑے گی اور تمہیں اپنی گود میں لے لے گی۔

باب ۱۱

رُخسارِ دوست

قَابَ قُوۡسَیۡنِ اَوۡ اَدۡنٰی O

قلب کی آئینہ داری

بجلی اِک کوند گئی آنکھوں کے آگے تو کیا

بات کرتے کہ میں لب تشنہء تقریر بھی تھا۔

جب انسان اپنے آپ کو آئینہ میں دیکھتا ہے تو اپنے وجود ی حسن تک پر بھی اس طرح فِدا ہو جاتا ہے کہ کوئی بھی اور چیز آئینہ سے زیادہ پیاری معلوم نہیں ہوتی۔ اسکے لئے اس وقت صرف وہی حقیقت ہوتی ہے جو آئینہ میں دیکھتا ہے اور باقی سب جھوٹ۔ مگر کتنے لوگ ہیں جو آئینہ دیکھنے کی بجائے آئینہ میں دیکھتے ہیں؟ ان کی بصیرت کی نگاہ اس حسن ذات وصفات تک نہیں پہنچتی جو ان کے اپنے وجود کے پیچھے ہے۔ حسن صفات کی رونمائی کے لئے مجردات تک رسائی ہوتی ہے۔ خدمت خلق' ایثار' محبت' وغیرہ کے پیکر صرف اسی وقت نظر آسکتے ہیں جب قلب آئینہ بن جائے' جب ایک قلب دوسرے قلب کی آئینہ داری کرنے لگے اور پھیلتے پھیلتے یہ آئینہ عالم امکان میں پھیل جائے۔ اس حالت میں وہ گویا اپنا ہی آپا آئینہء جہان میں دیکھتا ہے۔ اور اس سے آگے آئینہ ذات ہے۔ یہ نور وعشق کی معراج کی ہی شان ہو سکتی ہے کہ کہہ سکے رَائیتُ رَبِّیْ بِرَبِّیْ (دیکھا اپنے رب کو اپنے رب سے) اس حسن حقیقت کی جھلک پا جانے کے بعد انسان اس سوچ میں پڑ جاتا ہے کہ اصل کون ہے اور عکس کون؟ یہ عکس رُخسار یا یہ وجود؟ پھر یہ کیفیت انسباطِ حسن ہوتی ہے کہ نہ عکس کا شعور رہتا ہے اور نہ وجود کا۔ اسے حسن کی مستی کہہ لیں یا خود آگہی کہ بس 'ہے'

یہ حسن ازلی کی صفت ہے کہ خود ستائی کرے۔ خود نمائی اس کی معراج ہے۔ حسن ازلی نے اپنی حقیقت کو دیکھنے کے لئے ہی یہ کائنات بنائی۔ وجود کے حسن کے لئے آئینہء موجودات پیدا کیا۔ صفاتی حسن کے لئے آئینہء صفات' اور ذات کے حسن کے لئے آئینہء ذات۔ مگر سب کا سب آئینہ ایک ہی توحید میں۔ یہ آئینہ ہے کیا؟ مادّی کائنات تو ہو نہیں سکتی کہ اس کو فنا ہے۔ یہ آئینہء حقیقت محمدیؐ ہے جو تعین اوّل ہے۔ حسن ازلی کا مادّی' صفاتی' ذاتی حسن سب کا سب' پورے کا پورا' اسی ایک توحید میں ہے۔ آئینہ سامنے ہے قاب قوسین' درمیان میں تھوڑی سی جگہ اور اواب نیٰ حقیقت کی یہ آئینہ داری وجود کے نور سے ہی ممکن ہو سکتی تھی۔ اس لئے زمان ومکان دونوں اس حسن حقیقت کے آئینہ دار بنے۔ ذات کی سطح پر آئینہء زمان کا تعلق حَیُّ سے ہوا اور آئینہء مکان کا قَیُّوم سے۔ حَیّ قَیُّوم کے انوار اسی وجود سے چھلک اُٹھے۔ یہ آئینہ وجود سے لاموجود تک پھیلا۔ اسی میں ہر ظہور نے اپنی اپنی سطح پر اپنے حسن کی تابانی دیکھی۔

حُسنِ رُخسارِ حق

)حسنِ لیلیٰ عکس رُخسارِ من است(

عرشِ اعظم پہ جو دیکھا' وہ کیا تھا' یہ تھا

قلب مومن تھا اور اس میں جو لکھّا تھا یہ تھا

اِسم اعظم بھی یہی بازوئے حیدر بھی یہی

اسم تیرا جو ھُو اللہ ہے وہی یہ بھی وہی

قلب مومن، عرشِ الٰہی ہے۔ جو کچھ کائنات میں ہے، قلب مومن میں عیاں اور نہاں ہے۔ ھُو الظاہر ھُو الباطن کا یہی آئینہ دار ہے۔ حسن کی تجلی، عشق کی وارفتگی کا یہی امانت دار ہے۔ یہی مخزنِ اسرار، یہی گنجینہء عرفان، یہی بامِ شہود، یہی تجلی، نمود، یہی امر کن، یہی نتیجہ فیکون۔ عشق، عشق، عشق، کہیں کشش کی صورت میں ہے، کہیں قوت و توانائی بنا ہے، کہیں نمودِ حیات کا پہلو لئے ہے، کہیں اُلفت و محبت کا۔ اس عشق کو آرزو ہے، طلب ہے، تڑپ ہے، رُخسارِ حقیقت کی تلاش ہے۔ اس کی ابتدا بھی تڑپ، اس کی انتہا بھی تڑپ ہے، رُخسارِ حقیقت کی تلاش ہے۔ جدھر نظر ڈالتا ہے وہی عکس رُخسار، وہی حسن لیلیٰ عکس رُخسارِ من است۔ لیلیٰ کا حسن صرف عکس ہے۔ یہ کس کا عکس ہے، اس کی اصل کیا ہے؟ اصل رُخسارِ حق ہے، گویا مادّی آئینہء کیا دیکھنا ہے؟ وجود پر کیا نظر رکھنی ہے؟ آئینہ میں دیکھو اور آئینہ میں جو دیکھ رہے ہو اس کی اصل حقیقت تک پہنچو۔ نگاہ عکس رُخسار پر جمی رہے۔ کیونکہ یہ حسن، یہ خوبی، جو آئینہ وجود میں نظر آرہی ہے، حق کا رخسار ہے، یہ رُخسار کیا ہے، حسن رخسار کیا ہے؟

کسی حسین کی شناخت یا یاد، یا تصوّر تو "چہرئہ زیبائے تو" سے ہوتی ہے وَیَبْقٰی وَجْہُ رَبِّکَ ذُوالْجَلَالِ وَالْاِکْرَام۔ اس وجہ باری کی عکاسی سے کسی کی آنکھ آنکھوں میں بستی ہے تو کسی کے لب لعلیں کے نظارے سے کوثر و تسنیم کا سرور محسوس ہوتا ہے۔ کہیں دُرِّ عدنی دانت ہوتے ہیں تو کہیں لوح جبین صبح تجلی ہوتی ہے۔ کہیں زُلفِ عنبریں سے یٰسین کی خوشبو آتی ہے، تو کہیں سرو قامت قیامت برپا کرتا ہے۔ کہیں کوئی اداخُرمِن دل پر بجلی گراتی ہے، تو کہیں کسی کی مسکراہٹ، غم کی اندھیری کوٹھڑی میں ایک روشنی کی کرن ڈال دیتی ہے۔ یہ سب کچھ ہے کیا؟ یہ کس کے حسن کی جھلک ہزار انداز لئے ہے۔ یہ کچھ اور تو نہیں۔ یہ وہی عکس رُخسار ہے۔ رُخسار کی نہ کوئی شکل، نہ اس کی کوئی نسبت، ایک سپاٹ سطح جیسی، ایک آئینہ جیسا اور بس، یوں چہرے کے جتنے نقش ہیں مثلاً آنکھ، ناک، لب وغیرہ، ان سب کا ایک تعینی نقش ہے مگر رُخسار کی بابت یہی کہا جاسکتا ہے کہ رُخسار ہے تو ایک چیز مگر اس کا کوئی نقش نہیں ہے گویا یہ ایک برزخ ہے تعین اور لاتعین کے درمیان، تفرید اور تجرید کے درمیان، حسن انفرادی اور حسن مجرد کے درمیان

اب آئینے کو لیں۔ انسان جب آئینہ دیکھتا ہے، خواہ اپنی صورت ہو یا کسی اور کی، تو آئینے کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی، صرف صورت ہی کی حقیقت ہوتی ہے۔ گویا آئینہ ایک برزخ ہے اصل اور ظِل کے درمیان۔ یہ من و تُو کے میزان کی بات ہے۔ دونوں کے بغیر بات نہیں بنتی۔ تمنا کی شدّت ہو تو سارا دھیان اسی صورت میں ہوتا ہے، تصوّر مرکوز ہو کر جب حُسنِ حقیقت کو دیکھتا ہے تو اللہ کو اللہ کے نُور سے ہی دیکھ رہا ہوتا ہے۔

اسی انداز میں رُخسار خود ایک آئینہ ہوتا ہے۔ برزخ ہوتا ہے، حُسنِ من است، اور دیکھنے والے کے قلب و نظر کے درمیان۔ یہ حُسنِ مُجرد کی جھلکی، تعینات کی برزخ کے ذریعہ ہی ہو سکتی تھی۔ چاہے وہ تعین کوہِ طُور ہو، حُسنِ فطرت ہو، یا رُخسارِ دوست۔ پھر ایسا تعین جیسا کہ رُخسار، جو آئینہ کی طرح کوئی شکل، کوئی نقش نہ رکھتا ہو، حسن مجرد کو مفرد کرنے کی بھی صلاحیت رکھتا ہے۔ لاتعین کو ہزار مفرد انداز میں پیش کر سکتا ہے۔ اس آئینہ کی وُسعت لامحدود۔ یہ آئینہ سمت، جہت، جسامت، شکل، شباہت سے آزاد ہے۔ اس میں انوار کی تابانی کُلَّ یَوْمٍ ھُوَ فِیْ شَانٍ، گویا یہ حُسن رُخسار ایک نُور ہے۔ نورِ کائنات، نُورِ موجودات، مرکز تخلیق، حُسنِ ہر ظہور، یہ نورِ محمدیؐ ہے، جو ذرّہ ذرّہ میں نہاں و عیاں ہے۔ ہر آئینہء وجود میں اس کے حسن کا عکس ہے۔ اسی سے ساری کائنات کا ظہور ہے۔ لَولاکَ لَمَا خَلَقْتَ الْاَفلاک، گویا حُسنِ کمالِ ذات اپنی تمام صفات سے نورِ محمدیؐ کی شکل میں جلوہ گر ہوا، ظہورِ

اوّل ہوا کہ یہی اوّل یہی آخر، یہی باطن، نہ کوئی کمی ہوئی نہ کوئی بیشی، الآن کما کان، یہ نورِ محمدیؐ کہیں حُسن کے رُوپ میں عیاں ہے تو کہیں عشق و کشش کے انداز میں، کہیں خوبی کی صورت میں ہے، کہیں سچّائی کی، کہیں عقل و دانش کے انوار میں ہے، کہیں قلب و رُوح کی تجلّی میں، کہیں حَیُّ وَقَیُّوْم کی شان میں ہے، کہیں الدھر کے کیف میں۔ الغرض ہزار انوار ہزار تجلّی۔ یہی تجلّی لَمْ یَزَلْ یہی لایزال، یہی جاذبِ قلب و نظر، یہی اِلَیْہِ رَاجِعُوْن کی طرف رجوع کرتا ہے۔ یہ نورِ حُسن، یہ خوبی کی مہک، تسکین بن کر سوزشِ حیات کو سرد اور ٹھنڈا نہیں کرتا، بلکہ جمود اور جھوٹی تشفی کی بجائے، زینہ بزینہ براہیمی تجسس اور تلاش کی صورت میں، متلاشیءِ حق کو، پیہم سرگرداں ہونے کی توفیق بخشتا ہے۔ اسی کے سوز سے وہ آفاق میں ڈھونڈتا ہے، فطرت کے لیل و نہار میں ڈھونڈتا ہے اور جب یہ تمنا، یہ تڑپ بڑھ جاتی ہے تو انفاس، اپنے باطن کے صد عالمین کی کھڑکیاں اس کے لئے کھلنے لگتی ہیں۔ پھر حُسن و خوبی کے دروازے کھلنے لگتے ہیں۔ حُسن و خوبی زوجین ہیں۔ ایک دروازے میں داخل ہوا، جو اپنے ہی باطن میں ہے تو حق حق پکار اٹھتا ہے۔ ذاتِ بے نام و نشان ہے، جب رسائی ہوتی ہے تو ایک ایسی وُسعت و انبساط و نور ہوتا ہے نہ من ہے نہ تُو ہے۔ بس 'ہے'، اس حقیقت میں جب قیام مل جائے تو نُور علیٰ نُور ہے۔ وجود کے آئینہ میں اپنا ہی آپ رُوبرو ہے۔ قَابَ قَوْسَیْن اوَاَدْنٰی۔ یہ عکس رُخسار کی اِکائی ہے۔ اس کو جاننے کے معنی ایسے ہی ہیں جیسے کہ اللہ کو اللہ کے نور سے دیکھا۔ عَرَفْتُ رَبِّیْ بِرَبِّیْ۔ کل کا احساس ہوا تو اپنے کو جُدا کیسے کر سکتا ہے۔ کون کس کو دیکھے۔ اللہ تعالیٰ نے جب اپنے آپ کو دیکھنا چاہا تو مخلوق کو پیدا کیا۔ انسان اشرف المخلوق ہے۔ فطرت کا جو حُسن ہے، خوبی ہے، نور ہے، اس کو سمجھنے اور سراہنے والا بھی انسان ہی ہے۔ یہ نہ ہوتا تو کون جاندار، حُسن و خوبی، حقیقت کو پاتا۔ گویا کہ حُسن ہوتا نہ ہوتا ایک بات تھی۔ انسان کی فطرت میں جو اس حُسنِ حقیقت کے عرفان کی صلاحیّت ہے اس کو بھی تو نُور ہی کہا جا سکتا ہے۔ گویا ظہور بھی مادّہ کی وجہ سے ہے اور شعُور اور عرفان بھی مادّہ ہی کر سکتا ہے۔ اس طرح آپ آپ کو دیکھتا ہے۔ نُور نُور کو دیکھتا ہے۔ یہی نورِ محمدیؐ کی جھلک ہے جو کائناتِ ظہور کی روشنی بنی ہے۔ اس حُسن کی بہترین تابانی انسان ہی نے پائی۔ کیا شکل و صورت، کیا ادا، کیا اخلاق کیا نور عقل، کیا اوصافِ جمیلہ کہ دیکھنے والا بھی پکار اُٹھے حَسُنَتْ جَمِیْعُ خِصَالِہٖ اور جب ایک کامل و اکمل ترین ہستی کا ظہور اس نُور کی مکمل تابانی میں ہوا تو وہ کیسے نہ محبوبِ ربّ العالمین ہو، کیسے نہ افضل و برتر بشر ہو، کیسے نہ یکتا و یگانہ ہو، کیسے نہ مطلوب و مقصودِ جن و بشر ہو۔ اسی لئے کہا ہے۔

آتا ہے زلیخا کو نظر نورِ محمدؐ اس واسطے یوسف پہ تو للچائی ہوئی ہے

اب اس حُسن مطلق کا، جو وجود بھی آئینہ دار بنا وہ خود اس حُسن و خوبی سے چھلک اٹھا، وجود در وجود اس نورِ محمدیؐ کی تابانی کائناتِ عالم میں جاری و ساری رکھنے کا ذریعہ بنا۔ یہ عکس رُخسار کی حقیقت آپ بنا۔ اور اسی نے اس اِکائی کو پایا۔ مگر بامِ مُراد کو وہی پہنچا، اکمل وہی کہلایا جس نے عبدیّت کا دامن نہ چھوڑا اور اس دوئی پر قربان ہوا کہ تُو آقا ہم غلام۔ حضرت خواجہ اجمیریؒ فرماتے ہیں۔

از مطلع دل علم یک لمحہ ازر خسارِ اُو

ذرّہ ذرّہ ہستیم در پردۂ انوارِ اُو

با آنکہ ذرّاتِ تم ہر یک ہزاراں دیدہ شُد

یک ذرّہ ہم دیدہ نہ شُد از پرتوئے رُخسار اُو

آئینہ خود نما

فطری جذبہء خود نمائی کے تحت ہر انسان کچھ اس طور پر جی رہا ہوتا ہے کہ اسے اپنی خیالی' جذباتی' مجازی' دنیا ہی حقیقی معلوم ہوتی ہے۔ شعوری لاشعوری یا دانستہ نادانستہ طور پر وہ اس خود ساختہ حجاب میں ایسا گھِرا ہوتا ہے کہ اسے وہی حقیقت معلوم ہوتی ہے جس لباس میں وہ ملبوس ہے اور باقی سب فروعات۔ اپنی فطری انانیت کے سبب اسے ماحول سے ایسا لگاؤ ہوتا ہے کہ اب اس کے لئے کوئی دوسری راہ تعین کر دینا بھی دشوار ہے لیکن جیسے ہی اسے کسی آئینہ خود نما میں اپنی اصل تصویر نظر آجاتی ہے' وہ سارے حجابات اٹھنے لگتے ہیں جن میں وہ گھرا ہوتا ہے۔ تھوڑے سے تصوّف سے کسی ساتھی نے ان نکات کو ایک مکالمہ کی صورت میں پیش کر دیا کہ پڑھنے والوں پر گراں نہ ہو۔ یہ اس لئے بھی انسان اپنی صورت کو کسی دوسری صورت سے بدل کر حیران ہونے کے لئے تیار نہیں' پھر بھی ایک ایسا جہاں نما آئینہ کیوں نہ دکھا دیا جائے جس میں وہ اپنی خود نمائی کر لے۔

ہر انسان کو اپنے سے پیاری کوئی دوسری چیز نہیں لگتی' مگر اس عینیت کا نتیجہ حیرانی ہے۔ حُسن اپنے کو دیکھے تو دیدۂ حیراں اور بات لے دے کے یہی رہ جاتی ہے کہ جسے خبر ہوئی وہ خود ایسا آئینہء حیران بن گیا کہ اسے اپنی خبر نہ ملی۔

یوں تو انسان کے اپنے ظہورِ جمال کے لئے اس کی اپنی ہزار صفات کے ہزار آئینے ہیں جن میں وہ اپنے حسن کا نظارہ کر سکتا ہے۔ مگر آئینہ کو نہ دیکھیں بلکہ آئینے میں دیکھیں تو سب جلوں کے پیچھے ذات وہی ایک کی ایک' ایک ہی وحدت میں۔ اسی لئے مندرجہ ذیل مکالمہ 'کلام کے آئینے میں اپنے اپنے ممکنات کا جلوہ پیش کر رہا ہے۔ اور ممکن ہے کہ اپنے کمالِ حسن کی جھلکیاں شاید پڑھنے والے جگہ بہ جگہ دیکھ سکیں۔

آئینہ ہر گز نہ شُد مغرور حُسنِ خویشتن

نو آموز۔ بھائیو! میں کلام سیکھنے میں نووارد ہوں۔ نیا نیا شوق لگا ہے۔ ہم سیدھے سادھے لوگ چکروں میں تو پڑتے نہیں' ہم تو دوسروں سے بھی کلام سُن کر لطف اٹھا لیتے ہیں۔ قرآت ہو رہی ہو تو خواہ مخواہ لطف آنے لگتا ہے۔ جھومنے لگتے ہیں۔ خواہ کچھ سمجھ میں نہ آرہا ہو پھر بھی ایسا لگتا ہے کہ یہ ہمارے ہی

دل کی آواز ہے۔ یوں کلام کی لذّت اور ثواب کے خیال سے ہم اکثر ناظرہ پڑھتے ہیں۔ معنی سمجھنے کی فُرصت نہیں ملتی۔ خیر بعد میں کبھی سہی' جب اللہ توفیق دے۔ آج کل تو حفظ کرنے کا شوق بھی چڑھا ہے۔ عجب رنگ ہے کہ ایک ماہ میں دو سیپارے حفظ کر لئے ہیں۔ یوں کبھی کبھی معنی کے ساتھ آئتیں دیکھی ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اچھی اچھی آئتیں اللہ کریم نے ہمارے لئے اتاری ہیں اور سختی والی بنی اسرائیل اور کفار کے لئے۔ مگر صاحبو! ہر آیت جھوم جھوم کر پڑھنے میں بڑی لذّت اور تسکین ملتی ہے۔ سمجھ ہو' عقل ہو' شوق ہو تو کلام کا لطف عجب عجب انداز میں لیا جاسکتا ہے۔ میرا اپنا تجربہ ہے کہ جب بھی میں نے ترنگ میں آکر کلام کا لطف لیا ہے تو جھوم جاتا ہوں۔ بغیر معنی فہمی کے بھی لطف اُٹھالیتا ہوں۔ خدا جانے کونسی تاثیر ہے کلام میں۔ وظائف کا شغل اکثر رکھتا ہوں۔ بڑا سکون ملتا ہے اللہ کے کلام سے۔ اِلاّ بِذِکرِ اللہِ تَطمَئِنَّ القُلُوب (سنتے ہو! اللہ کے ذکر میں اطمینان قلب ہے)۔

عامل۔ اللہ کے کلام میں بڑی تاثیر' بڑی طاقت' بڑی برکت ہے' ظاہری بیماریوں کا علاج ہے' شِفا ہے' اکثر آزما کر دیکھا کہ اِدھر درد کی جگہ پکڑ کر کوئی آیت دم کر دی اور اِدھر درد غائب۔ بلائوں نے گھیرا تو کوئی نقش لکھ کر تعویز دے دیا' بلا ٹل گئی۔ دشمن کے لشکر پر پڑھ دیا' تِتّر بِتّر ہو گیا۔ کبھی عمل عملیات سے جنتا اور موکل کی تسخیر کی اور وہ کام کر دکھائے کہ عقل حیران۔ عمل تسخیر پڑھا تو گروہ در گروہ انسانوں کے اپنی طرف رجوع ہو گئے۔ دستِ غیب' افسر کو زیر کرنا' دنیاوی ترقی' ملازمت' شادی' جائداد' تجارت' غرض اللہ کے نام سے کیا کام نہیں کئے جاسکتے۔ یہ ہوا رُوحانیت کا زور۔ آخر درود و وظائف' عمل عملیات میں اللہ کا کلام ہی تو پڑھا جاتا ہے۔ اس طرح اللہ کی یاد بھی ہو جاتی ہے اور کام کے کام۔ ہم خُرما و ہم ثواب۔

کافِر۔ وہ صاحب۔ اس میں کیا کمال۔ منتر پڑھ کر ہم بھی ایسا ہی کر دکھاتے ہیں۔ ٹوٹا ٹوٹکہ کر کے اور اُلٹے سیدھے الفاظ پڑھ کر ہم کیسے کیسے کام سیدھے کر لیتے ہیں۔ بیماریاں کیا' ان کو تو یُوں ہی چھو منتر کر کے دُور کیا جاسکتا ہے آپ دُور کرنے کی کہتے ہیں' ہم یہ تماشہ بھی دکھا دیں کہ ایسی بیماریاں لگا دیں' کہ نہ علاج سے ٹھیک ہوں نہ دم سے۔ نظر بندی اور نظر ڈالنے کا تماشہ دیکھنا ہو تو میاں جی میدان میں آجائو۔ ایک نظر ڈال کر ہم اچھے سے اچھے شیروں کو چِت کر سکتے ہیں۔ جادُو کا زور آپ کو معلوم ہی ہو گا۔ اچھے اچھے عامل حیران رہ جاتے ہیں۔ اچھے اچھوں کا زور ٹوٹ جاتا ہے۔ شیطان قابو کرنا ہمیں بھی آتا ہے۔ مسان میں جا کر کھوپڑیوں' ہڈیوں پر جادو منتر پڑھ کر وہ بلائوں کا زور دکھاتے ہیں کہ اچھے اچھے دنگ رہ جائیں۔ میاں صاحب! ہنومان کا منتر' کالی کا جادو' شکتی کی طاقت کا کسے علم نہیں۔ مال دولت گھسیٹنا ہو تو لچھمی کی پوجا کرو دولت ہی دولت۔ میں صحیح کہتا ہوں بھگوان اس سے ناخوش نہیں ہوں گے۔ وہ تو بے پرواہ ذات ہیں' ہنومان' کالی شکتی' لچھمی بھی تو ان ہی کے رُوپ ہیں۔ ان سے باہر ہے کیا۔ ہری اوم۔ ہری اوم۔

عابد۔ مگر دوست! کہاں نورانی عمل' کہاں سفلی' کہاں نورانی قوتیں کہاں تاریک۔ کہاں حق کہاں باطل۔ بس نیّت کا فرق ہے۔ جھٹکا کر دینے سے وہی گوشت حرام' اللہ کا نام پڑھ دینے سے وہی حلال اور برکت والا۔ اللہ کے نام کی عظمت کے کیا کہنے' ایک ایک اِسم' ایک ایک آیت معرفت کا خزانہ' اعلیٰ مقامات حاصل کرنے کے لئے بھی یہی کلام مشعل راہ بنتا ہے۔ کوئی درود یا وظیفہ جب لاکھوں بار کرتے ہیں تو وہ لطائف کُھلتے ہیں اور وہ تجلّیات کے انوار ہوتے ہیں کہ سُبحان اللہ۔ اس زندگی کے کیا کہنے جو دن رات ذکر و اذکار میں گُذرے۔ جسے ان لطائف اور انوار کی چاٹ پڑ جائے وہی جانتا ہے ان درود وظائف کا لطف۔ آخر یادِ الٰہی بھی ساتھ ہو رہی ہوتی ہے اور تجلّیء انوار کا تماشہ بھی نظر آتا رہتا ہے۔ ہر دم ذکر' شغل کو کون بُرا کہہ سکتا ہے۔ اچھّے

اچھّوں نے یہی کیا ہے کہ اپنے زُہد' اپنی عبادت کے زور' پر معرفت کے خزینوں کی سیر کی۔ یہی ذِکر اذکار ہماری ڈھال' یہی ہماری تلوار' یہی ہماری زندگی یہی ہمارا دین۔ آگے کیا ہے کون جانے' پر دئہ غیب کے کشف کی لذّتیں ہمارا سرمایہ حیات ہیں۔

دُنیادار۔ واہ صاحبان واہ! بہت کام کی چیز ہے پھر تو کلام۔ جب بیماری دُور ہو گئی' بلا ٹل گئی' دشمن زیر ہو گیا' مال و دولت کو اکٹّھا کر لیا' تجلیّات کا ظہور ہو گیا' تو پھر فضول ہم رات دن روٹی کمانے کے چکر میں لگے رہتے ہیں' فضول بیماریوں میں دوادارُو کی فکر کرتے ہیں' فضول دیدار و قربِ الٰہی کے لئے تڑپتے ہیں۔ بھائیو! اب تو ہم بھی یہی کریں گے کہ کوئی آیت پڑھ لی اور کام بنالیا۔ اگر کلام سے بیماری دُور ہو سکتی ہے تو بھوک بھی دُور کرنے کی ضرور کوئی آیت ہو گی۔ تب ہی تو فقیر جنگل میں جا بیٹھے ہیں۔ بس تلاش کرنے کی ضرورت ہے ایسی آیتوں کی جن کے ذریعہ بغیر محنت و عمل کے کام بن سکیں۔ کتنا اچھّا ہو کہ روپیہ کمانے کے لئے بھی کچھ نہ کرنا پڑے اور کھیتی باڑی بھی خود بخود ہوتی رہے۔ پکے پکائے کھانے خود ملتے رہیں۔ اگر کام کرنا بھی پڑے تو بس اتنا کہ کوئی عمل کیا' جِنّات اور مُوکل کو قابو کر کے دفینہ حاصل کیا' پھر مکان بنوائے' شادی کی' عمل عملیات کے زور سے عُمر بھی بڑھالی' اور عیش کی زندگی بسر کی۔

؎ بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست

عاشق۔ ہائے یارو! کلام کی نہ کہو' عاشق ہی جانتا ہے لطف کلام کیا ہوتی ہے۔ مجنوں سے پوچھو لیلیٰ کے کلام کی لذّت' ارے لیلیٰ کا کلام تو بڑی چیز ہے اس کی نشانیوں کی قدر بھی مجنوں ہی جانتا ہے۔ لیلیٰ کا رومال مجنوں بھی آنکھوں سے لگاتا ہے' سر پر رکھتا ہے۔ لیلیٰ کا وِرد کرتا ہے۔ اللہ اللہ' مگر ادا کچھ اور ہی ہوتی ہے۔ وہ اس نام کی لاج رکھنا بھی جانتا ہے اور قدر کرنا بھی۔ وہ اس رومال کو دھوپ سے بچنے' بیماریاں جھاڑنے یا گرد صاف کرنے کے کام نہیں لاتا۔ وہ اس رومال کے صدقے' روٹی' کا ٹکڑا بھی نہیں مانگتا۔ اس کا دل تو اسی رومال میں وصالِ یار کی لذّتیں لیتا ہے۔ اس کے نام سے تو وہ اپنے درد کو اور بڑھاتا ہے۔ ارے درد کی لذّت' عاشق سے سیکھو۔ تم درد دُور کرنے کی فکر کرتے ہو اور ہم درد کی تلاش میں صحرا نوردی کرتے ہیں۔

رِند۔ لوگو! کیا باتیں کرتے رہے ہو۔ کلام نہ عقل ہے نہ جنوں' نہ دنیاداری ہے نہ دِینداری' یارو کلام تو مستی ہے۔ تم سب سے دُوئی اور انانیّت کی بُو آتی ہے۔ تم کہو گے کہ میں نے کوئی نیا مذہب نکالا' کوئی نیا اصولِ حیات مقرر کیا۔ میں کیا جانوں دنیا کو' میں کیا جانوں دین دھرم کو' میں کیا فخر کروں عشق و عرفان پر۔ میں یہ کہتا ہوں کلام میں خود ہوں' میں ہی علم اُلاسماء کا مصداق' میں ہی اُمُّ الکتاب' میں ظہور حق' شان حق' میں رہی وَجہُ اللہ' میں ہی مظہر صفات و ذات' مجھ سے باہر کیا میرے اندر کیا۔ اَللّٰہ ھُو۔

کمیُونِسٹ۔ یہ تم لوگ کیا کلام کلام کر رہے ہو۔ ہوش کی باتیں کرو۔ تمہارا کلام جو کچھ بھی ہو یہ نہیں دیکھتے کہ تم سب لوگ اپنے اپنے رنگ میں کلام کو رنگتے ہو۔ اپنے جذبے یا کاموں کے لئے استعمال کرتے ہو۔ آخر تم سب کلام کے رنگ میں اپنے کو رنگنے کی کوشش کیوں نہیں کرتے۔ کلام کے پیچھے کلام والے کو کیوں نہیں ڈھونڈتے۔ اس کی مرضی کیوں نہیں پہچانتے۔ دیکھو ہم نے مارکس اور لینن کے کلام کو کیسا اپنایا ہے۔ یارو! ٹھوس حقیقت کو دیکھو' اپنے پائوں زمین پر رکھو' یہ تم سب ہوا میں کیوں اُڑ رہے ہو۔ آخر یہ بھی تو دیکھو کہ ہر کلام کے پیچھے کلام والے کا کوئی مقصد ہوتا ہے' کوئی خواہش

ہوتی ہے' کوئی اِرادہ' کوئی امر ہوتا ہے۔ پھر اسی کے مطابق کلام آتا ہے' اور اسی کلام کے مطابق انسان کو اپنا عمل ڈھالنا ہوتا ہے۔ ہم بھی یہی کچھ کر رہے ہیں۔ اور دنیا میں کامیاب ہیں۔ مٹی کے جسم کی چیزوں کو اسی سطح سے سمجھو اور اپنالو تو حق آدمیت ادا ہو' ورنہ صحت کے اصول فضول' خوراک کی ضرورت اور اس کے لئے محنت فضول' بیماریوں کے علاج کی تفتیش اور تحقیق فضول' روز مرہ زندگی میں کاروباری جدوجہد فضول' اپنے ہاتھ' پائوں' عقل' دانش اور بے شمار صلاحیتیں فضول۔ ایک کہتا ہے اللہ اللہ کئے جائو۔ دوسرا کہتا ہے' ہری اوم' ہری اوم تیسرا کہتا ہے ہائے دنیا' ہائے دولت' چوتھا کہتا ہے ہائے لیلیٰ' ہائے لیلیٰ' اور پانچواں تو سب سے ہی بڑھ گیا۔ کہتا ہے انا الحق' میں خود جدا ہوں۔ ہم خدا کو مانتے ہی نہیں جو اس جھگڑے میں پڑیں۔ آخر تم لوگ کونسی دنیا کے آدمی ہو۔ اپنے کو پہلے انسان بنالو پھر جو کچھ بن جائو تب آگے کی باتیں کرنا۔

روشن ضمیر۔ حضرات! میں بھی کچھ عرض کر سکتا ہوں۔ بُرا نہ مانو تو اس کمیونسٹ بھائی کی طرح اللہ کو نہ ماننے والے ایک طرح سے تم سب ہی ہو۔ ہوس' نفس پرستی' خودستائی' نفسا نفسی' کی بُو تم سب ہی میں سے آتی ہے۔ تم میں سے کسے قربِ حق کی تلاش ہے' کسے وصالِ حق نصیب ہے۔ دیکھو آخر ہم سب آدمؑ کی اولاد ہیں اور ایک جیسے ہی مٹی کے جسم رکھتے ہیں۔ ہم خود بخود بھی پیدا نہیں ہوئے کہ خالق کو نہ مانیں' نہ ہی خالق کی قدرتوں کے زور میں' جن کا ہم سب میں ظہور ہے' ہمیں یہ زیب دیتا ہے کہ یہ دعویٰ کر بیٹھیں کہ جو کچھ ہیں ہم ہی ہیں؟ صاحبو! ذرّہ جب سورج کی ضُوفشانی سے چمک اُٹھّے تو کیا وہ یہ کہنے لگے کہ دیکھو میری شان' دیکھو میری آن' دیکھو میری ادا' سورج میں خود ہی ہوں' مانا کہ ہم سب قدرت کی قوتوں کے حامل ہیں اور اللہ کو ماننے نہ ماننے سے ہمیں اپنی شان جمانے میں کوئی فرق نہیں پڑتا' مگر اپنی حقیقت کو دیکھو' اپنے نفس' اپنے اصل کی تلاش کرو' تو سب کچھ حقیقت کھل جائے گی۔ میں صرف یہی کہوں گا کہ ایاز قدرِ خود شناس۔ خیر چھوڑو ان باتوں کو' تم سب پر اپنے عقل و نفس' فہم و ادراک' عشق و عرفان' اپنی خودی کا ایسا نشہ چڑھا ہے کہ میری بات کب مانو گے۔ کب حقیقت سے رُوشناس ہونا چاہو گے۔ تمہیں کیا' زیادہ تر اِنسانیت کا یہی حال ہے کہ عقل و نفس' فہم ادراک' عشق و عرفان' روزِ کلام اور اپنی قدرتوں کو اُجاگر کرنے میں ایسے لگے ہیں کہ اپنے انجام سے ناواقف ہو رہے ہیں' یا جان بوجھ کر پردہ ڈال رہے ہیں۔ اپنی خواہشات میں سے تم میں سے ایک بھی باہر نہیں۔ تم خود گرفتار بلا ہو۔ کوئی نفس و مادیّت میں گرفتار ہے' کوئی قلب کی وارداتوں میں' اور کسی نے حقیقت رُوح تک رسائی کر لی تو خود ہی حقیقت کا دعویٰ کر بیٹھے کے چکر میں پڑ گیا۔ میں کہتا ہوں کہ یہ نفس' قلب' رُوح کی وارداتیں اپنی اپنی جگہ پر ٹھیک ہیں' یہ تمہاری حقیقت کا پتہ تو دیتی ہیں مگر یہ حقیقت نہیں۔

عارف۔ عزیزو! ان مٹی کی آنکھوں اور عقل کی تیزی سے حقیقت شناسی نہیں ہو سکتی۔ تمہارا دائرۂ عمل تو حواسِ خمسہ سے باہر نظر نہیں آتا۔ جن حقیقتوں کی تم تلاش کرتے ہو وہ تو الطف در الطف ہیں۔ انہیں پہچاننا ہو تو الطف در الطف کے اوصاف لائو۔ آگ کو آگ پہچان سکتی ہے۔ حق کو حق' کلام کو کلام' آگے تم جانو۔ کلام کی کرشمہ سازیاں تو اس پر تو حق کی وجہ سے ہیں جو پس پشت ہے' غیب میں ہے' تم ان قدرتوں کو اپنا ہی سمجھ بیٹھے یا اپنی کوششوں یا عشق کا ثمر' چلو یہ جدوجہد دین و دنیا کے حصول کی درست سہی مگر' کبھی تم نے یہ بھی سوچا کہ اس جدوجہد کے لئے آخر یہ جسمانی' قلبی' روحانی صلاحیتیں تم میں کس نے دیں۔ تم کس بل بُوتا پر اُچھل رہے ہو۔ کیا تمہاری پیدائش سے پہلے ان میں تمہارا کوئی دخل تھا' جواب دخل دیتے ہو'

اور مرنے کے بعد اپنا حق جمانا چاہتے ہو۔ ارے یہ تڑپ یہ جدوجہد' یہ خود نمائی' یہ خود پرستی اسی حق جمانا چاہتے ہو۔ ارے یہ تڑپ یہ جدوجہد' یہ خود نمائی' یہ خود پرستی اسی حق کی شان کا ظہور ہے جو باقی ہے اور سب فانی۔ تم تو جھوٹے نگینے ہو' جو تجلی دے رہے ہو' اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ یہ علم و عقل کا گھمنڈ' یہ تقویٰ' یہ عشق' یہ مستی جس پر تمہیں ناز ہے' اسی کا ہے۔ اور حسنِ انانیت انا الحق بھی اسی کا۔

؎ عشقِ مجنوں نیست ایں کارِ من است

حسن لیلیٰ عکسِ رخسارِ من است

چرخ در گردشِ اسیر ہوشِ ماست

فیلسوف۔ ہمیں اسی ہوش پر ناز ہے۔ اسی لئے ہم سرسری طور سے اور سطحی عقل سے کلام کو نہیں ناپتے۔ ہم تو گہرائیوں میں غوطہ زنی کرنے والے لوگوں میں سے ہیں۔ ہم جب تک بال کی کھال نہیں نکال لیتے اس وقت تک چین سے نہیں بیٹھتے۔ یہ ہے ہماری نکتہ وری کا رنگ۔ یہ کلام کا لطف لینے کا صحیح

طریقہ' اللہ تعالیٰ بھی یتفکرُون فرماتا ہے۔ بغیر منطق' بغیر دلیل کے کہاں کام بنتا ہے۔ آپ اسے دماغ سے کھرچنا کہہ لیں۔ مگر بغیر علم و فہم کے خزینوں میں تلاش اور موتی چُننے کی ہدایت کب ملتی ہے۔ ارے ہماری اُدھیڑ بن آپ لوگ کیا جانیں۔ ہم اُلجھی ڈور کو سلجھانے میں یوں لگے رہتے ہیں کہ ڈور اگر اور اُلجھ بھی جائے تو پرواہ نہیں۔ نئے نئے پھندے پڑ پڑ کر ان پھندوں کو کھولنے میں جو لطف آتا ہے' وہ دوسری طرح کیسے حاصل ہو۔ اسی طرح تو نئے نئے راز افشا ہوتے ہیں اور کلام کی حقیقت معلوم ہوتی ہے۔ یارو! ہم تو یہ کہیں گے کہ کلام میں ایسے اُلجھو کہ اسی میں سے نہ نکلو' کلام بے معنی ہو تا تو آتا ہی کیوں۔ انجیل مقدس میں ہے' اوّل کلمہ تھا' کلمہ اللہ کے پاس تھا' کلمہ خود اللہ تھا' اب آپ کے مطلب کی بات کہوں گا تو لاّئے حق کلام ہی میں ہے۔ کلام کے رمز کو پا کر ہی علم الاسماء کی منطق معانی' اور فہم آسکتی ہے۔ اسماء کے راز کھل سکتے ہیں۔ تلاشِ حق کی راہ مل سکتی ہے۔ علم و عقل ہی سب کچھ ہے۔ اللہ بھی اہل علم کی قدر کرتا ہے۔ عالم ہی کی حقیقت تک رسائی ہو سکتی ہے۔ وہی خدا کے وجود کی مضبوط دلیلیں پیش کر سکتا ہے۔ صاحبو! کلام کو سمجھا' تو صاحبِ کلام کو سمجھا۔

در بنا بد' حالِ پُختہ' ہیچ خام

پس سُخن کوتاہ باید والسلام

)پختہ لوگوں کا حال کوئی کچّا شخص نہیں پا سکتا۔ اس لئے بس بات کو ختم کرو اور سلام کہہ کر چلتے بنو(

نوخیز صوفی۔ آپ لوگوں کی باتوں نے ہمارے ایمان کو تازہ کر دیا' سُبحان اللہ' بزرگو' بھائیو' ہم نے بظاہر صوف کا لباس نہیں پہنا' ممکن ہے شرع کے خلاف ہو' مگر ہم نے تصوّف کا رنگ ضرور اپنایا ہے۔ ہم صاحبِ صفا ہیں۔ کلام کے واصف اور اوصاف کو ہم سے پوچھو۔ یوں بھی ہمارے اندر ہر دم

تذکیۂ باطن اور عرفان کے لئے وظائف وکلام کاوِرد خود بخود ہوتا رہتا ہے۔ نفس ویسے ہی مرا ہوا ہے 'لَااِلٰہَ کس کی کریں۔ یہاں تو اِلاّاللہ کا رنگ ایسا جما ہے کہ اچھے اچھے بزرگوں سے بشارتوں میں ملاقات کرتے ہیں 'لطف کلام لیتے ہیں۔ کوئی پریشانی ہوئی تو بزرگ آکر تسلی دے دیتے ہیں۔ یا قلب پر ایسی کیفیت وارد ہو جاتی کہ تسکین ہو جاتی ہے۔ ہم پر بڑے بڑوں کا ہاتھ ہے۔ اور اللہ کا کچھ ایسا کرم ہے کہ ایک قسم کی کرامتوں تک کا ظہور ہم سے ہو گیا۔ جو کلام ہم نے کسی کو پڑھنے کو دیا اس سے بہت سے لوگوں کے دینی و دنیاوی کام ہو گئے۔ میں کوئی خود ستائی کی بات نہیں کر رہا بس واقعات و واردات بتا رہا ہوں۔ سچ بات تو یہ ہے کہ میں یہ بھی نہیں کہہ سکتا کہ میں اس کا مستحق بھی ہوں یا نہیں اور یہ کرم آخر مجھ پر ہی کیوں ہوا ہے۔ شاید پیدائشی طور پر یہ قدرت کا عطیہ ہو۔ یا پھر حسب نسب کی وجہ سے ایسا ہو۔ ہاں اس پر تو اب مجھے بھی ناز ہے کہ میرے لئے کسی بیعت کی ضرورت نہیں رہی۔ لوگ کہتے ہیں شیخ کی وجود میں موجودگی ضروری ہوتی ہے۔ اپنے کو کیا۔ اپنے پر بڑی بڑی ارواحِ پاک کا کرم ہے۔ اسی لئے کلام کی لذت ہم پر وارد ہوتی ہے۔ حال طاری ہوتا ہے 'گوشہ نشینی ہو یا دنیا کے کام کاج 'ہم ہر دم ذاکر رہتے ہیں 'زیادہ کیفیت ہوئی تو چادر اوڑھ کر شدّتِ ذکر کا کیف لیتے ہیں۔ اس وقت اپنی یہ کیفیت ہوتی ہے 'کہ جو کہیں ہو جائے۔ محفل میں کبھی بیٹھنا ہوا اور کلام کی چوٹ دل پر لگی تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے اپنا کنکش لگ گیا۔ ایک جھٹکا لگا 'رُوح تڑپ اُٹھی۔ اب خود انصاف سے کہہ دیں کہ ہمیں بیعت کی کیا حاجت۔ ہم نے جب دل سے مان لیا ہے کہ ہم کسی کی ارواحِ مقدسہ سے بیعت ہیں تو یہ بالوجود بالشہود کا جھگڑا کیا۔

ارے صوفی ءباشفا منم معنی لَااِلٰہ مَنَمْ

ہم چاہیں تو بزرگوں کے نام پر بیعت بھی لے سکتے ہیں۔ ہم ہیں سالک اور دینی بادشاہت کے حقدار 'جانشین اولیاء اس میں واقعی کوئی کلام نہیں۔

شاد باش اے عشق خُوش سودائے ما

صوفیہ۔ لیجئے جب یہ نئے نئے چُوزے بھی اذان دے سکتے ہیں تو ہم کیوں خاموش رہیں۔ ارے یہ مرد تو سارے کے سارے ہر جگہ اپنی بادشاہتیں جماتے ہیں۔ کہتے ہیں کبھی عورت نبی نہیں ہوئی۔ مگر ہاں کلام کلام جو تم کر رہے ہو اس کا بھی تو جواب دے لوں۔ ارے کلام کرنا تو ہمارے ذِمّہ کیا گیا ہے۔ ہمیں بغیر کلام پیدا ہوتا ہے۔ یہ ہے پتے کی بات 'عورت نبی نہیں ہوئی تو کیا 'نبیوں کو جنم تو دیا ہے۔ ہم نہ ہوتے تو نبی کہاں سے آتے۔ ہم ہی میں ظہورِ کُن ہے۔ ہم ہی حقیقت کی آواز ہیں۔ ہم اس کلام کے قائل ہیں جو خود بخود پھوٹ کر نکل رہا ہو اور اس سادگی سے کہ ہم کسی بات کو پیٹ میں رکھنا نہیں جانتے۔ ارے سمجھو تو کلام اُگلنے کے لئے ہے نگلنے کے لئے نہیں۔ اب ذرا سنجیدگی کی بات سُن لو۔ ہمیں دیکھو کہ کتنا اپنے کو سپرد کر کے ہم کلام پڑھتے ہیں کہ کلام اللہ بھولے سے بھی اگر لے کر بیٹھ جائیں تو اچھے اچھے مسحُور ہو جائیں۔ یہ ہوتی ہے کہ کلام پڑھنے کی تاثیر جو پڑھنے والا بھی اپنے انداز میں کلام کو دے سکتا ہے۔ آخر ہم میں بی بی رابعہ بصریؒ کی نسبت ہے۔ ہم ہی تو ہیں۔ جن میں تم ربُوبیت کا ظہور دیکھتے ہو۔ ہم ہی ہیں جن سے اللہ میاں بھی باتیں کرتے ہیں۔ اور جیسی ہماری مرضی ویسا ہوتا ہے۔ ہماری پرواز زمین سے آسمان تک ہے۔ ہم ہی اَصْلُہَا ثابتٌ فِی الارْض (اسکی جڑیں مضبوط ہیں زمین میں) کے مصداق ہیں۔ ہم چاہیں تو زمین آسمان کے قلابے ملا دیں۔ مگر ہم ہی سنبھالے ہوئے ہیں دنیا کو بھی اور دین کو بھی۔ یہ اور بات ہے کہ

عورت ذات کو کوئی ناقص العقل کہہ دیتا ہے کوئی صنف نازک۔ مگر کہے دیتی ہوں کہ جو ہماری زبان کی قینچی میں پھنس گیا' اس کو کاٹ چھانٹ کر ہی چھوڑتے ہیں۔ ارے یہ صوفی کیا' یہ فلسفی' یہ عابد' یہ عامل وغیرہ ہی نہیں بلکہ بڑے بڑے اولیاء تک ہمارے آگے گھٹنے ٹیک دیتے ہیں۔ اور جو ہم نے کہا کان دبا کر اس پر عمل کرتے ہیں۔

بادہ درجوشش گدائے ہوشِ ماست

)پیالہء شرابِ عشق اپنے جوش میں ہمارے ہوش کا بھکاری ہے)۔

مہارِشی۔ اوم پدمی اوم

ذات صِفات سے ہو نرمِل جب سن میں سادھو دھیان دھرے

سمرِ سمرِن پے ہرے نارائن ہرے نارائن ہرے

بھگتو! جو خاموشی میں سکون ہے وہ کلام میں کہاں۔ کائنات ایک سکون میں ہے' توازن میں ہے' توحید میں ہے' ہم اپنی خواہشات اور نفس کے چکروں سے نکل کر سُنّ والی سطح حاصل کئے ہیں۔ ایک کیفِ سرمدی' ایک سکونِ ابدی ہمیں نصیب ہے۔ ہم لامحدود سے وحدت میں ہیں۔ پھر جیسے سمندر کی پر سکون سطح سے ہوا اٹھ کر سب کو گھیر لیتی ہے' اسی طرح ہماری پُر سکون سُن کی کیفیت سے جو لہریں نشر ہوتی ہیں وہ زمانہ پر اثر کرتی ہیں۔ ہم سکون میں ہیں' تو زمانہ سکون میں آئے گا۔ جہاں بھی اچھے لوگ ہوں گے وہ ان آنند اور شانتی کی لہروں کے اثر میں آتے جائیں گے۔ اور صرف یہ کہ ان کے اعمال اور اخلاق کی درُستگی ہوتی جائے گی' بلکہ دنیا کی جنگیں بھی' اسی طرح روکی جاسکیں گی۔ ہم کسی سے بات نہیں کرتے' اُپدیش (درس) نہیں دیتے کیوں کہ اس سطح سے لوگوں کے اندر یا ان کی رُوح تک نہیں پہنچا جاسکتا۔ ہم تو روشنی یا نور کی کِرن کے دھارے پر سوچتے ہیں' اور فِکر کرتے ہیں۔ ہم نے سکون' یہ شانتی' یہ آزادی' گیان' دِھیان حاصل کی ہے۔ مقررہ' نکتہ پر توجہ دینے سے اندر کی رسّیاں جب ٹوٹتی ہیں تو رُوح آزاد ہو جاتی ہے۔ ہمارے اندر رُوح کی بند تتلی موجود ہے' یہ پھٹ کر اُڑے تو زمان میں آزادی مل جاتی ہے۔ جو لوگ جسم کی محمل کو لیلیٰ سمجھ بیٹھے ہیں اور مکان کو مکیں' وہی اگیان اور غلط فہمی میں ہیں۔ انسان کو توحید سے پیدا کیا' توحید کے لئے پیدا ہوا۔ مُنتہائے مقصود توحید ہے۔ جب خود آگہی کا دروازہ کھل جائے تب کہیں توحید کا راز ملتا ہے۔

ہم ذاتِ حق میں غرق رہتے ہیں۔ بھگوان ہمارے ساتھ ہوتا ہے' اسی لئے جب ہم اپنے بُت بناتے ہیں تو ہر ایک میں اس کی ایک شان کو اپنا کر ان سے فائدہ لیتے ہیں اور بُت شِکنوں کا یہ حال ہے کہ اپنے ہادی' اپنے سچے بُت کو جو موجود ہے' نہیں اپناتے۔ وہ اس کے موجود ہونے پر یقین کب کرتے ہیں؟

سوچو کہ جب وجود ایک وحدت ہے' سب کائنات ایک ہی اِکائی ہے' تو غیر کون ہے۔ کون کافِر' کون مسلمان' شِرک اور بُت پرستی ہو کب سکتی ہے' جب خود مسلمان کہتے ہیں کہ وہ وَحدَہُ لَاشَرِیکَ لَہٗ ہے۔ غیریت تو سب فنا ہو جانے والی بات ہے۔ نُور کے آگے تاریکی رہ کب سکتی ہے۔ وہ ذاتِ حق ایک ہی تھی' ایک ہی رہے گی۔ بحرِ حقیقت ایک ہی ہے۔ جب قطرہ سمندر میں جا ملا تو سمندر کہلاتا' آتما پرماتما سے جا ملی' ذرّہ آفتاب چمکا تو آفتاب کہلایا۔ چیلا جب گرُو کے قدموں میں آ گیا خود گُرو ہوا اب 'میں' کون 'تُو' کون۔

؎ بھیک مالی بھئے مالی بھیک بھئے نارائن ہرے نارائن ہرے

مردِ آزاد۔ اے علم و عقل و توحید و جدان و عرفان میں گرفتار لوگو! ہم تو مرد آزاد ہیں۔ کلام اور اس کی تمام بندشوں سے آزاد۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم کلام سے منحرف ہیں یا اس کی گہرائی اور رموز سے بے بہرہ اور ناآشنا ہیں۔ ہم تو حروف کے درمیان سیاہی کی طرح آزاد ہیں۔ یوں سمجھ لو کہ جیسے سمندر میں موج آزاد ہو۔ نہ اسے سمندر کہہ سکتے ہیں نہ موج۔ مگر چونکہ جسم میں ہیں اس لئے یوں کہہ لو کہ بچّہ کی طرح ماں کی گود سے آزاد ہیں مگر ہر دم ماں کی نگہ میں ہیں اور ہماری نِگہ ہر دم ماں پر ہے۔

ہماری موج کی پوچھو تو ہم ایک ہوا کے جھونکے کی طرح ہیں کہ جدھر چاہا اُدھر جا نکلے۔ ہمارے لئے کیا گُل و گلزار کیا ویرانے' کیا عبادت گاہیں' کیا خراباتِ رِندی۔ ہم ہوا کی طرح کبھی نرم خرام' پُر سکون اور کبھی طوفانِ گرد باد۔ کبھی آسمانوں کی طرف چڑھتے ہوئے کبھی زمین کی طرف اُترتے ہوئے۔ مگر ہماری کوئی آزادی' نہ قانونِ فطرت سے باہر ہے نہ قانونِ فطرت کے خلاف ہے۔ کلام کے معنی کی طرح ہمارے رمز ستر ہزار پردوں میں' ستر ہزار سطحوں پر۔ اسی کا سارا اثر ہماری زندگی پر ہے۔ کیا بچپن' کیا جوانی' کیا بڑھاپا ہم بھی ہدایت ہیں بہت سوں کے لئے اور گمراہی بہت سوں کے لئے۔ اسی لئے کبھی ہم خوشبودار غلاف لپٹے ہوئے' کبھی پارینہ اوراق کی طرح طاقوں پر رکھے ہوئے ہوتے ہیں۔ دنیا میں نکلے تو دنیادار کہلائے' ملامتی گردانے گئے۔ پردوں میں چھپے تو مجذُوب کہلائے' تارک الدُّنیا ٹھہرے۔ الغرض سو' ادا' سو نام پائے۔

ہمارے لئے دستر خوان کا کھانا' یار کا کھانا۔ ہمارا نہ کوئی مقام نہ ٹھکانہ' نہ کوئی مزار نہ آستانہ۔ پیاسے کی طرح ہر کنوئیں سے پانی پیا۔ بھونرے کی طرح ہر پھُول کا رس چُوسا۔ ہمارا ہر عمل یار کی راہ میں مقبول' جھوٹ سچ' داد و ستائش' طعن و تشنیع سب فضول' ہم ظاہر بینوں کے لئے لالچی' حریص' برباد' تمام آداب و تہذیب سے آزاد' مگر ہمارا اصول محبّت میں جینا' یار اپنا' دُنیا اپنی' جہان اپنا۔

بنجر زمین کی طرح ہم ہر بوجھ' اٹھانے سے آزاد' مگر ہر بوجھ کے لئے تیار۔ اسی لئے سرکاری ٹیکس سے آزاد۔ قصّہ مختصر' ہم کلام میں حروفِ مقطعات کی طرح ہیں۔ نامحرموں کے لئے بے معنی' عاشقوں کے لئے ایک ادا' عارفوں کے لئے ایک جھلک اور محرموں کے لئے ایک کھلی کتاب۔

کورا۔ ہم بھائی نہ مرد ذات' نہ عورت ذات' ہم وہی ذات ہیں جو اللہ ذات۔ ہمیں تو تم میں سے ایک بھی غیر نہیں معلوم ہوتا۔ اس کے علاوہ ہے کیا جو غیر سمجھیں۔ ارے جو بھی کلام ہے اسی کا کلام ہے۔ اس میں شِرک کیا کریں۔ دوسرے کا دخل کیا سمجھیں۔ جب ہر شے کی حقیقت ایک ہی ہے تو یہ

جھگڑے ختم، ثواب عذاب ختم، گناہ گاری اور پرہیز گاری کا چکر ختم۔ جب کچھ ہے ہی نہیں فضول چکر میں پڑتے ہو۔ بس اتنا مان لو کہ ہے تو سب جھگڑے ختم جو 'ہے' سو 'ہے'۔ ہاں ہاں بولو 'جو 'ہے' سو 'ہے'۔

قلندر

مہر و مہ و انجم کا محاسب ہے قلندر

ایّام کا مرکب نہیں راکب ہے قلندر

لوگو! میں پوچھتا ہوں کلام سوائے دو حروف کے ہے کیا' اسی لئے تو قلندر جز دو حروف لا الہ کچھ بھی نہیں رکھتا۔ تمام کلامِ ربانی دو حروف کاف 'نون کا پھیلاؤ ہے۔ اس کن کی لذّت لو' اور زندگی ہے کیا سوائے اس کُن کے کیف کے۔ یہ کُن تو کائنات کے ذرّہ ذرّہ میں پھوٹ رہا ہے۔ ہمارا کلام دمادم' ہمہ دم' دمادم مست قلندر' جو دم غافل وہ دم کافر۔ دمادم مست قلندر۔ ہمارا رُواں رُواں ذاکر۔ ہماری ہر سانس دوسری سے تیز تر۔ کون جانے اس شدّتِ ذکر کو۔ علی علی۔ ارے یہ ذکر پڑھنا پڑھانا کچھ نہیں ہے۔ یہ تو سراپائے یار ہے۔ دشت آہو کے آہو کی طرح اپنے ہی نافہء ذات کی خوشبو کی مستی ہے۔ ہم الاظ کے چکر میں نہیں پڑتے۔ ہم تو حسنِ ذات کا نظارہ مجردات کے آئینہ میں کرتے ہیں۔ سراپائے حُسن' شِدّتِ شوق' تب و تاب جاودانہ' نعرۂ و لگیر' آہ پر سُوز' موتی کی آب' شمشیر کی جِلا' عصمت کی حیاء' کلی کی خوشبو' آئینہء رُخسار' اللہ ہُو۔ غرض ہر لطافت میں ایک سرُور' ایک ترنگ اور الطف در الطف کا رنگ۔ ہم ہی صاحب کاف و نون' ہم ہی مقصدِ ذات بے چگون۔ اسی لئے ہم کلام کے حافظ نہیں ہیں' ذات کے حافظ ہیں۔ کلام کے حامل نہیں' حاصل کلام ہیں۔ کلامِ ازلی سے سرشار ہیں۔

ہم مست ہیں مگر باہوش' ہم ہست ہیں نیست نما۔ ہم نیست ہیں ہست نما۔ ہمارا ایک دن دوسرے سے جُدا۔ ایک شِدّتوں کی حقیقت ہماری صبح و شام۔ کُلَّ یُومٍ ھُوَ فِیْ شَان (ہر روز اس حق کی نئی شان ہے) ہم چار ابرُو صاف، پابہ زنجیر، سربردار۔ نہ ہماری منزل نہ ہمارا قیام، فَبِاَیِّ الآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبَان) O اپنے رب کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے (

کملی پوش۔ صاحبو! خوش نصیب ہیں کہ ہر حال میں بندوں میں شمار ہے۔ ہم اپنی طرف بھی نظر ڈالیں، بندہ بندہ ہی ہے، اور مولیٰ مولیٰ۔ ہمیں اسی پر کیا کم ناز ہے کہ اپنے کہلانے کے مستحق ہوئے۔ ورنہ وہ تو بے نیاز ہیں، کسی کو کیا منہ لگائیں۔ ہم اپنی عاجزی، مسکینی پر فخر کرتے ہیں۔ اور یہ بھی اس لئے کہ عجز ہی اس کے پاس نہیں۔ تم جو کچھ بھی ہو، اپنے کو مٹا کر، اپنے کو درمیان سے ہٹا کر اس کی جلوہ فشانی بھی ذرا دیکھو۔ یہ مٹی کا کثیف جسم، اور اس کے دھوکے والے کھیل، ہم ان لطافتوں کے ساتھ کیوں شامل کر کے شرک کرتے ہیں۔ ذرا اپنی لطافتوں پر نظر رکھ کر خود بتاؤ کہ یہ تمہارے پیچھے کون جلوہ افروز ہے۔ یہ تو اس کا احسان بنے کہ خود پردۂ غیب میں رہ کر ہمیں سامنے کر دیا۔ اب ہماری بندگی کا تقاضہ ہے کہ اس احسان کا بدلہ یوں دیں کہ خود پسِ پردہ رہ کر اسے سامنے کر دیں۔ فقیر جس کملی میں ہوتا ہے اسی کی کملی ہے۔ اس کی تلاش کرو جو تمہارے غیب میں ہے۔ اس کا قرب حاصل کرو۔ کلام سے کب تک لپٹو گے، بندگی کا مزہ بھی ولو، کلام جو کہ رہا ہے وہ کر کے دیکھو، ہو کے دیکھو، یہ تم اپنی اپنی فکر کیا کر رہے ہو۔ آخر اپنی کوشش سے کونسے

مقامات حاصل کرلو گے جو اس نے تمہیں نہیں دے رکھے۔ کیا اس کی مرضی سے بھی آگے نکل جانا چاہتے ہوں۔ محبوبؐ کے ساتھ صبر کا مقام حاصل کرلو۔ پھر دیکھو توکل کا انداز۔ تم تو ایسے بے صبرے ہو کہ خدا کے لئے پرکب صبر۔ تم تو جیسے اس کی مرضی میں دخل دیتے ہو کہ ایسا نہ ہو ویسا ہو۔ یہ کر وہ نہ کر۔ ارے معاذ اللہ، تم نے تو بھائی کمیونسٹ کی طرح اللہ کو معدوم سمجھ رکھا ہے یا ایسی توحید جمائی ہے کہ خود خدا بن بیٹھے ہو۔ اگر اسے واقعی موجود سمجھ رہے ہو تو پھر اسے خادم بنانے کی فکر میں کیوں ہو۔ آخر تم کونسی اپنی اپنی نئی دنیائیں بسانے کی کوشش میں ہو۔ مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نہ تم کلام کی حقیقت کو ڈھونڈتے ہو، نہ کلام والے کو، نہ کلام پر عمل کرنا چاہتے ہوں نہ خود کلام ہونے کا لطف لینا چاہتے ہو۔ ہمیں دیکھو۔

؎ رازِ قرآن مغز را برداشتیم

اِستخواں پیش سگاں انداختیم

)ہم نے قرآن سے مغز چُن لیا ہے۔ ہڈیاں کتوں کے آگے ڈالدی ہیں(

فقیر۔ دوستو! میں بھی فقیر ہوں اور فخر کرتا ہوں اس فقیری پر جو کسی کے در سے ملی ہے۔ کلام پڑھنا نہیں جانتا میں تو کلام ہونا جانتا ہوں۔ مگر ہاں کلام کی اتنی لاج ہے اور میں اتنا حیا والا ہوں کہ اگر ڈوبنے بھی لگا تو کلام کا سہارا نہ لوں گا۔ ہم عاجز مسکین راضی بہ رضا ہی رہنا جانتے ہیں۔ باقی سب حکم عدولی۔ ہم جسمانی اور رُوحانی، غرض ہر سطح کی زندگی کو ٹھوس حقیقتوں کے ساتھ گذارتے ہیں۔ ہماری غیرت کا یہی تقاضہ ہے کہ آسمان پر بھی اگر مولیٰ کریم اُڑائے تو قدم زمین پر ہی رہتے ہیں۔

؎ مستی میں بھی سر اپنا ساقی کے قدم پر ہو۔

O عزیزو! ہم دنیا کو دنیا ہی کے انداز اور طریقے سے گذارتے ہیں اور دین تو گویا ہماری ساری زندگی ہے۔ تمہیں بتائوں کہ فقیر علم الاسماء کا مصداق بھی ہوتا ہے اور خلیفۃ اللہ کے رُوپ میں بھی۔ وہ اللہ سے بھی واصل ہوتا ہے اور مخلوق میں بھی شامل۔ ارے فقیر کا قدم بس ایسا ہے کہ جہاں گیا، باطل رفع ہوا اور خود بخود اس سادگی سے جیسے روشنی کے آگے اندھیرا۔ اس کے باوجود اس کی عاجزی مسکینی دیکھو کہ خود کچھ بھی نہیں۔ وہ اپنی خواہشات سے بہت پہلے ہی کا مر چکا ہوتا ہے۔ اس حالت میں وہ کچھ اس طرح جی رہا ہوتا ہے کہ جیسے دنیا کے پانی میں ہوتے ہوئے بھی اس کے پائوں بھیگنے نہیں پاتے اور لطف یہ کہ وہ اس حالت میں بھی دین دنیا کا توازن نہیں کھوتا، بلکہ اُلٹا دین دنیا کو توازن میں رکھتا ہے۔ تم کہو گے یہ کیسے ہوتا ہے۔ بات سادہ ہے۔ فقیر کی گڈری میں بھی تمہاری طرح لعل ہوتا ہے جس کی گرہ کھولنا اس نے سیکھ لی ہوتی ہے۔ نافہء ذات ہم سب میں ہے۔ فقیر نے اس کو پالیا ہوتا ہے اور خوشبو کی لطافتوں سے وہ اپنے ماحول کو معطر کرتا ہے۔ اس طرح فقیر خود رازِ حقیقت بن جاتا ہے۔ اور اسی لئے وہ تکمیل نفس، تسکین قلب، ہو اللہ کا مصداق ہو جاتا ہے۔ اب حَیُّ وَقَیُّوْم اس میں بہہ رہا ہوتا ہے۔ وہی زمانہ ہوتا ہے، وہی صاحب زمانہ۔ تب ہی تو فقیر آمر باللہ، قسمت کا لکھا بدل دیتا ہے۔ اور اگر چاہے ایسا ہو ویسا نہ ہو تو ایسا ہی ہو جاتا ہے۔ صرف دل سے کہہ دینا ہوتا ہے۔ اللہ ہی تو بول رہا ہوتا ہے، اس کھوکھلی بانسری میں

سے۔ البتہ صوتِ سرمدی کو نغمہ لاہُوتی بنانے کے لئے سوراخوں پر انگلیاں چلانے کا حق اسے ہوتا ہے۔ یہ ہوتی ہے اس کلام کی حقیقت جو ماہیت وجود سے ہم آہنگ ہوتا ہے اور اپنی بنیادِ وجود سے نکل رہا ہوتا ہے۔

کیونکہ علم کا موجود اور فقر کا موجود اور اَشْھَدُ اَنْ لاَّاِلٰہَ اَشْھَدُ اَنْ لاَّاللّٰہَ

غیب کی آواز۔ یہ کون ہے جو سب راز کھولے دے رہا ہے۔ رب کی تجلّی کی صحیح آئینہ دار تو رُوح ہو سکتی ہے نہ، گوشت پوست۔

آدمی دید است باقی پوست است

دید آں باشد کہ دیدِ دوست است

)آدمی تو بس دید ہے اور باقی کھال۔ اور دید وہی ہے جو دوست کی دید ہو۔(

تمہاری رُوح کی حقیقت امر ہے، کُن ہے۔ کُن کا حامل ہو جانا، وصالِ حق کی بات ہے۔ ایک چراغ دو لو والی بات ہے۔ دونوں لوئیں فروزاں، تم اس اندازِ یکتائیت کے ساتھ راضی بہ رضا رہنا سیکھو۔ مرضیءِ حق کو دیکھ کر اسکے ساتھ جیو اور اس کا ہاتھ بٹاؤ۔ تب آئے گا لطف بندگی۔ تب آئے گا کیف زندگی۔ یہ ہے برزخِ محبوبیت۔ اسی مقام کی برزخ سے رحمت لِّلعالمین کے سہارے اُمّت کے کام کئے جاتے ہیں۔ عجز کی، حیاء کی چادر اوڑھ کر حق سے واصل ہو کر، اس مقام کی شرع محمدیؐ کی پابندی بس نسبت محمدیؐ کے طفیل ہی ممکن ہے۔ یہ ہے سرِ، خفی، اخفا اور غیب سے پرے کی بات۔ پھر حَیُّ و قیُّوم کے انوار تمہیں میں سے نشر ہو رہے ہوں گے۔ کلام و کتاب تم ہی سے اُبلے گا۔ اللہ ہی تو بول رہا ہو گا۔ اور تم کھوکھلی بانسی۔ ایسی حالت میں تمہاری کہی ہوئی بات اللہ کی بات ہو گی۔

گفتہ اُو گفتہ اللہ بُود

گرچہ از حلقومِ عبداللہ بُود

)اس کی کہی ہوئی بات اللہ کی کہی ہوئی بات ہوتی ہے، اگرچہ وہ بات اللہ کے بندے کے حقل سے نکلی ہوتی ہے(۔

خلقت۔ یہ کون ہے۔ یہ کون ہے جو پس پردہ بول رہا ہے۔ ارے یہ آواز تو خود ہمارے اندر سے نکل رہی ہے۔ کون ہو تم، کہاں ہو تم۔

غیب کی آواز۔ غیب میں۔ ارے تمہارے ہی غیب میں۔ یہ اندر باہر، پاس دُور، زماں مکاں میں کیا ڈھونڈتے ہو۔

خلقت۔ ربِّ اَرِنی۔ تجلّی دکھا۔

غیب کی آواز۔ میری تجلّی، میری تجلّی تم خود ہو۔ جھلک ایسے میں دیکھو جس کی زبان میں شِفاء، جس کے ہاتھ میں عطا، جس کے چہرہ پر حیاء، جس کی آنکھیں نمناک ہوں۔ وہیں میں ہوں۔ یہ میں ہوں، میں ہوں

سب۔ میں ہوں، میں ہوں، میں ہوں

غیب کی آواز

ے آں را کہ خبر شُد خبرے باز نیامد

) جسے حقیقت کی خبر ہوئی، وہ گم ہوا، اس کی خبر ہی پھر واپس نہ آئی)۔

باب ۱۲

مادِیّت کے دجال پر ضربِ کاری

اوّلین منزل

فروغِ اسلام کی راہ میں بیت المقدس بھی ایک منزل ہے۔ ایک نشانی ہے، احیائے اسلام کی، انبیائِ سابقہ کے مرکزیت کے مقام کی، ارتقائے اسلام کی ایک کڑی کی، جس کا تعلق لطیفہء مقامِ امر، مقامِ ذات کی طرف رجوع ہوا، تو نماز میں رُخ مکہ معظمہ کی جانب پھیر دیا گیا۔ تکمیل نفس تسکین قلب، ھُوَ اللہ کی نشانی تھی، ذات کو اپنے اندر سمو لینے کی بات تھی۔ کعبہ، نشانیءذات، مقامِ توحید، ابراہیمؑ خلیل اللہ جس نے اپنا چہرہ اس چہرہ کی طرف کیا جس نے سموٰات اور ارض بنائے۔ اِنِّیْ وَجَّہْتُ وَجْہِیَ لِلَّذِیْ فَطَرُ السَّمٰواتِ وَالاَرْضِ حَنِیْفاً ابراہیمؑ وہ جو حنیف کہلائے، ابراہیمؑ وہ جو مشرکوں میں سے نہ

تھے، ابراہیمؑ وہ جو خلّت سے نوازے گئے، خلیل اللہ کہلائے، ابراہیمؑ وہ جنھیں ختمی مرتبت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا باپ کہا اور اسلام کو دین ابراہیمی، دین حنیف کی راہ پر ہی گامزن رکھ کر عروج کی منزلِ آخریں کی طرف بڑھایا۔

مسجد حرام کے رجوع سے پہلے کی منزل مسجد اقصیٰ ہے، بیت المقدّس ہے۔ بیت المقدس، پاک گھر، انبیائے سابقہ کے رجوع کی جگہ، انبیائے سابقہ کی عبادت گاہ اور مرجع خلائق۔ حضرت سلیمانؑ، حضرت ذکریاؑ، حضرت یحییٰؑ، حضرت صالحؑ، حضرت شعیبؑ، حضرت موسیٰؑ، حضرت ہارونؑ، حضرت دائودؑ کی پاک زندگیوں سے مزین شدہ مقام، پاک قلوب کی شِدّتِ اذکار کے بازگشت کی دائم نشانی۔ اب پھر عرصہ سے، عالم اسلام کی نگاہ اسی بیت المقدّس کی جانب اٹھنا لازمی سی بات ہے۔ کیونکہ یہ وہی مقام ہے جو مسلمانوں، عیسائیوں، یہودیوں، سب کے لئے مقدس ہے۔ سب کے لئے باعث عزت و تکریم ہے۔ اسی سلسلہ میں حال ہی میں کراچی کے دانشور حاتم علوی صاحب سے گفتگو رہی جس کا ماحصل اس مضمون کی صورت میں پیش کیا جارہا ہے۔ اس مختصر سی گفتگو کی اہمیت، یوں اور بھی زیادہ ہے کہ اس کا تعلق عام، عالم اسلامی سے ہے اور اس کی طرف قوم کی فوری توجّہ مبذول کرانے کی ضرورت ہے۔

مرکزیّتِ باطن

حاتم علوی صاحب وہ تجربہ کار اور معمر شخصیت ہیں جو احیائے اسلام کو صرف خیالی اور قیاسی طور پر نہیں دیکھ رہے بلکہ ایک حقیقت کے طور پر اور ایسی زندہ کیفیت میں جیسے کہ کوئی گل چین ایک کلی کو شگفتہ ہوتے ہوئے دیکھتا ہے اور یقین کے ساتھ کہتا ہے کہ فروغ ہو رہا ہے۔ ان کی نگاہ میں اسلام اپنی منزلِ عروج کی جانب گامزن ہو چکا ہے۔ یہ نگاہِ بصیرت انکی اس صداقت کا نتیجہ ہے جو بے پناہ محبّت کے ساتھ انہیں اپنے طویل عرصہء حیات میں عالم اسلام سے رہا ہے۔ انہوں نے جہاں قائد اعظمؒ، اتاترک، اور عبید اللہ سندھی سے ملاقاتیں کیں وہاں غیر اقوام کے اکابرین اور عہد سابقہ اور عہد حاضرہ کی تصانیف سے بے شمار اِستفسادہ حاصل کیا۔ آج صحیح معنوں میں کراچی اور پاکستان ہی کیا، اگر عالم اسلام کی چند شخصیتوں کو بطور اُمّت کے بیش بہا موتیوں کے طور پر پیش کیا جاسکتا ہے، تو ان کا مقام ان انمول نگینوں میں ضرور ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ اپنے موجودہ ارتقاء کی راہ میں مسلمانوں کو بیتُ المقدّس کی مرکزیّت کی جانب پھر سے رجوع ہو کر ایک مرکزیّتِ باطن حاصل کرنی ہے۔ موجودہ مادّی نظام اور طرز و فکر زندگی میں یہ عجب بات ضرور معلوم ہوگی اور عقل و دانش کے اصولوں میں کسی طرح دانشورانہ، حکیمانہ، باقرین قیاس اقدام تصوّر نہ کیا جائے گا۔ مگر باطن کی کڑی مضبوط کرنے کی اہمیت جاننے والوں کے لئے یہ ضروری عمل ہوگا۔ انکا کہنا ہے کہ گاندھی کی تحریک کھدّر پہننا اور سُوت کاتنا صرف مادّی سطح تک کی بات تھی اور کتنی بعد از عقل بات معلوم ہوتی تھی، مگر ایک عظیم حکومت کو ہلا کر رکھ گئی۔ بیت المقدّس کی طرف رجوع کے سلسلہ میں بات کسی اور سطح کی ہے۔ یہ قلب و جان کی سطح سے نکل کر عالم قُدس کی بات ہے۔ اسلام اپنے ابتدائی دور میں سخت ترین آزمائشوں اور صبر کی منازِل سے گزرا ہے۔ یہ اس کی باطنی مضبوطی اور فلاح کے لئے ضروری تھا۔ اس صبر آزما دور سے گزر کر ہی کہیں غازیانہ عزم و حوصلہ سے میدانِ عمل و کارزار میں اتر آئے اور سُرخرو ہوتے چلے گئے۔

اِسلام اور تلوار

جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ اسلام تلوار کے زور سے ہی قائم رہا اور تلوار کے زور سے ہی پھیلا وہ یہ بھی تو دیکھیں کہ کتنے طویل، صبر آزما، اور حوصلہ شکن دور سے، ہر فردِ ملّت کو، اس تلوار کو ہاتھ میں لینے سے پہلے گزرنا پڑا تھا۔ اور پھر تلوار ہاتھ میں لینا بھی کس انداز کا تھا۔ یہ بھی تو دیکھیں کہ کہیں بھی کسی معرکہ میں بھی یہ صورت نہ تھی کہ ایک مضبوط جماعت کسی کمزور جماعت یا قوم پر غالب آتی چلی گئی، جیسا کہ چنگیز، ہلاکو، سکندرِ اعظم، قیصر، کِسریٰ، نپولین، ہٹلر، مسولینی، سلطنت برطانیہ، فرانس، جرمنی، اسپین وغیرہ کا انداز تھا اور نو آبادیات اور غلامی کی زنجیروں میں انسانیت کو جکڑتے چلے جانے کا سلسلہ چلتا رہا۔ یہاں تمام صورتوں میں ایک جابرانہ انداز تھا، کہ ایک مضبوط، مسلح، لشکر کمزور قوموں پر چڑھ آتا یا پھر اقتصادیات کی شاطرانہ چالوں سے ہوسِ زر میں مفلوکُ الحال قوموں کا خون طرح طرح سے چُوسا جاتا رہا۔ اسلام کی تمام جنگوں کا اسکے برعکس یہ حال تھا کہ ہر معرکہ میں ایک کمزور، غیر مسلح، لشکر اسلام کا مقابلہ اپنے سے کہیں زیادہ طاقتور دشمن کے ساتھ تھا۔ نہ تیاری تھی، نہ اسلحہ سازی، اپنی بساط اور مقدرَت کے مناسب ہی تھوڑا بہت ساز و سامان مُیسر آتا تھا اور ہر جگہ، ہر معرکہ، ہر جنگ میں ایک آہنی دیوار سے ٹکرا جانا ہوتا تھا۔ پوری تاریخِ اسلام دیکھی جائے تو یہی نقشہ نظر آتا چلا جائے گا خواہ وہ نبی کریمؐ کے غزوات ہوں یا خالد بن ولیدؓ کی فتوحات، محمود غزنوی کا دور ہو یا صلاح الدین ایوبی کا، شہابُ الدین غوری کا زمانہ ہو یا بابر کا، محمد بن قاسم کی لشکر کشی ہو یا طارِق بن زِیاد کی۔

جذبہء عمل

تو اب بیتُ المُقدّس خالی کرانے کے لئے جو اقدامات کرنے ہیں ان میں جنگ کی تیاری کے علاوہ دوسری صورتوں پر بھی غور کرنا ہے۔ اسلحہ کی کمی اور طاقتور دشمن سے مقابلہ کے تصوّر سے آج کی بات کل تک ٹالتے رہنے سے کام نہ بنے گا۔ ضرورتِ وقت کے لحاظ سے بھی کوئی مثبت پیش قدمی کرنی ہوگی۔ مومن کے ہر عمل میں صداقت اور شِدّت عزم ہوتی ہے۔ اپنی نفسا نفسی کی جگہ ایثار کا جذبہ ہوتا ہے۔ شِدّت ہو تو ایک ماں اپنے بچے کو بچانے کے لئے یا ایک نوجوان اپنے بزرگ کے لئے سینہ سپر ہو جانے کے لئے ہتھیاروں کا سہارا ڈھونڈتا نہیں پھرتا بلکہ بے اختیارانہ جذبہ کے تحت کچھ نہ کچھ عمل کر گذرتا ہے۔ ان حالات میں اسے نہ نتیجہ کی فِکر ہوتی ہے، نہ اپنی بے بضاعتی کی۔ بس ایک جذبہ ہوتا ہے اور اس مُثبت انداز کا کہ فِدا ہونا ہی جانتا ہے۔ وہ عقل و فہم کے اصولوں سے ماوراء ہو کر مصلحت بینی اور مافیہا سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔ یہ جان دینا، یہ فِدا ہونا ان کا کام ہوتا ہے جو کفن پہن کر، احرام باندھ کر، سر ہتھیلی پر رکھ کر، محبوبؐ کے نام پر فِدا ہونے کے لئے باہر نکل آتے ہیں۔ اسلامی تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو مسلمانوں کا پامردی سے اپنے اصولوں اور عزم پر ڈٹے رہنا صرف چند دن یا چند ماہ کی بات نہ تھی بلکہ برسوں ہر مخالفت کے باوجود سختی سے اپنے اصولوں پر قائم رہنا اور اپنے مشن کے فروغ کے لئے اپنے کِردار پر اعلیٰ سطح پر زندگی گزار دینا انکا مَطمَحِ نظر تھا۔ اس طرح عام انسانی سطح سے بلند ہو کر اپنے ارادوں اور حوصلوں پر ثابت قدم ہو جانا، سُستی، کاہلی، تن آسانی، اور شکست سے بہت اوپر کی چیز ہے۔ یہ ہے احسان اسلام کا اس کائناتِ عالم پر۔

آج عدم تشدّد کا بڑا پرچار زمانے میں کیا جا رہا ہے۔ اس عدم تشدّد کی مُثبت مثال پیرویانِ اسلام نے زمانے کے آگے پیش کی۔ انہیں نہ دُشمن کا لشکر و جاہ مرعوب کر سکا، نہ مال و دولت، نہ تہذیب و تمدن کی جھوٹی روشنیاں۔ اس پامردیء مومن کے پس پُشت وہی جذبہ تھا جس نے تاجِ قیصر و

کسریٰ کو پائوں سے ٹھکرا دیا تھا۔ یہ ایمان کی روشنی تھی جس نے انسان کو اس کے اعلیٰ مقام سے روشناس کرایا تھا۔ ان کے نزدیک قابل احترام ہستی وہی تھی جو متقی ہو اور دنیا کے زر و مال، اقتدار و حشمت جس کو مرعوب نہ کر سکیں۔ اس کا سہارا وہ روشنی ایمان تھی جو دین متین نے اسے عطا کی۔

اس لئے کہاں وہ عدم تشدّد کے جھوٹے نگینوں کی جھلک اور کہاں یہ غیرتِ دینی، جوش، ولولہ اور ثابت قدمی کی لذّتیں۔ یہ ایمان کی روشنی میں اپنی خود داری اور حمیّت کی بات، مادیّت کی دنیا سے علیحدہ بات تھی۔ عقل تو آج بھی اس قسم کی بے اعتنائی، بے نیازی، جانبازی، سرفروشی پر حیران رہ جاتی ہے۔ عقل کے آگے یہ کب ممکن ہے کہ زندگی کے عیش و آرام کو ٹھکرا کر یوں تلخیوں کے گھونٹ پی لئے جائیں اور اس طرح انسانی کردار کی تازہ بہ تازہ، نو بہ نو حیات کا ثبوت پیش کیا جائے۔ چین آرام کی زندگی کو کچھ اس لئے ٹھکرایا جائے کہ جذبہء ایمان میں کمی واقع نہ ہو۔ ساتھ ہی کسی قسم کی نفرت کا جذبہ بھی نہ ہو کہ مخالفین سے بدلہ لینے کا سوال ہی پیدا ہو، خون خرابے کی طرف نظر ہو، بلکہ اُلٹا یہ اندازِ رحمت برتا جائے کہ جب خون کے آنسو آنکھوں میں قہر و غضب بن کر ٹپکنے لگیں تو اس غم و غصہ کو بھی اپنے وجود کے اندر جذب کر لیا جائے تاکہ وہ جوشِ ایمانی کی آگ اس طرح نفس کی نچلی اور ذلیل سطحوں پر اُتر کر سرد نہ پڑ جائے۔ یہ اندازِ غیرت، خود داری، بے نیازی، بڑے سکون والی بات ہے، جس کا اثر دوسرے دل پر بھی ہوتا ہے۔ اس حالت میں ایک مومن کو نہ شکایت ہوتی ہے، اللہ سے، نہ مخلوق سے۔ اِنَّاللہَ مَعَ الصَّابِرِیْن ایک ٹھوس حقیقت ہوتی ہے۔ یہ صبر، یہ عزم، سُنتِ الٰہی کے ساتھ صبر ہے۔ یہ ذلت والی بات نہیں بلکہ ایک دولت ہے، لذّت ہے، یہ عزمِ مجاہدانہ ہے، نہ حقیقتوں سے کنارہ کشی ہے، نہ نفس کشی ہے، نہ راہ گریز ہے، نہ مُردہ کیفیت میں راضی بہ رضا رہنا ہے۔ یہ نہ پست حوصلگی ہے، نہ بے دست و پائے ہے، نہ زندگی کا منفی انداز ہے۔ بلکہ یہ تو انسان میں وہ شِدّتیں جگا دیتا ہے جن میں بلند حوصلگی ہے، پامردی ہے، خود اعتمادی ہے، حیا اور غیرت انسانی ہے۔ اس سرفروشی میں صداقت ہے، جان نثاری ہے، جذبہء قربانی ہے، جذبہ و شہادت ہے۔ ان ہی اعلیٰ اقدار سے انسان محترم بن جاتا ہے۔ رَضِیَ اللہُ عَنْہُ کا مقام پالیتا ہے۔ اس مجاہدانہ سرفروشانہ عزم کی بات کچھ ایسی ہے کہ تمام نچلی اقدار زندگی سے دوچار ہو کر بھی نہ اپنے پر اثر ہوتا ہے، نہ ان میں گھر جاتا ہے بلکہ فضیلت انسانیّت کا رنگ اختیار کرتے ہوئے وہ بے نیازی حاصل کر لیتا ہے کہ دنیا پائوں تلے رہتی ہے، اور پانی میں رہتے ہوئے بھی دامن تر نہیں ہوتا۔ اسے نہ خوف ہوتا ہے نہ یاس، نہ حرمان۔ اس طرح وہ خَوْفٌ عَلَیْھِمْ وَلَا ھُمْ یَحْزَنُوْن کا پیکر بن کر دنیا میں زندگی گزار رہا ہوتا ہے۔ یہ ہے حقیقی صبر، یہ ہے زندہ سکون اور حیات کی نشانی جو ایک جلتی ہوئی شمع کو نصیب ہے۔ اسی میں مقامِ انسانیت ہے، زندگی کی تابندگی ہے، نظام عالم سے ہم آہنگی ہے، ظاہر باطن کی میزان ہے۔ یہ ثابت قدمی، یہ حیات و ثبات، یہ قیام و نمو و فروغ، ایک سینہء سمندر کی طرح بھی ہے، کہ اس پر لاکھ تھپڑ ماریں، ہزار پتھر پھینکیں، ڈنڈے ماریں، مگر اس کا سینہ ہر ضربِ کاری کھانے کے بعد بھی اپنے فطری توازن پر قائم رہتا ہے۔

درسِ اِسلام

ایسے مجاہدوں، سرفروشوں، جاں بازوں، خود داروں کا مقابلہ اب یہودیّت، عیسائیت، شیطنت سے ہے۔ ان سب کی بنیاد نفس پرستی، نفسا نفسی، کم ظرفی، زر پرستی پر ہے، جو یہودیت کی میراث ہے۔ اس ابلیسی گروہ نے اقتصادی اونچ نیچ کے ذریعہ دوسری قوموں کو صدیوں سے اپنی گرفت میں کیا ہوا ہے۔ اسی اقتصادی ہمواری کے نام پر کمیونزم بھی اسی شیطنت کی ایک نئی شاخ ہے۔ مقصد اس تمام افراط و تفریط زر کا یہ ہے کہ انسان دنیا کے

جنجال میں گھر کر اپنے اعلیٰ مقام سے گر جائے جو اس کی بنیادِ وجود میں فطرتاً ودیعت ہے۔ اسلام اسکے برعکس قناعت اور عالمی برادری کا سبق، محبّت، خلوص، خدمتِ خلق اور احترامِ آدمیّت کو گردان رہا ہے۔ اسے اخوت کہہ لو، ربط ملت کہہ لو، اسلام اور ناموسِ رسولؐ پر فدا ہونا کہہ لو، یا اعلیٰ اقدارِ انسانیت، مروّت، سخاوت، ایثار، وفا، خلوص، صداقت، دیانت، امانت کہہ لو۔ لہٰذا جنگ اور کشاکش، مذاہب کی نہیں ہے بلکہ اعلیٰ اقدار انسانیت اور مادیت کی ہے۔ اس مادیت اور مادہ پرستی کا پرچار اسی لئے ہے کہ مسلمان کسی طرح اس روشنی ایمان سے دور ہو جائے جو اسے مستحکم کئے ہوئے ہے۔ اس یہودیت اور مادہ پرستی کی شیطینت سے نہ کوئی ملک بچا ہے، نہ کوئی قوم، نہ کوئی مذہب۔ اسلام ہی ان نرالی اقدار پر باوجود اپنی خستہ حالی کے اب تک ثابت قدم ہے جہاں شرف انسانیت ہے، عالمی مساوات ہے۔ اسلام ہی یہ سبق دے رہا ہے کہ نفسا نفسی، خود پرستی، غرورِ شخصیت، غرورِ نسل، غرورِ تہذیب و تمدن، سب کے سب شیطنت کا جال ہیں۔ ان کی بِنا بغض ہے، فساد ہے، نفاق ہے۔ اسلام ہی یہ سبق دے رہا ہے کہ انسان کے شعور کو اگر تربیت الی الحق ملے تو پھر نفس اور عقل کے چکروں سے نکل کر مدارجِ اعلیٰ کی طرف نظر اٹھتی ہے۔ اسلام اسی لئے اپنے کو تمام مذاہب کا فطری اِرتقاء گردانتا ہے کہ اس ارتقاء کا تعلق فرد کی حیات سے لے کر، حیاتِ عالم تک ہے۔ اور حیات بعد الممات کے لئے بھی رُوح کی حیات کا سبق ہے۔ روح کا اِرتقاء رحمتوں، توکل، اور عزم کے دامنوں میں ہے۔ ان ہی کے طفیل انسانی حیات میں شِدّتیں بھی آتی ہیں، باطن بھی اُجاگر ہوتا ہے۔ خوابیدہ باطنی صلاحیتیں بھی بیدار ہوتی ہیں اور حیاتِ ابدی میں قیام انسان کو عطا ہوتا ہے۔ اسلام عجب عجب انداز میں زمانے میں ہو رہا ہے۔ اسلام کا یہ فطری عروج باطن ہ ہے جس کی وجہ سے اسے تمام مذاہب پر فوقیت ہے اور باطن کی روشنی، میں یہ ایمان کی تابانی، یہ عشق رسولؐ اور ناموسِ دینا سے آج بھی مسلمانوں کی ظاہری خستہ حالی کے باوجود ایک مرکز پر جمع کئے ہوئے ہے۔ یہ بات ارکان کی پیروی اور ظاہری شریعت کی پابندی سے علیحدہ چیز ہے کہ خواہ مسلمان اپنے دین کی پیروی نہیں کر رہا لیکن ناموسِ رسول اور حرمت اسلام پر جان دینا وہ اب بھی جانتا ہے۔ اب بھی اسلام اس کے لئے مرکزیت ، جمعیت بندی، فروغِ زندگی اور ایمان کی نشانی ہے۔ اسی نکتہ ء ایمان کو پکڑ کر پھر سے مسلمانوں کو اپنی زندگیاں سنوارنا ہیں اور اسی شِدّتِ ایمان کے سہارے دنیا میں پھیل جانا ہے۔ یہ ایمان، یہ روحِ اسلام، یہ جانِ اسلام کلمہ لَااِلٰہَ اللہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللہ کی عملی تصویر ہے۔

حق کی فتح

فتح مکہ کے لئے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو انداز برتا اس پر آج بھی ایک سطحی نظر، بیت المقدس کے سلسلہ میں، ڈالنے کی ضرورت ہے۔ صلح حدیبیہ کیا تھی؟ سولہ سو مسلمان احرام باندھ کر پہنچتے ہیں۔ احرام باندھنا، کفن بردوش ہونا، ایک ہی انداز ہے، شدّتِ شوق کا، محبت رسولؐ کا، طوافِ حرم کا، اور ہُوا کیا؟ صلح نامہ لکھا گیا کہ آگے بھی نہ بڑھنا، حج کا ارادہ بھی ترک کرنا، دشمن کے قیدیوں کو واپس کر دینا، اور اپنے قیدی دشمن کے حوالے چھوڑ دینا۔ یہ بات کونسی عقل و دانش اور فہم میں آسکتی تھی، کہ یہی صلح ذریعہ بنی فتح مکہ کا۔ ظاہر بین آنکھ تو اس کو ایک شرمندگی اور شکست دیکھے گی اور حقیقت بین اس کو فراخ دلی، عالی حوصلگی کی زندہ مثال کے طور پر سمجھے گا۔ مادّی تنگ نظری، جہالت، ہٹ دھرمی، غرور انانیت، کے مظاہرے کے مقابلہ میں اعلیٰ اقدار، رواداری، امن طلبی، انسانیت، عزم، حوصلہ، مردانگی کی تصویر دیکھے گی تاکہ اعلیٰ اصولِ حیات، تہذیب، شائستگی، جمعیت بندی، اخوت، صلح جوئی، کی وجہ سے یہ گروہِ جمعیت ان غیر شائستہ لوگوں کے مقابلہ میں سرفراز نظر آئے۔ اس صلح کے پس منظر میں

اعلیٰ اقدارِ انسانیت کا مظاہرہ اس تنگ نظری، تنگ دِلی کے مقابلہ میں تھا، جس میں وہ خود ساختہ علمبردارانِ تہذیب گرفتار تھے۔ پھر یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ حق باطل پر غالب نہ ہو، ضمیر انسانیت ان مجاہدوں، ان قیدیوں، ان فدایانِ شمع رسالت کی پختگی ایمان سے کیسے متاثر نہ ہوتا۔ اس عدم تشدد کے ذریعہ پامردی کا مظاہرہ تلوار ہاتھ میں لینے کے مقابلہ میں کہیں بہتر طور پر ہو سکتا تھا۔ اسی لئے ان بے نفس، باعزم، باحوصلہ لوگوں نے اپنے حریفوں کا پتہ پانی کر دیا۔ وہ دنیوی عیش و آرام، دولت و جاہ و حشم کے طالب ان کا کیا مقابلہ کرتے جن کا بھروسہ، غیرت اور حمیّت پر تھا، اور جنہوں نے چند روزہ ہوسِ دنیا کے مقابلہ میں آخرت کا سودا کر لیا تھا۔ یہ ان کا سادگی، خود اعتمادی، قناعت، کو اپنانا انہیں اِنفرادی زندگی کی نفسانفسی سے بلند کر کے حمیعت کی زندگی میں حیات و قیام عطا کر چکا تھا۔ وہ جیتے تھے اور مرتے تھے جمعیت کے لئے، اسلام کے لئے۔ اسی لئے پر عزم، پر حوصلہ، سرفروش، مجاہد، بے نفس اور باعظمت جمعیت کے مقابلہ میں کفار کب تک بضد رہتے۔ جلد ہی انہوں نے اعلیٰ اقدارِ زندگی کے عملی پہلو، ان مجاہدوں، سرفروشوں، جانبازوں کی زندگی میں دیکھ لئے اور گروہ در گروہ لوگ اسی قدوسی جماعت میں شامل ہونا شروع ہو گئے۔ اس طرح جلد ہی مکہ بغیر کشت و خون کے فتح ہوا۔

احسن اقدام

حاتم علوی صاحب کا کہنا ہے کہ یہی کچھ اس زمانہ میں عالم اسلام کو بیت المقدس کے سلسلہ میں کرنا ہے۔ اس میں حیات و زندگی، صبر و شکر اور اعلیٰ اقدارِ انسانیت کا وہی پہول پالینا ہے جو صلح حدیبیہ کے وقت پیش آیا تھا۔ زیادہ نہیں تو ڈھائی لاکھ، پانچ لاکھ، مسلمان مختلف ممالک کے، احرام باندھ لیں، کفن پہن لیں، اور ناموسِ اسلام و تقدسِ انبیاء کے متبرک مقام کی جانب پیش قدمی کریں۔ اس نظریے کی تائید جب انہوں نے قرآن پاک سے نکالی تو آیہ اِنّا فَتَحْنا ہی کھل کر سامنے آئی۔ یہ وہی آیت تھی جو صلح حدیبیہ کے موقع پر نازل ہوئی تھی۔ معراج میں بھی حرم سے اقصیٰ کی جانب روانگی، سُبْحانَ الّذی اَسْریٰ بِعَبْدِہٖ کے رنگ میں تھی، پھر وہاں سے عروج آسمانوں میں تھا۔ یہ اعلیٰ اقدار کی جانب رجوع کتنی پُر معنی بات ہے۔ اسکی باطنی اہمیت کو شِدّت سے اپنے اندر زندہ کر کے بیتُ المقدّس کی جانب، انہی اعلیٰ اقدارِ انسانیت کو پیش نظر رکھ کر، ایک احسن اقدام ہو گا۔ یہ ایک دو دن، یا چند ماہ کی سختیاں جھیلنے کی شائد بات نہ ہو، اس سے زیادہ عرصہ بھی لگ جائے تو کیا؟ عزم اپنا بیدار رہے، سلامت رہے کہ اس مقدس سرزمین پر جا کر ہمیں بیٹھنا ہے۔ پاکی و تسبیح و حمد کی گونج پھر سے اس مقدس سرزمین سے بلند کرنا ہے۔ اور یہ کچھ اس پاک اور مطہر اندازِ صبر میں ہونا ہے کہ سخت سے سخت دل بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ صداقت، تڑپ، جذبہ، جوش، حوصلہ، کو وہ وسعت عطا کرنی ہے جو، ہر مادّی سختی کو، اس قلبی اور روحانی سکون میں بھول جائے، جب ہتھیلی پر ایک بار سر رکھ ہی دیا تو اس کے بچانے کا سوال ہی پیدا نہ ہو۔ نہ اس جسم پر اب موسموں کی شِدّت اثر کرے، نہ بھوک پیاس، غربت و فلاس، نہ بیماری نہ کمزوری جسم۔ اس جماعت سرفروشان میں عورتیں بھی مردوں کے شانہ بشانہ ہوں، کہ زندگی کی جدوجہد، عبادتوں، ریاضتوں، میدانِ جہاد، میدانِ عمل میں ہمیشہ پوری قوم نے اپنے کو ایک جسم و جان ہو کر پیش کیا ہے۔ بات بس ایک جذبہ کی ہے۔ عقل و دانش والے تو ایسے آگ اور خون کے سمندر میں چھلانگ تو کیا لگا سکتے ہیں، دوسروں پر اپنی طعن و تشنیع اور دلائل و برہان کا طُومار باندھنے لگتے ہیں۔ انہیں انکے حال پر چھوڑ کر، مجاہدوں، سرفروشوں کو وہی کفن سر سے باندھ لینا ہے، جو صلح حدیبیہ پر اپنے محبوبؐ کے ساتھ باندھ کر نکلے تھے، تو پھر محبوبؐ بھی ساتھ ہی ہونگے، فدایان شمع رسالت، صدّیقانِ ملّت، شہدائے اُمّت، اولیاء و صالحین، سب کے سب ہی ان جان نثاروں کا ساتھ دے رہے

ہونگے۔ یوں بھی آخر دین کے نام پر، جنگ میں جاکر سر دیدینے کی عقل کب قائل ہوتی ہے۔ وہ تو تعدادِ لشکر، سامانِ حرب، ظاہری مدد، دانش و تدبیر پر بھروسہ اور ایمان رکھتی ہے۔ مگر ایک جان نثار قوم کے نام پر مر مٹنے والے کے لئے نہ نتیجہ کی فکر ہے، نہ بے سروسامانی کی، نہ کامیابی اور ناکامی کی۔ وہ تو ایک شوقِ والہانہ اور اُمّت کے فروغ کا قائل ہوتا ہے کہ یہ شوق سلامت رہے۔ ایک بات نہیں ہزار بار سر دے۔ اسے یہ بھی فکر نہیں ہوتی کہ عالمی روح اس سے بیدار ہوتی ہے یا نہیں، عالمی رائے ہموار ہوتی ہے یا نہیں، اقوامِ عالم میں ان سر فروشوں کی قربانیوں سے تہلکہ مچ جاتا ہے یا نہیں، کیونکہ وہ نہ کسی نام نمود کی خاطر اس میدانِ عمل میں آتے ہیں، نہ کسی ہمدردیوں کو اپنی جانب مبذول کرانے کی فکر کی طلب میں۔ وہ تو اپنے شیر دلانہ جذبہ کی شِدّت میں، عشق کی رحمتوں کے سائے میں سکونِ کامل میں ہوتے ہیں۔ اس حالت میں وہ نہ دشمن سے ہمدردی کے طالب ہوتے ہیں، نہ دشمن سے نفرت میں یہ عمل پیرائی کرتے ہیں۔ وہ اس سطح سے بہت بلند ہو کر، حق اور حقیقتوں کی دنیا میں، قدوّسیت اور پاکی کی تقدیس میں تسبیح و تحلیل کناں ہوتے ہیں۔ شِدّتِ جذبات میں بسے ہوتے ہیں۔ ارضِ مقدّس کی حرمت کی خاطر، یہ تحریم و تکریم، یہ تسبیح و تحلیل یہ شِدّتِ زندگی وہی تو ہے جس کی مشق اس سے قبل اپنی زندگیوں میں، نمازوں، شب بیداریوں، تنہائیوں میں انہوں نے پہلے کی تھی۔ اب کہیں اس حمد و ثناء تسبیح و تقدیس، عزم، و ارادہ، ذکر اذکار، پامردیء مومن کا یہ عملی پہلو انہیں اپنی زندگی میں بھی نصیب ہوتا ہے، جسکی داستانیں انہوں نے کتابوں اور صحیفوں میں پڑھی تھیں۔ اب کہیں انسان کی ان عظمتوں، بلندیوں، اِستقامت اور عزم کا انہیں اپنے کردار سے عملی نمونہ پیش کرنا ہوتا ہے۔ اب کہیں وہ اس لائق ہوتے ہیں کہ اپنے شِدّت جذبات اور عالی حوصلگی سے ایک ضربِ کاری سینہء کائنات پر لگائیں۔ عشق و ایمان کی چنگاری اس قوم کے سر فروشوں میں اب بھی موجود ہے۔ اسے اگر رُخ دیا جائے تو یہی آگ پھر سے بھڑک سکتی ہے۔ یہ وہی داستانِ حرم ہے، جس کے نقشے جگہ جگہ مختلف اندازوں میں اس قوم نے پہلے بھی دیئے ہیں۔ کبھی اس جذبہ کے تحت میدانِ جہاد میں، تلوار، تیر، تفنگ، توپ، ٹینک، راکٹ، جہازوں، سے جا ٹکرائے، تو کبھی اپنی ثابت قدمی اور شِدّتِ ایمان کا اظہار کرتے ہوئے زندہ جاوید ہو گئے۔ تاریخ شاہد ہے کہ جب بھی اس عزم، حوصلہ، غیرت، حمیت کے بل پر قوم نے کوئی بھی اقدام کیا ہے تو دنیا کے دل دہل گئے ہیں۔

اقتصادی تلوار

ابھی حال میں عربوں نے ایک آلہء تیل فروخت نہ کرنے کا استعمال کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس میں اپنا اقتصادی نقصان ہے۔ اپنی روزی اپنی معیشت، اپنی بقا، اپنے عوام کی زندگی کا بھی سوال ہے، مگر ان کا عزم، اور ہٹ اس جنگ آزمائی سے زیادہ کارگر ثابت ہو رہی ہے، جو اس سے قبل دو تین بار اسرائیل کے ساتھ انہیں پیش آچکی ہے۔ اس وقت تمام عرب ممالک کا اس سلسلہ میں ہم خیال اور مجتمع ہونا بذاتِ خود ایک بڑی روشن کامیابی ہے۔ اب یہ بھی دیکھنے میں آرہا ہے کہ پہلی جنگوں کے مقابلہ میں اب کہیں دنیا کو احساس ہو رہا ہے کہ وہی اقتصادی تلوار جس کے سہارے بڑے بڑے ملکوں نے صدیوں تک، چھوٹے ملکوں کو تاخت و تاراج کر کے اپنی معیشت بنائی، اپنی اپنی عوام کا طرزِ زندگی اور تمدن بڑھایا تھا، اب وہی اقتصادی تلوار انہیں بے طرح کاٹ رہی ہے اور عربوں کا یہ عمل انہیں وحشیانہ نظر آرہا ہے۔

اقبال نے خوب کہا تھا۔

؎ دیارِ مغرب کے رہنے والو، خدا کی بستی دُکاں نہیں ہے

کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو، زرِ کم عیّار ہو گا

بات یہ بھی ہے کہ مادّیت کو دیکھنے والی آنکھ مادیت کی ضربِ کاری کو ہی قبول کر سکتی تھی۔ اسکا لازمی نتیجہ ہے کہ اقوامِ عالم کے نظریات میں کچھ نہ کچھ تبدیلی آئے، یہاں تک کہ اشتراکیت بھی یہ سبق حاصل کرے کہ دنیا صرف روپیہ پیسہ پر نہیں چلتی بلکہ غیرتِ قومی، ایمانی قوت، اور عالمی مساوات، کی بنیاد صداقت اور رواداری کے اصولوں پر چلتی ہے۔ عرب ممالک کا یہ متفقانہ فیصلہ صرف مادیت کی سطح کا ہے، جسے عدم تشدّد کی تلوار کہا جاسکتا ہے۔ مگر جو لائحہ عمل اب پیش کیا جارہا ہے وہ فیصلہ کُن اقدام کی جگہ نہیں بلکہ اس جذبہ کو اور تیز کرنے کے لئے پیش کیا جارہا ہے۔ فی الوقت یہی اقدام بڑے اقدامات کا پیش رو بنے گا۔ کیونکہ یہ ایسی دو دھاری تلوار ہے کہ اس کی مار ظاہر میں تو نظر بھی نہ آئے گی اور دانش وروں کو شائد حماقت ہی معلوم ہو، مگر تفکر کرنے والوں اور اہل بصیرت کے لئے یہ وہ دو دھاری تلوار دکھائی دے گی جو اپنی قوم کے باطن کی بھی اصلاح کرے گی، قوم کو ایک مرکزیت پر مضبوطی سے لے آئے گی اور دوسری طرف دشمن کو بھی اس انداز میں کاٹے چھانٹے گی کہ اس کے قبیح چہرے کی نقاب کشائی ہو جائے گی اور اسکا وہ تمام جھوٹا حسن جو تمدن، تہذیب، اقتصادی خوشحالی، عسکری مضبوطی کا اسے چھپائے ہوئے تھا، اس کے چہرے سے ڈھل جائیگا۔ تب کہیں یہ قوم ایسے ننگی ہو کر سامنے آئے گی کہ تمام عالم انسانیت اس پر لعن طعن کرے گی اور اسے سر چھپانے کی جگہ نہ ہو گی۔ اس طرح جو کام ہٹلر سے بھی نہ ہوا، جو کاٹ چھانٹ دنیا کی دو عظیم جنگوں سے نہ ہو سکی، وہ اس عدم تشدد کی تلوار کے ذریعہ بہ حسن وخوبی انجام کو پہنچے گا۔ اس عالم گیر اقتصادی تباہی سے دنیا کے سات میں سے ایک بچ سکے گا، یہ بھی وہ ہو گا جس نے صبر و توکل کو زندگی کا سہارا بنایا ہو گا۔ اب کہیں وہ دجال کے چہرہ سے وہ رنگین عینک اُترے گی جس کے ذریعہ اس نے اپنی ایک اندھی آنکھ کو چھپا رکھا تھا۔ اس دجال کی مادیت کی آنکھ تو روشن تھی مگر ایمان کی آنکھ اندھی تھی۔ مطلب اسلام کی اعلیٰ اقدار ایمان، توقیر انسانیت، خدمت خلق جب اس دجال کی مادی آنکھ کو اپنی ضربِ کاری سے پھوڑ دے گی تب کہیں اس دجال کا خاتمہ ہو گا۔ اب کہیں دنیا کو معلوم ہو گا کہ یہودیت، برہمیت، عیسائیت، یونانی فلسفہ، اور مارکس کا فلسفہ، جنھوں نے معاشرے کی بنیاد، اقتصادیات پر قائم کر رکھی تھی، جھوٹا تھا۔ اب انہیں معلوم ہو گا کہ اسلام نے فروغِ انسانیت، فروغِ جمعیت کی بنیاد، اقتصادیات اور مادیت پر کیوں نہیں رکھی، بلکہ اس کی جگہ ایمان، عمل صالح، مساوات، توقیر انسانیت، خدمت خلق، کو اپنا شعار بنایا۔ اب انہیں معلوم ہو گا کہ انبیائے کرام جس دین متین کی تبلیغ کرتے رہے وہ یہی سلامتی، امن اور مساواتِ انسانی تھی جس کا فطری نام اسلام تھا، اور جس کی بنیاد آخرت، ایمان، محبت اور رحمت کے ستونوں پر قائم ہے۔ اسی لئے وارثانِ انبیاء ہی کو وراثت انبیاء پہنچتی ہے اور وہی مقدس گھروں میں قدم رکھنے کے لائق ہوتے ہیں۔ ان ہی کی تکبیر و تحلیل کی بازگشت کائناتِ عالم میں ہوتی ہے۔ یہ وہی مقدس جماعت ہوتی ہے جس کے ذکر کو بلندی عطا ہو چکی ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ خود حق تعالیٰ ان کی تصدیق فرماتا ہے۔ کُنْتُمْ خَیْرَ اُمَّتٌ اخْرَجَتْ لِلنَّاس۔ یہ خیر وامت اسی خیر والبشر کی اُمت ہے۔ جسکے لئے فرمادیا، رَفَعْنَا لَکَ ذِکْرَکَ۔ تو جب خود حق تعالیٰ خیر اُمَّت کے لقب

سے نواز رہا ہو اور رَفَعۡنَا لَکَ ذِکۡرَکَ کہہ رہا ہو تو اس اُمّت کی تقدیر کی بلندیوں اور جہاں میں سر فرازیوں کا شُبہ بھی کیا رہ جاتا ہے۔ جو لوحِ محفوظ میں مقرر ہے وہ تو ہو کر رہے گا۔

تجلیٔ حق

خسروؒ کی شوخی، تبسم، ترنم، تدبر، ذہانت، شاعری، موسیقی، تصوف، زُہد، دربار، خانقاہ، سب کے پیچھے اس فطری سوز اور تجلی حق نے انہیں ایک Genius فطین کی حیثیت بخشی ہے۔ فطین کی تخلیق کو سمجھنے کے لئے کائنات کی تخلیق پر غور کریں۔ غیر جاندار مادہ میں صدیوں کی باطنی کاوِش کے بعد ایسے حالات پیدا ہونا کہ اس میں تبدیلی آئے، وہ مادّہ کا آہستہ آہستہ جمع ہونا، ساری قوتوں کا یکجا ہو کر ایک مرکزیّت اختیار کرنا، پھر اس میں سے زندگی کا ظہور، ایک سحر، ایک افسوں۔ اس پر سائنسی تحقیقی نظر سے بھی جن لوگوں نے تفکر کیا وہ ایک قدرت کاملہ کا تصوّر لے کر حیرت میں پڑ گئے۔ اور بس۔ مگر پس منظر وہ کُن کا کیف، وہ مشیت ایزدی، وہ تخلیق کی شدّتیں، وہ نمود کی بے چینی، وہ اپنے پہچانے جانے کا شوق، اَحَبْتُ اَنْ اعُرِفَ، تو کسی اور حالت میں ہو کر ہی اپنایا جا سکتا ہے۔ کائنات کی تخلیق سے کہیں زیادہ مسحور کُن ایک شاہکار تخلیق، ایک فطین انسان کا ظہور ہے۔ ایک تابناک ستارے کی طرح اس کی تخلیق بھی صدیوں کی کاوش کے بعد ہی کہیں مقدّم ہوتی ہے۔ زمانے کے تقاضوں اور ماحول کے بدلتے ہوئے حالات کے تحت انسانی تاریخ میں ایک وہ وقت بھی آتا ہے کہ ایک حکیم، ایک فطین شخص پیدا ہو، کائناتِ مادی کی طرح اس کے وجود میں بھی قدرت کی مختلف قوتیں، قدرتیں صلاحیتیں، ایک مرکزیت لئے ہوتی ہیں اور اس فطین فرد کے بھی اتنے ہی پہلو اور رُخ اور رنگ ہوتے ہیں جتنے کہ کائنات کے، یا ایک حسین کرسٹل (بلور) کے۔ زندگی کی پہلی نشانی، پہلی ترتیب (بلور) کو دیکھیں وہ ترتیب عناصر، وہ آب، وہ نکھار، وہ درخشاں پہلو، اندر ایک مرکزیت اور باہر ایک نمود کی شان۔ ان جلووں میں کھو کر محسوس کریں۔ وہی نورِ اوّلین کی رعنائیاں ہیں۔ اَحَبْتُ کی شدّتیں، کُن کی تجلی، وہ زندگی کی ادائیں، حیات کی جلائیں۔ عقل حیران ہے، زبان بیان کرنے سے گُنگ ہے۔ حقیقتوں کے بحر بے کنار تک رسائی ہے، ایک حالتِ گم گشتگی ہے۔ ایک محویت نظارہ، ایک خشیت حُسن۔ وجدان نے ہی اس حقیقت سے رُوشناس کرایا ہے کہ 'ہے'۔

اب اسکے بعد پھر سے شاہکارِ تخلیق یعنی انسان کا تصوّر کریں جس میں اپنی رُوح پھونک دی اور صاحب اَمر بنا کر دنیا میں بھیجا۔ اسکی جلوئہ سامانیوں تک کا کیا ٹھکانہ۔ پھر ایک فطین شخص کے حسن کا کیا کہنا۔ بِلور کی طرح اسکی زندگی کا ہر رُخ تابناک۔ کائنات کی طرح رنگا رنگ یکتائیوں کی جلوئہ سامانیاں ہیں، جنکی نہ حد نہ شمار، یہ ایک نادر روزگار ہے۔ اسکی ہر ادائے زندگی میں ایک احدیّت ہے، ایک اپنی انفرادیت اور ایک نفس واحدہ کی طرح وہ اپنے اندر، باہر، اور زمانہ کے ساتھ، کلی توحید میں ہے، پوری کی پوری شخصیت اپنے ماحول، اپنے زمانے سے ہم آہنگ ہے۔ اور ساتھ ہی کائناتِ تخلیق کی ازل سے ابد تک کی حدوں کی آئینہ دار۔ ایسی ہستی، عجوبہء روزگار ہو کر ہر زمانہ کی ہو جاتی ہے۔ کیا ماضی، کیا حال، کیا مستقبل۔

ابُو الوقت

مشہور جرمن فلسفی ہیگل لکھتا ہے کہ ایک زمانہ کی رُوح ہوتی ہے اور ایک عوام کی رُوح۔ ان دونوں کے درمیان فاصلے کی بنا پر ایک ہیجانی شدّت طاری رہتی ہے۔ زمانہ کی رُوح ایسے افراد کی تلاش میں ہوتی ہے، جو ذہین، دیدہ ور، فطین، صاحب حکمت ہوں۔ اس لئے ایسے لوگوں پر یہ زمان کی رُوح اُترتی ہے جو اس کے اہل ہو جاتے ہیں۔ اسلامی نکتہء نظر سے دیکھا جائے تو تَنَزَّلُ الْمَلَائِکَۃُ وَالرُّوحُ فِیْہَا، مِنْ کُلِّ اَمْرٍ سَلَام، کی تصویر سی کھنچ جاتی ہے۔ لہٰذا ایک فطین شخص کا وُرود، سوائے مشیّت الٰہی اور رحمت ایزدی کے کیا ہو سکتا ہے۔ اس کو زمانہ سے ہم ساز، دم ساز بنا کر ابو الوقت کی حیثیت عطا کر دی

جاتی ہے۔اب اسے انا دھر کی تجلی ہی کہ لیں کہ تاریخ کو رُخ دینا گویا اس کی فطرت میں ودیعت ہوتا ہے۔ اس فطانت کے تحت وہ بچپن' جوانی اور بڑھاپے تک جو کچھ کرتا ہے وہ جیسے دانستہ یا نادانستہ طور سے خود بخود ہوتا جاتا ہے۔ ایک وجدانی سی حالت اسکے ہر فعل زندگی پر طاری رہتی ہے۔ اور زمانے کے تقاضے پورا کرنا اسکے ذریعہ مقدر ہو جاتا ہے۔ اسکے ہر فعل کا' اپنی ذات سے اتنا تعلق نہیں ہوتا جتنا کہ نصبُ العین سے جو اسے فطری طور پر عطا ہوتا ہے۔ اس نصبُ العین سے کُلی' جذباتی' روحانی لگاؤ اسے تادم زندگی رہتا ہے۔ ساتھ ہی انا دھر کے رنگ میں رنگے ہونے کے سبب اسکے مزاج میں زمانہ کے ساتھ ساتھ زندگی گذارنے کے لئے ایک فطری لوچ اور لچک بھی ہوتی ہے۔ انفرادیت بھی' یکتائیت بھی' اور ایک جذبہء انہماک کار بھی' اسی لئے اس کا یہ حال ہوتا ہے کہ جس کام میں لگ گئے' اسے انتہا تک پہنچا دیا۔ اپنی فطری شدّتوں کے تحت عمل میں اس کی ساری زندگی بغیر اپنی انفرادیت اور یکتائیت کو قربان کئے گذرتی ہے۔ ایک اُبلتے ہوئے چشمے کی طرح وہ اپنی تیز رفتاری سے' اپنے دھارے میں زمانے کو ساتھ لے جاتا ہے۔ اپنے ترنم' اپنی جولانی' اپنی رنگارنگ شوخیوں کی بہاریں' اپنی راہ پر نچھاور کرتا جاتا ہے۔ اس طرح وہ صاحب زمانہ بن کر' تاریخ کو ایک شاندار رُخ عطا کرتا ہے۔

احسانِ اِسلام

اس گلزارِ ہستی میں' حیاتِ انسانی پر نظر ڈالیں تو یہ باغ و بہار' انسانی زندگی کی ساری تاریخ میں نظر آئے گی۔ جیسے یہ نوادرِ روزگار' ایک ہی 'انا دھر' کی کیفیت سے سرشار تھے' جسکا سلسلہ ازل سے ابد تک پھیلا ہوا ہے۔ ہر زمانے کے انبیاء اپنے اپنے زمانہ کا رنگ لئے ہوتے تھے۔ وہ اپنی فطری سادگی اور مزاج میں لوچ اور لچک کی بناء پر اپنے زمانے کے لوگوں میں گھل مل کر انکے ہم ساز اور دم ساز ہو جاتے تھے اور عوام الناس میں ایک نظریاتی تبدیلی لے آتے تھے۔ نبوت کا دور ختم ہونے کے بعد یہ ذمہ داری فطین لوگوں اور اولیائوں کے سپرد ہوئی۔ اسلام کا دین فطرت ہونا' عین فطرتِ انسانی کے مطابق ہونا ایک احسان ہے زمانہ پر۔ اسکے اصولوں میں بھی فطرت سے ہم آہنگی کے مطابق لوچ اور لچک ہے' سختی نہیں۔ یوں بھی جس چیز میں لچک نہیں ہوتی وہ ٹوٹ جاتی ہے۔ ایمان کے اجزاء میں بجائے بیرونی سختی کے وہ حلاوت ہے کہ ایمان میری محبت کا نام ہے' کہ کر' محبتوں کی ایک نئی محفل زمانے میں جمادی۔ اسی محبّت اور عشق کے جذبہ کے طفیل انسان کی باطنی خوبیوں کو ابھار کر' اعلیٰ اقدارِ زندگی کی جانب انسان کا رُخ پھیر دیا۔ ہر چیز اللہ کے لئے' ہر جانب رُخ پھیرنے میں اسی کا سامنا' انسانی زندگی کی چھوٹی سے چھوٹی اور بڑی سے بڑی سطح تک وہی فطرت سے ہم آہنگی' وہی یک رُخی وہی جمالِ الٰہی کا دیدار۔ اس قدرتی سادگی کو اختیار کر کے' اس جمالِ الٰہی سے سرشار ہو کر ایک فطین ہستی مادیّت' اور تعینات سے ماوراء ہو کر تجرید کو پالیتی ہے۔ مجردات کی فہم اور انکے کیف میں ہی کہیں حقیقت سے ہمکناری نصیب ہو سکتی ہے اور ان ہی لطافتوں کو اپناتے ہوئے' حقیقت کلی کا نفاذ عالم وجود پر کیا جا سکتا ہے۔

تہذیبی تصادم

حضرت امیر خسروؒ تاریخ کے جس دَور میں پیدا ہوئے وہاں ایک تہذیب' صدیوں پرانی تہذیب سے ٹکر کھا رہی تھی اور دونوں کو ہی اپنے پر ناز تھا۔ ایک طرف ہزاروں سال پرانی ہندی تہذیب' انکا فلسفہ' انکی ذہانت تھی' جو اپنی انفرادیت کو قائم رکھتے ہوئے ایسی لچک رکھتی تھی کہ جو نئی قوم'

نیا مذہب آیا ان میں گھل مل گئے اور بالآخر انہیں ختم کر ڈالا۔ بدھ مَت اور جین مَت کی تاریخ پھر سے اسلام سے دہرائی جا رہی تھی۔ اور اِسلامی فاتحین کا یہ حال تھا کہ خود حضرت امیر خسروؒ کے زمانے میں کئی بادشاہتیں بدل گئیں۔ زمانہ کی رُوح اور عوام کی رُوح بے تاب تھی۔ کہ ایسا حکیم' دانشور' ماہرِ فن' ذہین و فطین فرد پیدا ہو جو' ان ٹکرانے والی قوتوں کو یکجا جمع کر کے' تہذیب کو ایک نیا رُخ دے کر تاریخ کے دھارے کو موڑ دے۔ حضرت امیر خسروؒ کی زندگی کے مختلف پہلوئوں پر نظر ڈال کر جو نتیجہ نکالا جا سکتا ہے وہ یہی کہ وہ فطین شخص جس کی تلاش زمانہ کو تھی' حضرت امیر خسروؒ ہی کی ذات تھی۔

اس نظریے کے ثبوت میں خسروؒ کی زندگی پر نظر ڈالیں تو انکی فطانت ایک کرسٹل (بلور) کی طرح کئی تابناک رُخ لئے نظر آتی ہے۔ انکی فطانت زندگی کے کسی ایک مخصوص شعبہ تک ہی محدود نہیں تھی بلکہ زندگی کے ہر شعبہ پر چھائی ہوئی تھی۔ انہوں نے جن جن سطحوں پر کام کیا اپنے زمانے سے آگے نکل گئے اور زمانہ نے انکا ساتھ دیا۔ انکا ظہور میں آنا خونی نسبت' خاندانی رابطے اور تعلق کی بات تھی۔ یہ بھی قدرتِ کاملہ کا التزام تھا کہ امیر خسروؒ کی والدہ ہندی نسل سے تھیں۔ لہٰذا یہ وہ زمین تھی جس میں اس نئے درخت کو اگنا تھا۔ وہ ہزاروں سال پرانی ہندی تہذیب' انکا فلسفہ' انکی قادر کلامی' انکا ہر زمانہ سے ہم آہنگی رکھتے ہوئے زندگی گذارنا اور پھر بھی اپنی انفرادیت برقرار رکھنا' انکی ذہانت' انکی حیا' انکی نسوانیت کی شان' وفاداری' جانثاری خسروؒ کو بھی ماں کے دُودھ سے ملی اور ترک خون ہونے کی وجہ سے وہ مردانہ شان انہیں ورثہ میں ملی جو زندگی کو اپنی تلوار سے ایک نیا رخ دیتی ہے۔ زمین مضبوط ہونے کے سبب خسروؒ کے پائوں ہمیشہ زمیں پہ رہے۔ انہوں نے کبھی زمانہ کو چھوڑ کر علیحدہ اُڑان لینے کی کوشش نہیں کی۔ ہمیشہ حقیقت بینی سے کام لیا۔ یہ جڑ' زمین اور خون ہی بنیاد ہوتی ہے' فرد کی اور قوموں کی۔ یہ کمزور ہوں تو فرد میں بھی انتشارِ شخصیت ہوتا ہے اور قوموں کا بھی شیرازہ بکھر جاتا ہے۔ الغرض ہندی زمین تھی تو ترکی آسمان۔ اس کیفیت میں جو درخت اُبھرا وہ ایسا تھا کہ اس کے پھل انسانیت تا بہ ابد کھاتی رہے گی۔ خسروؒ کی ذات میں یہ مثبت' منفی کا حسین اِمتزاج ہی ہے جس کی بنا پر انکی منفرد شان نکھری۔ فطین ایک مکمل فرد ہوتا ہے اور کامل اس وقت ہوتا ہے جب مثبت' منفی دونوں قطب موجود ہوں۔ انفاس میں سوزِ درُوں ہو تو آفاق میں حسین شوخیاں' انفاس میں شدّتیں ہوں تو آفاق میں حلاوت و نرمی' انفاس میں ایک مرکزیت ہو تو آفاق میں پھیلائو۔ مگر محبتوں کے چراغ اندر باہر یکساں جل رہے ہوں۔

روشن چراغ

پھر اس درخت پر شمس حقیقت کی تجلی کہ بغیر شمس حقیقت کے احسان کے' زمین خواہ کیسی ہی زرخیز ہو' دانہ کیسا ہی مضبوط ہو' ایک تنومند درخت نہیں بن سکتا۔ شمس حقیقت کی یہ روشنی خسروؒ کو حضور نظام الدین اولیاءؒ سے ملی' نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم' محبوب اُلٰہی تھے۔ کُل کے محبوب' کُلّی تجریدی محبوبیت لئے تھے۔ اس محبوبیّت کے نفاذ کے لئے ایک تفرید کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ بی بی فاطمہؓ تھیں اور دوستی اور رفاقت کی سطح پر صدیق اکبرؓ کا ساتھ۔ تاریخ نبوت کی سطح پر اسکی کہیں نظیر نہیں ملتی۔

اگر محبوبِ الٰہی کی زندگی میں امیر خسروؒ نہ ہوتے تو محبوب الٰہیؒ تو ہوتے مگر عالم وجود پر جو تصرف تھا وہ نہ ہو پاتا اور امیر خسروؒ کو اگر نظام الدینؒ نہ ملتے تو انکی فطری حکمت و دانائی یہ رُخ اختیار نہ کرتی اور انکی فطانت جیسے خود ہی جل کر پُھنک جاتی۔ فطین کا تو کیا کہنا' عام آدمی تک کی زندگی میں

ایسے واقعات عمر کے مختلف مدارج میں آتے ہیں کہ جب وہ اپنی باطنی شِدّتوں میں کھو جاتا ہے اسکی سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کرنا ہے' تو ان میں ایسے خوش قسمت بھی ہوتے ہیں جن پر کسی صاحب بصیرت بزرگ کی نگاہ پڑ جاتی ہے۔ یہ نگاہ ڈالنے کے اہل بزرگ بھی بے چین ہوتے ہیں' اس نگاہ کے ڈالنے کے لئے۔ بالکل ایسے ہی جیسے ایک صحت منداں مجبور ہوتی ہے دُودھ پلانے کے لئے۔ یہ نگاہ ہی شمس حقیقت کی تجلی ہے۔ یہ نگاہ ہی کیمیا ہے۔ مولانا رومؒ فرماتے ہیں:۔

نگاہے آں حکیم نے نوازے　　غبار رہ گذر را کیمیا کرد

حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی نگاہِ محبّت نے' خسروؒ کے لئے ایک پیکر خوبی عطا کر دیا۔ ایک beam ideal۔ اس والہانہ لگاؤ میں خسروؒ کی ظاہری' باطنی' فطانت کلی کی طرح کِھل اُٹھی۔ باطن کے چراغ روشن ہو گئے۔ غم عشق' شمع کا سا سوز بنا' ساری انانیت اس غم روز گار بن کر پھیلا۔ انکی فطانت کی معرکۃُ الآرا صلاحیتیں اور نکھر آئیں۔ اس عشق اور غم عشق کے لئے حضرت بو علیؒ فرماتے ہیں

گر عشق نہ بودے بہ خدا کس نہ رسیدے　　حسن ازلی پردہ زِرخِ برنہ کشودے

آسکر وائلڈ بھی کہتا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کا سوزِ دروں اپنانا ہی ہے جو آرٹ کی بنیاد ہے۔ یعنی جسکے دل میں غم ہے' سوز ہے' وہی آرٹ کی تخلیق کر سکتا ہے اور یہ غم عشق کا سوز' یہ خود بخود آنسو' شمع کے سے سوز کے آنسو ہیں' جنکی بابت خلیل جبران کہتا ہے 'آنسو سمجھ اور فہم کی بہتی زبان ہیں'۔ یہ ٹھنڈے آنسو' عشق کا یہ رابطہ' سمجھنا' سمجھانا مشکل ہے۔ یوں کہ لیں کہ جیسے اپنی رُوح اور جسم کے درمیان سانس کا رابطہ ہے کہ ذرا سی دیر یہ رابطہ رُک جائے تو بے چینی کی حد نہیں رہتی۔ ذرا سی دُوری یا دُوئی کا گمان بھی ہو تو جیسے جان سی نکل جائے۔ اب سنیں خسروؒ کا وہ شعر

گوری سوئی سیج پہ مکھ پر ڈارے کیس

چل خسروؒ گھر اپنے' سانج بھئی چو دیس

ایسے نازک سانحہ پر خسروؒ کی فطانت' رفاقت' عشق' سوز' ایک نکتہ پر سمٹ آئے ہیں۔ آفتابِ حیات پردہ کر رہا ہے۔ محبوب کا سانس کا ساتھ ختم ہو رہا ہے' کوئلہ جل کر راکھ ہو چکا ہے۔ سوزِ دروں نے اپنے تمام کمال کو پالیا ہے۔ کرسٹل (بلور) کی ساری شعاعیں سمٹ کر مرکز پر آگئی ہیں اور منزل اِلیہِ رَاجِعُونْ بھی نزدیک آچکی ہے۔

اَب پھر خسروؒ کی زندگی پر ایک طائرانہ نظر ڈالیں تو معلوم ہو گا کہ خسروؒ کی ذات میں زمانہ کی رُوح' عوام کی رُوح سمٹ آئی تھی۔ انکی فطری باطنی' سوز کی شِدّتوں میں غم جاناں کو وسعت ملی۔ یہ غم دوراں بن کر پھیلا۔ محبّت کے والہانہ پن نے سارے زمانے کو آغوشِ محبّت میں سمیٹا۔ زمانہ کی منتشر قوتوں کی شیرازہ بندی ہوئی۔ اپنے اندر زمانہ سے توحید قائم ہوئی تو زمانہ نے بھی اپنا ساتھ دیا۔ جس رُخ ہوا چلائی' اس رُخ مرغ باد نما کی طرح' خلقت مڑ گئی۔ موسیقی' شاعری' ادب' شوخی' ظرافت' تدبر' دانائی' تصوف' زُہد کے پس پردہ جمعیت بندی ہونے لگی۔ مختلف تہذیبوں کے ٹکراؤ میں

ملت کو فروغ کی راہ نکالنے کی کوشش کرتا ہے۔ زندگی کے ہر شعبہ پر یکساں مہارت کے ساتھ' اپنے نصب العین کی جانب راہیں نکالنا' صرف ایک فطین شخص کر سکتا ہے۔ خسروؒ نے اپنے زمانے میں جو کچھ کر دکھایا وہ تاریخ میں بہت ہی کم دانشور کر سکے۔ خسروؒ کا دربار سے تعلق اسی لئے رہا کہ مذہب اور عوامی رُوح کے تقاضے پورے کئے جاسکتے تھے۔

اس زمانہ میں بادشاہت ہی میں حکومت اور دینی اقتدار کا نظریہ تھا۔ خسروؒ کی زندگی میں کئی بادشاہ لے مگر وہ ہر دربار میں چراغِ محفل بن کر رہے۔ انکا دربار سے تعلق عام علماء سے علیحدہ تھا۔ انہیں وہاں سے کیا حاصل کرنا تھا۔ یوں کہہ لیں کہ وہ وہاں کچھ لینے نہیں گئے تھے بلکہ دینے گئے تھے۔ یوں بھی صوفی بزرگ دنیا کی پرواہ نہیں کرتے۔ خود حضرت نظام الدینؒ نے بادشاہوں کو ٹھکرایا۔ مگر خسروؒ کو دربار میں جانے دیا۔ انکی فطری لوچ' لچک' اور فطانت کو حضرت نظام الدینؒ نے جانچ لیا تھا۔ انکا تصرف' خسروؒ پر کچھ اس طرح تھا کہ خسروؒ کے اندر جو' جوہر تھا اس کو باہر نکالا' جیسے سورج کی روشنی میں جو دانہ زمین کے اندر رہے وہ باہر نکل آتا ہے۔ گیہوں سے گیہوں اور نیم سے نیم۔ اب خسروؒ کا اثر دربار پر یہ ہوا کہ اُمراء سے قریبی رابطہ پیدا ہوا۔ عوام میں ملوک کا دین اختیار کرنا قدرتی سی بات ہوتی ہے۔ اس لئے جس فن' ہنر' ادب' شاعری' موسیقی' تصوف' دین داری' خوش خلقی' اعلیٰ ظرفی' کی شمع خسروؒ نے درباروں میں روشن کی وہ خواص و عام میں پھیلتی گئی۔ بجائے سختی سے حکومت کرنے یا اسلام کی مخالف قوتوں کو سختی سے دبانے کے اصول کے' جو دوسرے دانشوروں کا مشورہ تھا' خسروؒ نے عوام کے دِل جیت لینے کا اپنا راستہ نکلا۔ اعلیٰ اقدارِ زندگی کو اپنا کر ہندی اور اسلامی تہذیبوں کے امتزاج سے ایک نئی ذہنیت اُبھری اور خسروؒ کی خود اپنی انفرادی شان' ایک درخشاں ستارے کی طرح ماحول کو روشن کر گئی۔

مقامِ اُردو

غور کریں تو قوموں کے بنانے اور اتحاد پیدا کرنے میں تین چیزیں اِنتشار کا بھی باعث ہوا کرتی ہیں کیونکہ انکی جڑیں قومی زندگی میں بہت دیرینہ گہرائی لئے ہوتی ہیں۔ جہاں تک زبان کا تعلق ہے خسروؒ نے اسی کو قومی اِتحاد کا ذریعہ بنایا۔ انہوں نے اردو زبان کا سنگ بنیاد رکھ کر رابطہء قومی کے لئے مضبوط داغ بیل ڈال دی۔ انکا شمار' اُردو زبان کے موجدوں اور قومی محسنوں میں کرنا بالکل حق بجانب ہے۔ عام خیال کہ یہ زبان' ہندی' سنسکرت فارسی کا مرکب ہے' ایک بڑی حقیقت ناشناسی ہے۔ نظر عمیق سے دیکھیں کہ مختلف تہذیبوں کے امتزاج سے فطین اشخاص میں نئے خیالات کی اشکال ابھرنی ایک فطری سی بات تھی۔ یہی تشکیل نو' نئی نئی ترتیبوں اور اصطلاحات کا پیش خیمہ بنی۔ یہ صرف ضرورتِ وقت کو پورا کر لینے کی بات نہ تھی بلکہ فطانت کے اظہار کی اِرتقائی شان تھی۔ اس جدت طرازی کے حق میں یہ کہنا زیادہ صحیح ہو گا کہ ہندی، سنسکرت اور فارسی کی زمین پر ایک نئی زبان' اپنی علیحدہ انفرادیت لئے پیدا ہوئی' جیسے کہ ماں باپ کے ذریعہ ایک نئی جان ظہور میں آتی ہے۔ اُردو زبان کی خود اپنی جُدا رعنائی اس بات کا ثبوت ہے۔ اس زبان میں آج خسروؒ کے سات سو سال بعد بھی' اپنی وہ انفرادی جوالانی' اُبھار اور زندگی ہے جو آگے کے سینکڑوں سال کے اِرتقاء کی ضامن بنی رہے گی۔

خسروؒ کی موسیقی

فن موسیقی میں خسروؒ نے جو جدتیں کیں وہ اگر ایک جانب انکی انفرادیت کی عکاسی کرتی ہیں تو دُوسری جانب ان کی جڑیں' ہزاروں سال پرانی تہذیبوں کی جھلک دے رہی ہیں۔ موسیقی میں تجرید کا رنگ خسروؒ پر دیکھیں۔ انکی فطانت نے وجدانی شِدّتوں میں' تعینات سے ماوراء مجردات کو پالیا ہے۔ وہ راگ راگنیوں کی وقت اور ماحول سے مطابقت' وہ سماواتی وقت یعنی گذشتہ' حال' اور مستقبل زمانے سے ہم آہنگی' وہ موسیقی کی زمین میں جدتیں اپنی نظیر آپ ہیں۔ اس موسیقی کا پس منظر' خسروؒ کا سوز بھی ہے' ظرافت اور شوخی بھی۔ غم پنہاں بھی ہے اور عشق کا والہانہ پن بھی۔ گویا خود خسروؒ کی ذات' موسیقی کا لباس پہن کر حقیقت کا سراپا بن گئی۔ وہی شدتِ شوق نمود' وہی اجبتُ کی تکرار' جو ذاتِ حق کو اظہار سے پہلے تھی۔ اب وہی حسن لم یزل' موسیقی کے ہزار پردوں میں سے' سرِ بازار رُونمائی کر رہا ہے۔ موسیقی میں اس گہرائی' اس فطانت کا اظہار' خود صاحب موسیقی کی لامحدود وسعتوں میں پھیل کر' انا دھر' کی کیفیت سے سرشار ہو کر' زمان یا دھر سے ہم آہنگ تھے۔ حدیث قدسی اَنَا دھرٌ لاتَسَبُّبُ الدَھَّر میں زمانہ ہوں' زمانہ کو برا مت کہو' اپنا لینے کی کتنی پیاری اور اچھوتی مثال ہے۔

جوہر بے بہا

اس طرح خسروؒ خود' ایک زمانے کی جھلک دیتے ہیں۔ انکی فطانت زندگی کے ہر شعبہ پر کلی طور سے چھائی ہوئی تھی۔ یوں ایک حکیم' دانشور کی حکمت و فہم' زندگی کے کسی ایک ہی پہلو پر چھائی ہوتی ہے' اور اسے دانشور حکیم' فطین کہا جاتا ہے جیسے ڈانٹے' گوئٹے' ہیگل' شیکسپئر' کالی داس وغیرہ۔ مگر خسروؒ تو زندگی پر چھائے ہوئے تھے۔ انکی فطانت کے اتنے پہلو اور رُخ تھے جتنے کہ ایک جوہر بے بہا کے یا جیسے کہ کائناتِ تخلیق کے۔ صحیح معنوں میں ایسی ہی ہستیاں فطین کہلا سکتی ہیں جو زندگی کے ہر رُخ پر پوری اکملیت کے ساتھ چھائی ہوں۔ اس لئے ضیاء الدین برنیؒ نے صحیح کہا تھا کہ امیر خسروؒ کے سے اوصاف و کمالات کا انسان برِّ عظیم کی خاک نہ پیدا کر سکی نہ قیامت تک پیدا کر سکے گی۔

اب ہمیں اس نابغہء روزگار خسروؒ کی انفرادیت' انکی فطانت' کو سمجھنے کے لئے انکی ذات کی کلی توحید کو کسی اور سطح پر پانا ہو گا۔ ان سے نسبت قائم کرنے کے لئے وہ جو تھے وہ آپ ہو جائیں۔ محبّت میں انکی طرف بڑھیں تو ایکائی پیدا ہو جائے گی۔ خسروؒ کا رنگ اپنے پر وارد کریں وہ حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے ساتھ مخصوص محفلیں' روحانی صحبتیں وہ تصوف کی دنیا میں ایک طائر لاہوتی' لازمانی' لامکانی کی سی پرواز اور انکی منزل:

نمی دانم چہ منزل بود شب جائے کہ من بودم

شدّتِ وجدان کی ان کیفیتوں میں سے خود ہو کر گزریں' صوتِ سرمدی کی محسور فضائوں میں بکھریں۔ وہ شوخی' وہ مستی' وہ سرشاری' وہ عشق ازلی کا نشہ' وہ سوزِ دروں جس کے لئے حضور نظام الدین اولیاءؒ نے فرمایا کہ کاش خسروؒ کا سوز مجھے مل جائے' تو اپنی چار ولایتیں انہیں بخش دوں۔ مگر خسروؒ کے لئے سب کچھ نظام الدینؒ اور خسروؒ کی زندگی کی تفسیر خود ان کی زبان میں:۔

آمد بگوشم' از جاں پیامے'

باجانِ جاناں، سازم کلامے

صد جان تازہ، بازم زکویش

منزل بہ منزل، گامے بہ گامے

دلبر چہ دلبر، سر تاج خوباں

خسروؐ چہ خسروؐ ادنیٰ غلامے

باب ۱۵

دُعا

خود بخود می آید اِیں آوازِ دوست

دِل کی چاہ

دُعا غم اُمّت کے دو آنسو ہیں۔ دُعا فرض بھی ہے اور سُنّت بھی۔ اُمّت کے لئے دُعا فرضِ عین بھی ہے اور سُنّت موکدّہ بھی۔ اُمّت کے لئے دُعا مقامِ معراج بھی ہے اور مقامِ شفاعت بھی۔ اُمتی کے لئے سب سے اونچا مقام عبدیت کا ہے۔ دُعا عبدیت کی پہچان بھی ہے اور اِقرار بھی۔

چار منازِل

دُعا کی چار منزلیں ہیں۔ پہلی منزل جب خلوص سے دُعا کرتا ہے تو اپنے کو اہل بنالیتا ہے مدعا کے لئے۔ یہ لطیفہء نفس کی سطح ہے۔

دوسری منزل، یہ دل کی سطح سے ہے۔ جب دُعا دِل سے ہو، اپنی ذاتی یا نفس کی افادیّت نہ ہو، تو یہ دل کا اہل جانا، ماحول کو بھی اس رنگ میں لاتا ہے کہ اسکا مدعا پورا ہو۔ دِل عرش الٰہی ہے۔

تیسری منزل سالک کی دُعا ہے۔ خواص کی بات ہے۔ انہیں صرف اس دُعا کے لئے خیال آتا ہے جو مقدرات میں ہو۔ حق کی مرضی دیکھ کر ہاتھ اُٹھاتا ہے۔

چوتھی منزل کُن کی ہے' یہ دُعا حکم ہے۔ یہ خاص الخاص کی بات ہے۔

زندگی کا اصول لیں تو چھوٹا سا کام بھی ہو وہ نیچے سے شروع کرنا ہوتا ہے۔ اسی لئے دُعا میں بھی بجائے اُوپر کے نیچے آئو۔ یہاں رضا اور قضا پر شاکر رہنے کا سوال ہے۔ اس رضا اور قضا کی برزخ سے دُعا کے وقت کیسے نکلے۔ جب اُوپر سے کوئی چیز مقرر ہے' قضا ہے' تو پھر دُعا کے معنی ہی کیا' فائدہ ہی کیا' حاصل ہی کیا۔ اس کے خلاف مانگا تو مقامِ رضا سے بھی گئے' راضی بہ رضا نہ رہ سکے۔ ہمارے خیالات میں یہ دُوئی اس لئے ہے کہ مرضی الٰہی کی جانب ہماری نظر نہیں۔ آخر کائنات چل رہی ہے اس کا ہمیں پتہ بھی نہیں۔ کُن کا کیف بھی نہیں' اور کائنات سے علیحدہ اپنے کو سمجھتے ہیں۔ ساتھ ساتھ اللہ کہتا ہے اپنے لئے دُعا کرو۔ یہ صرف آپ کی عزتِ نفس کی خاطر ہے۔ ورنہ ہوتا وہی ہے جو حق کی مرضی ہے۔ اس لئے یہی کہے کہ اے اللہ مجھے مُقدر پر شاکر رکھ۔

ایک مقدر اپنی باطنی صلاحیتوں کا دُوسرا نام ہے۔ دُوسرا مقدر جو لکھا ہوا ہے' وہ لوحِ محفوظ۔ اَب دُعا منحصر ہے اس بات پر کہ اپنے آپ کا تخیل آپ کے ذہن میں کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں انسان کا بھید مَیں ہوں' اور وہ میرا بھید ہے۔ اور یہ بھی فرمایا کہ کہ میں اپنے بندے کے گمان پر منحصر ہوں۔ تو اپنا آپا اگر جسم سمجھا تو نفس کے خلاف جو بات ہوئی اس سے گھبرائے' تلملائے' غمزدہ ہوئے۔ کیونکہ نفس کی بنیادی صفت ہے خوف' نااُمیدی' ایسی ظلمت اور نااُمیدی میں دُعا کیا۔ نفس ہے تو یہ خوف کسی طرح ختم کیا ہی نہیں جا سکتا۔ یہ لاعلاج بیماری ہے۔ اس کی جڑیں کروڑوں سال گہری ہیں۔

عشق تقدیر پر غالب ہے۔

البتہ اس نفس کو رُخ دیا جا سکتا ہے۔ محبّت سے بدلا جا سکتا ہے۔ عاشق بیباک نڈر ہوتا ہے' نہ صرف محبوب سے راضی بہ رضا بلکہ اپنا سب کچھ محبوب پر قربان کر دینے کی فکر میں ہوتا ہے۔ عشق تقدیر پر بھی غالب ہے۔ عاشق سے نہ پردہ ہے نہ حجاب اور تقدیر اس کی جیسے گھر کے باہر سے جھانکے۔ جب محبّت بے وجہ ہو' خود بخود ہو تب محبّت ہے۔ محبّت شکر کا جذبہ لئے ہوتی ہے' قربان ہونا جانتی ہے۔ اسی لئے رحمت کو جذب کرتی ہے۔ اپنی ظلمتیں گھیرے رہیں تو رحمت سے محروم ہوا۔ اپنی ناکامیوں کے پیچھے حق کی خصوصی توجہ کے احسان کو نہ دیکھا اس طرح اپنی جانب رُخ کراتا ہے۔ جس نے رحمت اور احسان کو قبول کر لیا وہ خوش نصیب ہے۔ رجوع الی الحق ہے۔

اِنسانی وجود

ذرا انسان اپنے وجود پر غور کرے۔ تقدیر اور تدبیر کی اِستعداد یا صلاحیت خود اس کے اندر موجود ہے۔ تقدیر اور تدبیر کو ہم جدا نہیں کر سکتے۔ البتہ یہ خیال ضرور گذرتا ہے کہ آخر ہم اس کے لئے کیوں کوشش کرتے ہیں جو مقدر میں نہیں ہے اور ناکام رہ کر اپنی ظلمتوں میں اور گرفتار ہو جاتے ہیں تو یہ ایسی بات ہے جیسے غیر شادی شدہ عورت بے ثمر ہوتی ہے۔ جب حق سے تعلق ہی نہیں تو ایسا شخص اپنی ہر بات کو حق سے لاتعلق دیکھے

گا' یا حق کی ہر مرضی کو اپنے سے لاتعلق سمجھے گا۔ ایسے کی دعائیں اپنی مایوسی کی وجہ سے قبول نہیں ہوتیں۔ اپنی ناعاقبت بینی سے وہ حق سے تعلق ہی قائم نہیں کر پاتا۔ وہ مرضیءِ حق دیکھنے سے ناکام رہتا ہے۔ ایسے کی دُعا سوائے اس اعلان کے کیا ہے کہ میری یہ خواہش ہے' مجھے چاہیے' میں اس طرح سے خوش ہونگا۔ اسے یہ بھی نہیں معلوم کہ اس کی رُوح کی تڑپ' پکار کیا ہے۔ قلب کی دنیا سے' وہ عشق' و محبت' سے وہ بے بہرہ ہے۔ مرکز عشق و محبت اگر اس نے کسی کو بنا رکھا ہے تو وہی اپنی خواہشاتِ نفس و جسم کو۔ اپنے احوال' اپنے اہل و عیال اور اپنی انفرادی زندگی کی ظلمتوں میں وہ ایسا گھرا ہے کہ نظر اس سے اوپر نہ عبادت میں اُٹھتی ہے نہ دُعا میں۔ زندگی کی تگ و دَو میں' نہ موانست و مجالست میں۔ گویا وہ ایک ہاتھ سے ہی تالی بجانے کی کوشش کر رہا ہوتا ہے۔ وہ دُوسرا ہاتھ حق کا ہاتھ' مقدر کا ہاتھ' اسے نصیب یوں نہیں کہ اس دنیا میں اس نے قدم ہی نہیں رکھا جہاں سے یہ ساتھ شروع ہوتا ہے۔' یعنی وہ قلب کی دنیا' تو ہی تو۔' اور جہاں سب کچھ' زندگی کا ہر پہلو' ہر قدم' ہر خواہش' ہر تمنا تیرے لئے ہوتی ہے۔ محبوب کے لئے ہوتی ہے۔

سمجھو تو دُعا کے معنی ہیں بُلایا' مدد مانگی۔ یوں عام بُلانے یا پکارنے میں نام شامل ہوتا بھی ہے اور نہیں بھی۔ مگر دُعا کے ساتھ اِسم ہوتا ہے۔ جیسے یا شیخ' یا اللہ۔ یوں قرآن کی جتنی دُعائیں ہیں' جمع کے صیغے میں ہیں' جیسے یا اللہ ہم کو سیدھا راستہ دکھا۔ 'ہم' کہتے ہیں اِنفرادیت ختم ہوئی۔ صرف اپنے لئے یا اپنے نفس کی خواہشوں کے لئے دُعا کرنا نہ ہوا۔ اسی لئے دُعا کی سطح کچھ ایسی ہوئی جیسے دُعا دی' دوسروں کو دُعا دی۔ اس کی مخلوق' ان کی اُمّت' کے غموں میں شریک ہوئے۔ اللہ اور رسولؐ کے ساتھ اپنی مرضی کو شامل کر لیا۔ انہیں اپنی مخلوق اور اُمّت سے جو لگاؤ رحمت کا تھا اس رحمت میں خود بھی آئے۔ اب کہیں الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡم کی مخلوق اور رحمت لِّلعالمین کی اُمّت میں ہوئے' دُعا کرنے کے مصداق بنے۔

خلُوص' دُعا کی پہلی منزل

یہ خلوص ہی دُعا کی پہلی منزل ہے۔ اس سے نچلی سطح پر دُعا کے کوئی معنی ہی نہیں۔ یہ پہلی منزل وہی ہے جب خلوص سے دعا کرتا ہے تو اپنے کو اہل بنالیتا ہے مدعا کے لئے۔ صرف دوسروں کے لئے دُعا ہی نفس سے اُوپر کی سطح سے ہو سکتی ہے۔ اور یہ جو ہم روتے ہیں بچے کے لئے ٹھیک ہو جائے تو وہ ہم نفس کی سطح سے دُعا کر رہے ہوتے ہیں' اپنا جو لگا ہوتا ہے' اس لئے قبول نہیں ہوتی۔ یوں وہ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡم ہے۔ اس کا کلام رحمانیّت سے پُر ہے۔ آیہءِ کریمہ پڑھ لیں یا کوئی اور آیتیں' تو اس کی رحمت سے اثر ہوتا ہے۔ البتہ ہم جو سمجھتے ہیں کہ آیہءِ کریمہ سے شفا ہوئی یہ بھی عجب نادانی ہے' پردہ ہے۔ ہم اس رحمت کو بھول جاتے ہیں جو رحمت محمدیؐ کی شکل میں ہے۔ وُسِعَ رَحۡمَتِیۡ یہ کرم' فیض' رحمت' سب نورِ محمدیؐ سے ہے۔ آیات' نشانیاں ہیں اس رابطہ کی جو عبد اور معبود کے درمیان ہے۔ جاننا ہو جانا ہے۔ دیکھنا ہو جانا ہے' پڑھنا ہو جانا ہے۔ جب اس کی طرف رُخ ہی نہ ہو تو انعامات کیوں ملیں' تمہاری کیوں سُنے' جب اس کے نہ ہو سکے تو نہ ٹوٹنا جانو گے' نہ انعامات پر مشکور ہو سکو گے' نہ اپنی نااُمیدیوں' ناکامیوں' سختیوں میں یہ دیکھ کر لطف اندوز ہو سکو گے کہ وہ تمہیں کس طرح اپنی طرف کھینچ رہا ہے۔

پھر جب اس کو اپنی جانب انعامات اور اِبتلاء دونوں میں متوجہ دیکھو گے تو اپنے لئے دُعا کیا کرو گے۔ اسے کیا سمجھاؤ گے کہ یہ کرنا وہ نہ کرنا۔ کیا وہ ناسمجھ ہے۔ سمجھداری کی بات تو یہ ہے کہ اپنے لئے اس سے یہی کہو کہ وہی اچھا ہے جو تجھے منظور ہے۔ اپنا اور اس کا تعلق تو عبد اور معبود کا ہے۔ عبادت لگن کا نام ہے۔ تعلق کے اقرار اور تازگی کی صورت ہے۔ اس انداز کی دُعا بہترین عبادت ہے۔ دُعا کیا مانگو۔ بے مانگے بہت دیتا ہے۔ فرمان ہے جو

میرے ذکر کی کثرت میں دُعا نہیں کرتا میں اسے زیادہ دیتا ہوں۔ اس طرح اپنی زندگی اور طلب اور عمل میں سے جب ظلمتیں نکل گئیں تو خواہ مخواہ نور نکلتا ہے۔ یوں بھی قدوس کے لئے پکار تو پاک ہونی چاہیے۔ 'قدوسیّت اور معصومیت لئے ہونی چاہیے۔ یہ ایسی دُعا ہے اور ایسی یاد ہوتی ہے کہ مشکل وقت تک میں مرحبا ہی منہ سے نکلتا ہے۔ جیسے قصیدہ بردہ شریف جو جزام کی بیماری میں لکھی گئی 'نعت رسولؐ ہے۔ نہ اپنی ابتلاء کا ذکر ہے 'نہ اپنی بیماری سے نجات کی طلب۔

یوں بڑے بڑے زُہد و تقویٰ والے اپنے گناہوں کی بخشش کے لئے بڑے خلوص اور سچّائی سے روتے رہتے ہیں۔ نظر غائر سے دیکھا جائے تو یہ بھی خود فریبی کا ایک رُوپ ہے۔ گویار کے آگے ہی رَو رہے ہوتے ہیں۔ مگر طلب تو اپنی ہی ہوتی ہے۔۔ اس لئے پچھلے کو یاد کیا کرنا۔ زندگی کی بات تو آگے دیکھنا ہے۔ یار کو ہی یاد کر لو۔ توبہ تک میں اپنی یاد ہو رہی ہوتی ہے۔ یہ خود پرستی ہی ہوئی 'خدا پرستی اسے کیسے کہہ سکتے ہیں۔، تو پھر کیا دُعا کی ہی نہ جائے۔ ہرگز نہیں۔ یہ ایک قسم کی ناسمجھی کی بات ہے۔ مانا کہ سنت الٰہی مقرر ہے۔ تقدیر مقرر ہے 'لوحِ محفوظ کی تحریر اٹل ہے۔ مگر اللہ کی ربوبیّت کوئی ساکن چیز تو نہیں۔ اللہ تو اللہ 'سورج تک سب کو نوازتا ہے۔ جو بھی اس ربوبیت کے ساتھ مصروفِ عمل ہو وہ اس ربوبیت کے نشر کا ذریعہ بنتا ہے۔ جس رُخ کہ کائنات چل رہی ہے 'جو مشیّت اور مرضیء الٰہی ہے 'اس کیفیت کے ساتھ انسان دم ساز ہو جائے تو تقدیر ساز گار ہوتی ہے۔ تقدیر 'تدبیر 'ہم آہنگ ہوتی ہے۔

یوں دُعا ہو یا زندگی کا کوئی عمل ہو 'بات بس خلوص اور لگاؤ کی ہے 'قلب و محبّت کی سطح کی ہے 'حیاتِ انسانی سے اوپر کی سطح کی ہے 'حیاتِ انسانی کی حقیقت کی راہ میں پہلے قدم کی ہے۔ اسی کے لئے ساری ہدایات اور صحیفے اُترے۔ انبیاء اور اولیاء بھیجے گئے 'پیرویان اسی سطح سے دُعا مانگنے کے حقدار ہوئے۔ انہوں نے خدا کی طلب اور پہچان مانگی۔ رشتہء عبد و معبود قائم ہوا۔ اور اِدھر سے محبّت کی تڑپ میں ارشاد ہوا کہ مجھ سے مانگو میں تم کو دُوں گا۔ اُدْعُونِیْ اَسْتَجِبْ لَکُمگر عاشق مانگے بھی تو کیا۔ اپنے لئے مانگ کر بھی اپنے عشق کی بے حرمتی کیسے کرے۔

جان تم پر نثار کرتا ہوں

مَیں نہیں جانتا دُعا کیا ہے

ناز پروردوں کی دُعا

اسی لئے دُعا کا یہ رُخ ہوا کہ تجھ سے مانگا 'تیری خوشنودی کے لئے 'تیری مخلوق 'تیرے محبوب کی اُمّت کے لئے۔ کبھی تیری مرضی کو دیکھ کر مانگا 'جیسے حضرت عمرؓ اور ابو جہل کے درمیان دُعا اور کبھی محبّت کی شوخی میں 'وہ انداز کہ میرے تیرے میں فرق نہ رہا 'تو جو تیری مرضی وہ میری مرضی 'اور جو میری مرضی وہ تیری مرضی۔

اَلتَّحِیَّاتُ لِلّٰہِ وَالصَّلَوٰۃُ وَالطَّیِّبَاتُ

یہ ناز میں پرورش پانے کی بات ہے۔ یار کی ادائوں کو اپنا کر زندگی گذارنے کا صِلہ ہے۔ یوں عبادتوں ریاضتوں میں لاکھ جان ماریں' ماننا نہ ماننا تو اُدھر سے ہے۔ عبادت الگ چیز ہے' اور معبود ملنے کی بات دُوسری ہے۔ یہ بات تو دامن کی ہے۔ قرب اور روشنی تو بس دامن رحمت میں ملتی ہے۔

ایک بزرگ نے وصال سے پہلے عجب بات بتائی جس سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ یہ بزرگ بچپن سے لے کر بڑھاپے تک فقیری کی زندگی گذار چکے تھے۔ نہ صرف یہ کہ عالم دین و شریعت' پابند صوم صلواۃ' ہر دم مشاغل و ذاکر تھے' بلکہ آمرین وقت میں سے اور مقام رُوح' انتقال رُوح' وسیر فی الارض والے' زمانہ کے لئے رُشد وہدایت کا سرچشمہ' تذکیہء باطن و تسکین قلوب کے لئے مرجع خلائق' قادریہ' نقشبندیہ' چشتیہ سلسلوں میں ایک اعلیٰ مقام اور دسترس رکھنے والے۔ انہوں نے مجھے تنہائی کرا کے اپنے پاس بلایا اور بتایا کہ میں کئی دن سے سخت بیمار تھا۔ میرا ایک مرید دُور دراز سے چلا اور مجھ تک پہنچا۔ اس نے عرض کی چار پانچ دن کا راستہ طے کر کے آیا ہوں۔ وجہ یہ کہ جو رُوحانی تعلق میرے اور آپکے درمیان تھا وہ مفقود ہوا تو مجھے خطرہ لاحق ہوا کہ شاید آپ انتقال کر گئے۔ اسی لئے آیا ہوں۔ ان بزرگ نے مجھ سے حسرت سے کہا' جس کے پیچھے برسوں کی ریاضتیں اور مجاہدے تھے' کہ اس مرید نے مجھے عجب سبق دیا۔ اب مجھے معلوم ہوا کہ مرنے کے بعد سارے لطائف ختم ہو جاتے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ اس حسرت و یاس کا اندازہ وہی لگا سکتا ہے۔ جس نے اپنا خون پسینہ طریقت کی راہ میں صرف کیا ہو۔ یہ بزرگ اب انتقال فرما چکے ہیں۔ ان کا سارا سرمایہ اگر عبرتِ نگاہ سے دیکھا جائے تو سوائے ان فیوض اور برکات کے اور کیا ہو سکتا ہے' جسے رحمتً لِّلعَالمینی ہی کہا جا سکتا ہے۔ حق یہی ہے کہ دامن رحمتً لِّلعَالمینی ہی سب کچھ ہے۔ اور یہ انہیں نصیب تھا۔ جیسے ہی میں نے یہ توجہ دلائی ان کا چہرہ روشن ہو گیا۔

انسان کیا' اس کی بِساط کیا' اس کے مجاہدے کیا' اس کی ریاضتیں کیا۔ موت کے بعد جو چیز قائم رہتی ہے' اس تک رسائی نہ ہو تو جینا بے کار ہے' مرنا بے کار ہے۔ ہر چیز اپنے مجاہدے' بچے وغیرہ سب قبر تک ختم۔ زندگی میں البتہ محبّت و رحمت کی اقدار جو دائم قائم ہیں وہ مرنے کے بعد بھی رہیں گے۔ یہ اسی وقت کر سکتے ہیں جب آپ کی نِگہ اُدھر سے ہو' اس چار دن کی زندگی سے نہیں۔

ایک ہاتھ میرا' ایک ہاتھ تیرا

ہم دُعا کرتے ہیں' کچھ نہیں ہوتا۔ کیونکہ غوثِ پاکؒ، نے فرمایا' دُعا تو حکم ہوتا ہے۔ ادباً اسے دُعا کہہ دیتے ہیں۔ یہ جیتے جی وِصال ہو جانے سے پہلے نصیب نہیں ہوتا۔ ایک ہاتھ میرا' ایک تیرا۔ ایک قدم میرا' ایک تیرا'

ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یارَب

ہم نے دشت امکان کو ایک نقش پا پایا

یہ وہی جانتا ہے جو عمر بھر بھاڑ جھونک کر ایک پیر میں آ کر اٹک جائے۔ دوسرا نقش پا جو ہوا۔ یہ کتنے رَمز کی بات ہے۔ دیکھتے آئے ہیں کہ پاک طینت' پاک خون لوگوں نے عمریں گذار دیں' علم کی جستجو میں' حقیقت کی پیاس میں۔ ان کے اعمال میں ولولہ بھی تھا اور خود شناسی کی جدوجہد بھی۔ مگر بالآخر جب دیکھا کہ بس کچھ دن اور باقی ہیں اور روشنی نہیں ملتی تو فقراء کی طرف رجوع ہوئے۔ واقعہ یہ ہے کہ سارے دشت امکان کو انہوں نے طے کیا اور نقش پا کو ہمیشہ نظر میں رکھا' خلوص' اور محبت کے ساتھ' مگر بالآخر انہیں یہ معلوم ہوا کہ وہ صرف ایک ہی نقش پا تھا' دوسرے کا پتہ نہیں۔ اس دوسرے نقش پا کا پتہ تو کیا دینا تھا۔ مگر حضرت خضرؑ نے حضرت موسیٰؑ کو یہ ضرور بتایا تھا کہ ایک نقش پا اور بھی ہے۔ جس کا انکشاف علم لُدنی سے ہے۔

ہم اس ذاتِ پاک کے طالب ہونے کی وجہ سے یوں خوش نصیب ہیں کہ اس دوسرے نقش پا کا بطونِ قرآن میں' مغز قرآن میں بین موجود ہے۔ یہ صراطِ مستقیم شمس حقیقت کی روشنی میں راستہ چلنے کے لئے ہوتا ہے۔ اپنے انجام یا انفرادیت و خود غرضی تک پہنچنے کے لئے نہیں۔ نہ ہی صرف حقیقت سمجھنے اور دیکھنے کے لئے۔ ایک محاورہ ہے کہ موڑ سے پرے کیا ہے' تب ہی پتا چلتا ہے جب موڑ تک پہنچ جائیں۔ یہ بھی مالک کی شان ہے کہ انسان کو قیام عطا فرمایا اور دو پیر دئے' چلنے کے لئے اُڑنے کے لئے پَر نہیں دیے۔ ایسا ہوتا تو قیام نہ ملتا۔ جب دوسرا نقش پا مل گیا تو گو بظاہر دو نقش ہیں مگر ایک واحد کے۔ اور وہ ساکت نہیں' محرک ہیں' رواں دواں ہیں فقراء کا کہنا ہے کہ یہ دوسرا نقش پا' انفاس یعنی باطن کی دنیا میں رکھا جاتا ہے۔ محض انفاس کی دنیا میں گم ہوئے' سبحان اللہ کہا اور مجذوب ہوئے۔ آفاق کی سیر کی' الحمد للہ پکار اٹھے' زینت کائنات بنے۔ اور جو انفس و آفاق کو توازن میں لئے' اپنے مقصود' شمس حقیقت کی روشنی میں رواں دواں چلتے ہی گئے' وہ حقیقتاً پھیلتے ہی گئے۔ اور جو یہ کہتے ہیں کہ انسان کی ساری بے کلی اور بے چینی کی وجہ یہ ہے کہ رُوح جو آزاد ہے' اس جسم کی قید سے نالاں ہے' تو اس بے کلی کو تب قرار آئے جب پھیلتے پھیلتے اس شمس کی روشنی میں اتنا پھیلے کہ جزو کل کا احساس بھی جاتا رہے۔ رُوح کی آزادی کا سرور کچھ ایسی زندہ اور محرک کیفیت ہے جو ایک لرزتے ہوئے شعلہ میں ہوتی ہے۔

یہ دوسرا پیر' دشت امکاں سے ماوراء ہے۔ یہ جو پیر ہے' کُن فیکون کی بانگ دُھل ہے۔ جیسے ایک فوج ڈھول کی تھاپ پر چلتی ہے' صحیح ڈھول بجتا رہے تو فوج کے قدم خود بخود ٹھیک پڑتے ہیں اور اگر ساتھ ساتھ بیگ پائپ ہو تو پھر ایک نشہ۔ ڈھول کی تھاپ تو ہوش کی بات ہے مگر بیگ پائپ ایک نشہ کی مستی۔ اور یہ شہنائی' کی سریلی آواز عشق کی الاپ ہوتی ہے۔ اس طرح ایک کُن دوسرا فیکون۔ زندگی کے صحرا میں ان دو پیروں سے بھاگتے ہیں۔ بغیر کُن کے اپنے اندر ہونے کے نہ کائناتِ وجود سے ہم آہنگی ہو سکتی ہے' نہ خالق کائنات سے۔ ایک عاجز' عاشق ہی اس رابطے کے دائمی تشکر میں ہوتا ہے۔ اس کے لئے دُعا کا دروازہ کبھی بند نہیں ہوتا۔

توبہ کا دروازہ مانا کہ آخر وقت میں بند ہو جاتا ہے مگر دُعا تو سراپا رشتہء رحمت ہے۔ آخر وقت تو یہ رشتہ اور مضبوط ہو جانے کا وقت ہو جاتا ہے۔ نازک سے نازک وقت میں تو اور قربت نصیب ہوتی ہے۔ اس لئے دُعا کا دروازہ بند ہونے کے صرف یہی معنی ہو سکتے ہیں کہ ہزار کوشش کے باوجود قلب اُدھر رجوع نہیں ہوتا۔ مگر طلب میں شدّت ہے تو کسی طرح ہار نہیں مان سکتا۔ کسی نہ کسی چور دروازے سے ضرور پہنچنا چاہے گا۔ کسی حالت میں ہار نہ مانے گا۔ یہ طلب صادق کی بات ہے جو باطن کی گہرائیوں میں نصیب ہوتی ہے۔ یہ ضد کی بات نہیں۔ طلب صادق میں عجز اور شکر ہوتا ہے' اور بلا کی تشنگی' اس لئے رحمت ضرور آتی ہے۔

دُعا کے طریقے

اس رحمت کو اپناتے ہوئے دُعا کے دو ہی طریقے ہیں جن سے قبول ہوتی ہے۔ ایک عجز' ایک حکم۔ یہ عاشق اور عارف کے مقام سے ہے۔ عاشق کی دُعا کیا ہوتی ہے۔ بابا قادرؒ سے ایک دفعہ پوچھا دُعا کیا ہوتی ہے تو فرمایا۔ اللہ تعالیٰ اور نبی کریمؐ نے جو طریقے بتائے ہیں وہ حق ہیں۔ البتہ اکثر اچھے اچھے رنجیدہ خاطر ہوتے ہیں کہ آخر دُعا قبول کیوں نہیں ہوتی۔ دُعا کے قبول نہ ہونے کے متعلق بہت سے اقوال ہیں۔ مگر اس دِل آشفتہ کی تسلی نہیں ہوئی۔ بابا جانؒ نے پوچھا کیا تم نے کبھی کوئی اینٹوں کا بھٹہ دیکھا ہے' جب وہ پورے تائو پر ہو تو کھڑکی کھول کر اندر بھی جھانکا ہے۔ جب میں نے ہاں کہا تو فرمایا کیا دیکھا۔ میں نے عرض کیا آگ ہی آگ۔ پوچھا' اس وقت اینٹ اور آگ میں کوئی امتیاز کر سکتا ہے۔ عرض کیا نہیں۔ تو پھر ارشاد ہوا کہ اس حال میں جو اینٹ کی زبان سے نکلے وہی کُن ہے۔ اور دُعا اور قبولیت میں کوئی فصل نہیں رہ جاتا۔ پھر عرض کیا کہ حضور اس حال میں کوئی چیز کوئی کیا یاد رکھے۔ تو ارشاد ہوتا ہے کہ فَاذْکُرُوْنِیْ اَذْکُرْکُمْ۔ کوئی فرد یا جمعیت اگر اس بھٹی والے کی طرف رجوع ہو تو خواہ مخواہ اینٹ کے وجود سے بھی وہی دُعا نکلتی ہے۔ یہ عاشق کی دُعا۔ عاشق ارض پر قیام کئے ہوتا ہے۔ اور عارف سمٰوات میں۔ تمثیلی اعتبار سے ارض زمین کو مان لیں یا اپنے وجود کو اور سمٰوات اپنی لطافتوں یا آسمانوں کو' تو عارت کا قیام کم از کم جبروت میں ہوتا ہے۔ اور طریقت کے کاملین' ملکوت میں ہوتے ہیں۔ اہل ملکوت تو صرف اس اَمر کے لئے ہاتھ اٹھاتے ہیں جو لکھ چکا ہو۔ قبولیت تو حاصل ہے ہی۔ اتنی بات ضرور ہے کہ یہ نزول سہل ہو جاتا ہے۔

عارِف کی دُعا

عارِف کی دُعا یہ ہے کہ سموٰات سے جب عاجزی اور عبودیت کی امانت کا بوجھ اٹھا لیتا ہے تو ایک شاہین کی طرح اپنے پروں کو سمیٹ کر' تیر کی طرح' زمین پر اُترتا ہے۔ اس طرح وہ حقیقت کے سمندر میں گرتا ہے۔ سمندر کی ساکت اور قائم سطح میں جو موجیں اُٹھتیں ہیں ان میں کُن کا ارتعاش ہوتا ہے۔ بحر حقیقت کا غم نہیں ہوتا۔ یہ وہی غم ہے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اُمت کے لئے تھا' یہی غم' عارف کو عجز کا سرمایہ عطا کرتا ہے اور اسی عجز کے سہارے اسکا ارض کی سمت نزول ہوتا ہے۔ عجز انتہائے انسانیت ہے' بہت مشکل ہے۔ اس عجز میں دُعا کے لئے جو ہاتھ اٹھاتے ہیں وہ بھی عمل ہے۔ خلوص سے دعا کے لئے ہاتھ اسی وقت اٹھتے ہیں جب کوشش بھی ہو رہی ہو' خواہ لاشعوری طور سے ہی سہی مگر عمل کرتا رہے گا کیونکہ دراصل جب مقدرات میں ہے اسی کے لئے ہاتھ اُٹھتا ہے' یا اس کے اُلٹ' کہ خلوص سے ہاتھ اٹھائے' تو مقدر بن گیا۔ یہ دونوں باتیں ایک دوسرے سے منسلک ہیں۔ خلوص' اللہ کی ان نعمتوں میں سے ہے جو ان بندوں کو دیتا ہے جن سے اسے محبّت ہے۔ خلوص میں سارے خول جھڑ جاتے ہیں۔ جیسے انسان بیماری کی انتہائی تکلیف میں ہو تو سب جھڑ جاتا ہے۔ ایسے ہی خلوص میں ایک ہو کر رہ جاتا ہے۔ ظاہر باطن سے جھڑ جاتے ہیں۔ جب ایک رہا تو اس کا کہنا اٹل ہے۔ یہ خلوص کی دعا کا مقام ہے۔ اَنْعَمْتُ عَلَیْھِمْ پر مقام ہے' اصلی انعام ہے۔ اگر لگن ہے' عقل و دل ایک ہی بات کہتے ہوں' دُھن ہو' صداقت ہو اور شِدّت کے ساتھ ہو' تو قبول ہو گی۔ ورنہ جو چیز اپنے اندر نہیں ہے وہ اثر ہی نہیں کرتی۔ بے دلی سے ہاتھ اٹھتے ہیں حالانکہ دُعا سے بہتر عبودیت کا اظہار کوئی نہیں ہو سکتا۔ اور کہا گیا ہے کہ عبودیت پر پہنچنا ہو تو دُعا مانگو۔ ہر چیز کے لئے مانگو' ہر وقت مانگو' کیونکہ دُعا جو اپنی تکلیف اور آرزو کے لئے کرتے ہو اس تک سے وہ ڈورا بندھ سکتا ہے جو رحمت کے رشتے میں پرو دے۔ اس سے بہتر عبادت اور کیا ہو سکتی ہے۔

پتّہ پتّہ حکم کا تابع

یوں پتّہ پتّہ اس کے حکم کے بغیر حرکت نہیں کر سکتا۔ پتّہ پتّہ اپنی اپنی سطح پر اس کا امر لئے ہے۔ اپنے ہی اندر یہ اَمر ہے اور قدرت کے اصولوں کے تحت ہے' بے لگام نہیں۔ جائزہ لے تو ہر کام انسان خود نہیں کر رہا' بلکہ اس سے کروایا جارہا ہے جب تک قویٰ میں جان ہے' جسم و اعضا ساز گاری کرتے ہیں' عمل کرتا ہے۔ جیسے جب قوتِ حیات میں کمی ہوئی تو خود بھی کرنا چاہے تب بھی مجبور ہے۔ یہی حال کچھ دُعا کا ہے کہ اس کے لئے اپنے ہی اندر محرک قوت ہے' خلوص ہے۔ انسان بغیر خیال کے حرکت نہیں کر سکتا۔ خیال ہی اس سطح پر محرک قوت ہے اور محبّت کی دنیا میں بغیر عشق کے جذبے کے شدّتِ عمل نہیں آتی۔ اس حالت میں عشق ہی حکم ہے' شدّت عمل کے لئے۔ اور حکم دل کی چاہ کے سوا کچھ نہیں۔ اس میں سراپا خلوص ہے' صداقت ہے' محبوب سے یکتائی ہے۔

اس سے ایک منزل اوپر بغیر روح کے تصرف کے انسان عروج عمل نہیں کر سکتا۔ اس حالت میں رُوح' حکم ربی ہے' جدھر خیال چلا اِدھر چلی لیلیٰ (روح) خیال اور مرضیء الٰہی ساز گار ہیں۔ رُوح اسی جانب رواں دَواں ہے' روح ہے ہی سراپا حکم' اسی کے تصرف میں جان' عشق' خیال' قوت' وغیرہ ہیں۔ یہ جو لوحِ محفوظ کی تحریر ہے یہ وہی تو ہے جس کے تحت امر روح و جان و قلب و خیال ودیعت ہوا ہے۔ اسی لئے اس سطح سے جب دعا ہوتی ہے تو کُن کی سطح سے ہوتی ہے۔ زبان بندے کی اور حکم اسی کا۔ یہ اسی کے اَمر سے ہے جو مجھے ملا ہے' میرے اندر پھونکا ہے۔ میرے (Genes) جینز میں ہے' لوحِ محفوظ میں ہے' یہی روح میری جان کی جان ہے۔ اور یہ وہ قوت ہے جس سے جان نے وجود لیا۔ اور اَب جان کے ذریعہ جسم کی حرکت ہے۔ خیال' خواہشات' جذباتِ قلبی اور وجدانی کیفیات' عشق وغیرہ' اسی کے وسیلے سے ہیں۔

یہ تو رہا فرد کی حد تک' اب فرد اور ماحول کے عمل اور ردِّ عمل میں یہ حکم الٰہی کس طرح دیکھا جائے۔ مثلاً کسی کو خزانہ مل گیا' کسی کو بلاوجہ کسی نے مار دیا' یا کُتّے نے کاٹ لیا' ایک طوفان یا سیلاب نے تباہی مچادی۔ تو بات یہ ہے کہ مَیں نہ اپنی مرضی سے پیدا ہوا نہ اپنے خیال کے مطابق بنا' نہ اپنے ارادہ سے زندگی پر متصرف رہا۔ یہ تصرف سب اسی کا ہے جس کا حکم چل رہا ہے۔ ایک چھپا خزانہ حکم لئے ہے پہچانے جانے کا' ایک گھِرا ہوا مجبور انسان مجبور ہے' سختی اُٹھانے پر۔ ایک سیلاب' ایک طوفان ایک وبا مجبور ہے تباہی کرنے پر' سورج حکم لئے ہے' روشنی اور حیات بخشنے پر۔ ابر رحمت حکم لئے ہے حیات و نمو عطا کرنے پر۔ ایک صاحب امر' حکم لئے ہے مرضی چلانے پر' کوئی غیر تو نہیں۔ آخر کو تو صاحب تصرف ہے خلیفۃ اللہ ہے' کائنات میں مرضیء حق کو چلانے کا یہی وسیلہ ہے' قوانین فطرت۔ مرضیء الٰہی کے ساتھ ایک ہی اِکائی میں ہے۔

یوں عام انسان کے لئے یہی ہے کہ جو ہوتا ہے ہونے دو۔ پتّہ پتّہ اس کے حکم کے بغیر حرکت نہیں کرتا۔ حرکت میں ہی حکم کُن چل رہا ہے۔ ایک توازنِ اِرتقاء میں کائنات چل رہی ہے۔ ایک قطرہ' سمندر کا توازن کیسے برباد کر سکتا ہے یا سمندر کو اپنے توازن پر کیسے لا سکتا ہے۔ میری حیات' الحیات ایک توازن میں ہیں تو مثبت' منفی سب ایک ہی توازن میں ہیں۔ کیف میں آئو تو وہی ایک' ہوش کی دنیا میں رہو تو دُوئی۔ ایسا کیوں ویسا کیوں۔ اس وہم دُوئی سے نکلنے کے لئے غوثِ پاکؒ نے فرمایا پہلے خلق سے مَر جائو' پھر نفس سے' پھر اپنے ارادے سے' جب یہ ہوا تو حق کا ارادہ' اَمر رَبی ہی ایسے

میں کار فرما ہو گا جب اور کسی کا ارادہ رہا ہی نہیں تو ایسے کی دُعا مقبولیت کی منزل میں ہو گی۔ جب تک کثافت وجود میں موجود ہے' دنیا میں پھنسا ہے' اپنی نفس کی خواہشات اور طلب میں پھنسا ہے تو راہ کیسے مِلے۔ الطف در الطف کا عرفان کیسے ہو۔

حق کی حقیقت سے ہر انسان اپنے اندر ہی رُوشناس ہو سکتا ہے۔ مَنْ عَرَفَ نَفْسَہٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّہٗ یوں سادہ آدمی اللہ کو ایک شخصیت مانتا ہے۔ اللہ تک کو تفرید میں اتار کے ایک روپ دے دیتا ہے۔ یہ ضروری تھا حضرت موسیٰؑ کے زمانے تک۔ حضرت عیسیٰؑ نے تجرید کی طرف رُخ دلایا۔ اسی لئے قلندر اوّل کہلائے۔ اور اسلام کی توحید کا تو یہ انداز ہوا کہ کثرت میں وحدت' وحدت میں کثرت۔ اگر ہم کائناتِ وجود کو ایک سمندر مان لیں اور اپنے کو موج' اب اس موج میں سے لہر کا شعور ہٹا دیں تو کہے گا سمندر ہے۔ اُنگلی جس جگہ رکھ کر کہے گا کہ سمندر ہے تو وہی سمندر ہے۔ سارے سمندر پر اُنگلی کیسے جائے۔ وہ اس حالت میں یہی کہہ سکتا ہے کُل ہے۔ یہ نہیں کہے گا کہ میں اس کا جزو ہوں۔

یوں سادہ آدمی کا عقیدہ بھی مبارک ہے۔ اس کی دُعا بھی قبول ہوتی ہے۔ مصیبت پڑتی ہے تو ان لوگوں کی' جو سوچتے ہیں کہ تو کہاں ہے۔ جنہوں نے سائنس پڑھی وہ تو یہی کہیں گے کہ کہاں ہے ساتویں آسمان پر خُدا۔ ان کے لئے خلاء اور وقت کا سوال ختم ہو جاتا ہے۔ مکان ختم ہوا تو زمان بھی ختم ہوا۔ اِدھر حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اَنَا دَھر' تو بات یہ ہے کہ یہ لوگ حق کی تجرید کو بھول جاتے ہیں۔ یہ سادہ لوح تو نہیں کہ یہ بھی نہ دیکھ سکیں کہ مجردات کی شکل میں حقیقت کہاں ہے۔ وُسِعُ عَلٰی کُلِّ شَیٍٔ نظر لطافت سے طاقتوں اور مجردات میں دیکھیں تو ہر شے کا باطن الطف در الطف صورت میں وہی حق ہے۔ جب باطن در باطن کو حق مان لیں' ھُوَ الظَّاھِرُ ھُوَ الْبَاطِنُ تو وہی مرکز تخلیق ہے۔ کسی فرد یا شے کی انفرادیت یا تفرید' دراصل اسی حق کی تجرید یا مجردات کا نقطہ ہے۔

دَردِ اُمّت

جب مادیات سے نظر ہٹے' حقیقتوں میں زندگی گزرنے لگے' تفرید میں بھی حق کی تجرید نظر آنے لگے' تب ہی حق شناسی کا مصداق بن سکتا ہے۔ جب تک خلق' نفس اور ارادے سے نہ مَر جائے آلائشوں سے کیسے چھوٹ سکتا ہے۔ جب لذّتیں دُنیا کی پھیکی پڑ جائیں تب ملتی ہے رُوح۔ جب انعام کے طور پر ملے تو وہ ہے مسلمان کی رُوح۔ دین اور دنیا بھی وہی ہے جو اللہ کی طرف سے ملے۔ جب تک دُنیا سے قطعی بے تعلق نہ ہو' اِنعام کبھی نہیں ملتا۔ کلمہ بھی لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ پہلے سب کو کہنا ہے' صداقت سے۔ جب ایک دفعہ کہہ دیا' پھر فرق کہاں رہا۔ اگر یقین نہیں تو لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللّٰہ کیوں کہا۔ جو کچھ بات بنتی ہے وہ حضورؐ کے تعلق سے ہے۔ لہٰذا سب سے بڑی دُعا اور سُنّت اُمّت کا درد ہے۔ یہ لگن لگتی ہے نسبت محمدیؐ سے' باطن اُمّت کا شعور ایک نصبُ العین کے لئے جینا اور مرنا ہے۔ اُمّت میں اِنتشار ہو تو اقبال مندی جاتی رہتی ہے۔ اُمّت کے معاملہ میں ایک دل کی' رُوح' آرزو و تمنا ہوتی ہے۔ وہ تو شاید سب میں ہے۔ اس لئے سب مل کر دُعا کریں۔ شاید ہم میں سے وہ اویس قرنیؓ نکل آئے جو اُمّت کے لئے دُعا کرنے کا مصداق ہو۔ اس صحیح دُعا کا تعلق تعداد سے اتنا نہیں ہے جتنا کہ مرکزیت سے لگاؤ سے ہے۔ رابطہ اور وسیلہء محمدیؐ سے ہے' جس کا تعلق اپنے قلب و رُوح کی گہرائیوں میں باطن سے ہے۔ باطن سے ظاہر بنتا ہے۔ اس بات پر پابند رہے تو بات بن جائے گی۔

کربلا کے موقع پر حضرت امام زین العابدینؑ کی دُعا نہ اپنی حالت زار کی فریاد تھی' نہ اعانت کے لئے پکار تھی۔ رحمت ؐلّلعالمینی نسبت نے اس وقت بھی گوارانہ کیا کہ قوم دین و دنیا میں اپنے اعمال اور شقیق اُلقلبی کی گرفت میں آئے۔ یہ دُعا قوم کی بیماری سے' قوم کو صحت عطا ہونے کے لئے تھی۔ ایسی ایک سُنّت کو اپنالو' اپنا غم چھوڑ دو۔ اُمّت کے غم کو اپنالو تو تمہیں زکوٰۃ میں بہت کچھ ملے گا۔ دُعا کو پاک کرنے کے لئے غم ضروری ہے' جیسا امام زین العابدینؑ کو تھا۔ اپنے غم چھوڑ کر غم اُمّت کو اپنایا۔ رحمت ؐللعالمین کے عشق نے اپنی اور اپنے اقرباء کی طرف نظر نہ جانے دی بلکہ اُمّت کی ابتلاء کی طرف اس حالت میں بھی رُخ لیا۔ اُمّت کی دین دُنیا کی بربادی کیسے دیکھی جاسکتی تھی۔ اُمتی اُمتی اس حالت میں بھی کہا جارہا تھا۔ رحمت ؐللعالمین کے اسی عشق مجلیٰ نے غم اُمّت دیا۔ معراج میں اُمتی اُمتی ہوا تو کربلا کے میدان سے بھی یہی سُنّت ادا کی گئی۔

صحیح معنوں میں جس کے گلے میں طوق محمدیؐ پڑا ہے وہ حال اور موجودہ کیفیت کو نہیں دیکھتا' بلکہ اُمّت کے لئے جو ہونا ہے' اس پر اس کی نظر ہوتی ہے' اور ہونا ہے کُن۔ اس کُن کی ابتداء اِسی نقطہ سے ہوتی ہے جسے تصوّر کہتے ہیں۔ ان پر عذاب کیسے نازل کر سکتا ہوں جب تم ان کے درمیان ہو۔ یہی بات وارثانِ نبیؐ کے لئے ہوتی ہے۔

اندازِ درد

رحمت ؐلّلعالمین کی اس رحمت کی تائید میں ہر دُعا سے پہلے اور آخر میں درُود شریف پڑھا جاتا ہے۔ جب پورا درُود شریف پڑھتے ہیں تب دُعا قبول ہوتی ہے۔ اور وہ درُود بھی کچھ ایسی ادا لئے ہے کہ ہم تیرے محبوب پر درُود بھیجنے کے لائق کہاں' اے اللہ تو درُود اور صلواۃ بھیج ان پر اور ان کی اولاد اور اصحاب پر۔ اَللّٰھُمَّ میں کوئی تیسری شخصیت نہیں ہے۔ اپنا نقطہء وجود حق ہے۔ (اے اللہ) اس لئے جب اس ذاتِ گرامی کی طرف رجوع ہو تو اسی نقطہء حقیقت وجود سے رجوع کرو۔ محبّت کے درمیان' تیسری شخصیت کیسے آسکتی ہے۔ اس رنگ میں جب ہو جائے تب مزہ ہے صَلِّ عَلیٰ کہنے کا۔ تب لُطف آتا ہے۔ کہ صلوٰۃ اور اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلیٰ کا ایک ہی مخرج ہے۔

یہ قلب کی دنیا ہے جیسے رُومال کا مِلا تو اس کی خوشبوئوں میں محبوب میں بس گئے۔ محبّت سے بڑی عبادت یا دُعا کیا ہو سکتی ہے۔ عبادت میں معبود اور محبّت میں معشوق کا رنگ آجاتا ہے۔ اور یہ رنگ کیا تھا ایک دَرد تھا نبی کریمؐ کو۔ اُمتی اُمتی

غوثِ پاکؒ نے فرمایا صَمَدْ کو راضی کرنے کا طریقہ ہے کہ ٹوٹا ہوا دل لائو۔ خواجہ اجمیریؒ نے فرمایا کہ اس کے محبوبؐ' اس کے معشوق کو اپنائو' صَمَدْ خود نیاز مند ہو جاتا ہے۔ بابا قادرؒ نے فرمایا محبوبؐ کی اُمّت کو اپنائو' ایک بھوکا پیٹ ہی بھر دو نیازِ بے نیاز ہو جائے گی۔ جب تک تم انفرادیت میں ہو وہ فرد میں ملے گا۔ اُمّت کی چادر اوڑھ لو۔ وہ ہر رُوپ میں ملے گا۔

قادریہ میں ایک ٹوٹا ہوا دِل ہوتا ہے۔ چشتیہ میں ایک دل ہزاروں دل بن کر ٹوٹے ہوئے ہوتے ہیں۔ ایسوں کے ساتھ مل کر دُعا مانگی جائے قبول ہو جاتی ہے۔

دُعا کیا ہے۔ دِل خوش کرنا۔ کسی کا دل خوش کر دیا' دُعا ہو گئی۔ اہل خلوص کا دل سے چاہنا' کُن فیکون کی طاقت رکھتا ہے۔

غوث پاکؒ نے کہا دُعا حکم ہوتا ہے۔ ادباً اسے دُعا کہتے ہیں۔ حکم دل کی چاہ کے سوا کچھ نہیں۔ کس کا حکم ہوتا ہے۔ یہ پتا نہیں چلتا۔ رَب کے نائب بنے ہوئے ڈھونڈتے پھرتے ہیں کہ میری رضا تیری رضا کونسی ہے۔ یہ مستی کی شِدّت ہے۔ خود آگہی کی کیفیت ہے۔ حکم جو ہے اس میں خود ہونا پڑتا ہے۔ میری رضا' تیری رضا کی دُوئی مٹی ہوئی ہوتی ہے۔ یوں رضا اور قضا کے درمیان رہا تو بڑی مشکل میں پڑ جاتا ہے۔ اور اگر نبی کریمؐ سے محبت کا ڈورا ہے اور یہ رابطہ اُدھر سے ملا ہوا ہے تو پھر یہ بھی حرکت میں آجاتا ہے' اُمتّی اُمتّی کہہ اُٹھتا ہے۔

جو ہچکچا کے رَہ گیا وہ رہ گیا اِدھر

جس نے لگائی ایڑھ وہ خندق کے پار ہے

اسلام کو بچانے کا ذمہ آپ کے ہاتھ ہے اگرچہ اللہ تعالیٰ نے اصول کی حفاظت کرنے کا ذمہ لیا ہے مگر عمل بغیر آپ کے ہاتھوں نہیں۔ ہر سطح پر مرضیءِ الٰہی بندوں کے ذریعہ ہی پوری ہوتی ہے۔ اس رضا اور قضا کی درمیانی حالت برزخ ہے۔ اس برزخ کی حالت میں اَدْعُونِی اَسْتَجِبْ لَکُمْ صادق آتا ہے۔ اس حالت میں دُعا کرنے کے لئے ایسی جگہ جائے جہاں سے آواز بازگشت آئے۔ جیسے بزرگانِ دین یا مزارات۔ قران شریف میں بھی آوازِ بازگشت ہوتا ہے' ان لوگوں کے لئے جن کے دِل روشن ہوتے ہیں۔ معراج شریف بھی آوازِ بازگشت تھی۔ حقیقت تو ایک ہی ہے۔ یہ اَدْعُونِی وہی کر رہا ہوتا ہے۔ یہ صدا تو باطن سے نکل رہی ہوتی ہے۔ پاک اور قدوس وہی ہے' بندہ کی کیا مجال۔ آئینہ صاف ہو تو بازگشت ہوتی ہے۔

عمل کا میدان

رحمت تمام صفاتِ الٰہی کا جواب ہے' احاطہ کئے ہے ہر چیز کو۔ ایک ہاتھ تمہارا ایک اللہ کا' تب کام بنتا ہے۔ اپنی رُوح پھونکی ہے اس لئے تعلق روح اعظم سے ہے۔ رُوح کا میدان اَمر کا میدان ہے۔ رُوحِ اعظم کی آگہی سے پھیلتا جاتا ہے' جیسے مَوج۔ پھر اپنے کو سمندر دیکھتا ہے۔ عمل کا میدان کھل جاتا ہے۔ دنیا کو اس کی نظر سے دیکھ رہا ہوتا ہے۔ یہ سوال کہ بُرے کیوں پھل پھُول رہے ہیں اور اچھے خرابی میں پھنسے ہیں' کبھی کا ختم ہو چکا ہوتا۔ اس کی نگاہ تو اب یَنْظُرُ بِنُوْرِ اللہ ہے۔ یہ وہ نگاہ ہے جس سے تقدیر بدلتی ہے۔ ایسے نے قائم کرو کا انداز اپنا لیا ہوتا ہے' کہ اپنے کو جو دسے نکال کر' اوپر کی سطحوں میں قائم کر لیا ہوتا ہے۔ خواہشاتِ جسم و تن کو ختم کر کے اپنے کو لطافتوں میں بسا لیا ہوتا ہے۔ یعنی مجردات ذات میں' عین توحید میں۔ اب وہ قُمْ بِاِذْنِ اللہ اُٹھ جائو اللہ کے نام سے' کہنے میں دُوئی دیکھتا ہے۔ اس کے لئے قُمْ بِاِذْنِیْ اُٹھ جا میرے حکم 'سے' عین توحید کی بات ہے۔ کیونکہ جب یقین نہیں ہوتا کہ مُردہ زندہ ہو جائے گا تب ہی تو دُعا کرے گا' اللہ کے نام کا واسطہ لائے گا۔ وہ اس عین الیقینی حالت میں ہوتا ہے کہ زندہ ہو گا اور ضرور ہو گا' شک کی گنجائش نہیں فنا فی الذّات کے لئے۔ ایسی توحید میں جو چاہا وہی ہوتا ہے۔ اس سطح کی دُعا یہی ہے۔ ایسے کی دُعا کیا ہے' حکم رَبی ہے۔ ایسے کی دُعا اللہ کا ہاتھ بٹانا ہوتا ہے۔ وہ حالات سے متاثر ہو کر' اس کی بہتری اپنی سمجھ کے لحاظ سے سمجھ کر رہا ہوتا ہے اور ایسی توحید میں کہ اللہ ہی تو چاہ رہا ہوتا ہے۔

ایسی ہستی اگر پردہ بھی کر جائے تو اور زیادہ لطافت میں ہوتی ہے۔ اسی لئے ان کی وساطت سے دُعا جلدی قبول ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ اگر خود کوئی پردہ کر جائے اور عالم برزخ میں مصیبت میں پھنسا ہو تو ایسا ہی وسیلہ یاد آجاتا ہے اور اس مصیبت سے چھوٹ جاتا ہے۔ ایسے کے ذریعہ سے بخشش ہو جاتی ہے۔ بخشش کے معنی گناہ اپنے اوپر لینا نہیں ہے' بلکہ جیسے کہ بچے کو ماں نظر آجاتی ہے تو تشفی ہو جاتی ہے۔

مگر وجود میں رہتے ہوئے کسی آمر کی بڑی ذمہ داری ہوتی ہے۔ ایک تو اُمتی ہوئے اور دوسرے رحمتؐ للعالمینی نسبت' اس لئے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ رہتا کیسا۔ مرضیءِ الٰہی پر شاکر رہنے کا بہانہ کیا۔ دنیا دارُالعمل ہے۔ فرائض میں کوتاہی کیسی۔ مخلوق کو ان کے حال پر چھوڑا تو خدا کو چھوڑا۔ اس لئے رحمتؐ للعالمینی نسبت کے بھروسے اور ایمان کی شِدّت میں' ایک عاشق عارف' اذان اور اقامت کی درمیانی برزخ میں ہو کر صف بندی سے پہلے اُمّت کے لئے دُعا کر رہا ہوتا ہے۔ جب بھی اس کے قلب و رُوح میں عشق کے شعلے یا اور کسی شدّت سے کوئی طلب یا آرزُو اٹھتی ہے اور اس نکتہ سے جو بھی لہر یا جنبش پیدا ہوتی ہے اس کا اِرتعاش کائنات میں ہوتا ہے۔ یہ ہے کُن کا مقام' یہ ایسا ہے جیسا کہ ساکن' سمندر۔ بحر حقیقت میں کنکری ڈال دی تو پورے سمندر میں اس کا اِرتعاش ہوا۔

غور سے دیکھا جائے تو یہ اسی وقت ہو سکتا ہے جب تجرید حق اسی فرد کے باطن سے باہر نکل رہی ہو۔ اس سمندر کا تعلق چونکہ وجودِ کُل سے ہے اس لئے اس کو دہر کا سمندر کہنا ہو گا۔ جب اس فرد کو کل کی آگہی آجاتی ہے تو سوچنے پر خیال تو آتا ہے کہ کس کی آگہی آئی۔ لے دے کہ اپنی انفرادیت پر نکتہ جمتا ہے۔ مگر کُل کُل ہے۔ اس لئے اس کیفیت میں ہوتے ہوئے یہ باتیں کہ یہ جسم ہے' یہ جان ہے' یہ زمان ہے' یہ مکان ہے' سمجھ میں نہیں آتیں یا اس بات کو یوں سمجھو کہ جہاں کنکری پڑی اس جگہ کو 'اَنَا' کہہ لو' اب دُعا وہی مرکز قبول کرتا ہے۔ اَنا' کنکری کیا ہے' ب کا نکتہ 'نکتہءِ وجودِ حق' جس میں نہ خواہشات ہیں' نہ تکالیف' نہ خوشیاں۔ اسی حالت میں کہیں' یہ وہ نکتہ بن سکتا ہے جو اِرتعاش کرنے کا سبب بنتا ہے۔ اس طرح مرکز 'انا' اور نکتہءِ ب کا ارتعاش ایک ہوا۔ حضرت ابن عربیؒ نے فرمایا کہ وہ جو اللہ نے کُن کہا۔ وہ اپنے سے کہا۔ عشق کے طفیل جب یہ دیکھے اور پالے تو رحمت کا مفہوم ملے۔ اپنی 'انا' کا کُن ہی تفریدی انداز سے تجریدی رحمت کا سبب ہوتا ہے۔ اسی سطح سے اُمّت کے لئے دُعا ہوتی ہے۔ رحمت ایک عالمی چیز ہے جسے نورِ محمدیؐ کہہ لیں' یا حُسن کی تجرید۔ اور اس کی تفرید اس وقت عالمِ اسلام میں جو وجود میں ہیں' ان میں سے کسی میں ہونی چاہیے۔ کیونکہ اَمر' ان سے ہی صحیح جاری ہوتا ہے جو وجود میں ہیں۔

دُعا کا طریقہ ابتدائے تخلیق سے لے کر غالباً حضرت موسیٰؑ کے زمانہ تک یہ رہا کہ بیل ذبح کر کے پہاڑی پر چھوڑ دیتے۔ اگر آسمانی آگ اُتر کر قربانی کو کھا لیتی تو نیاز قبول ہو جاتی۔ حضرت موسیٰؑ کے زمانہ میں یہ صورت ہو گئی کہ معبد میں گائے یا بیل کی قربانی کر دی جاتی۔ رفتہ رفتہ دُعا کرنے کے مختلف طریقے ایک جیسی نشانی کی شکل اختیار کر گئے۔ دُعا میں ہاتھ اُٹھانا ہر قوم' ہر مذہب میں رائج ہوا۔ اس دُعا میں ہاتھ اُٹھانے کے پیچھے کوئی ذہنی' قلبی' رُوحانی طلب ہی ہوتی ہے جو اندر چھپی ہوتی ہے۔ اور شائد ہاتھ اُٹھانے والے کو بھی اس کا یہ شعور نہیں ہوتا۔ آخر ہاتھ اُٹھانے میں ایک تسکین سی کیوں مل جاتی ہے۔

مثال کے طور پر جزامی کو لیں۔ اس میں ہاتھ ملانے کا ایک شدّت سے جذبہ ہوتا ہے۔ وہ ہاتھ ملانے کی کوشش کرتا ہے۔ اور لوگ بھاگتے ہیں۔ یہ کتنی معنی خیز بات ہے۔ آخر جزامی کا تحت الشعور اسے ایسا کرنے پر کیوں مجبور کرتا ہے۔ اس ہیجانی جذباتی رجحان کے پاس پردہ، وہی ذہنی، قلبی، روحانی، گہرائیوں کی طلب کارفرما معلوم ہوتی ہے۔ اندازاً یہ تین باتوں کے تحت ہے، یا تو جیسے ڈوبتے کو تنکے کا سہارا، یا پھر رُوح کا یار سے ملاقات کا شوق، یا شکریہ شانِ وجود۔ اسی طرح دُعا میں، بے ساختگی میں، آسمان کی طرف ہاتھ اُٹھ جانا بھی ایک فریاد کا انداز ہے، سہارا مل جانے کی تمنا ہے، یا رُوح کی یار سے قربت کی تڑپ ہے۔ اپنے ہی دونوں ہاتھ صلوٰۃ میں، ساتھ ساتھ، من و ساقی بہم سازیم کی نشانی۔ گویا یار کا ہاتھ بٹانا ہے، ہاتھ تو آگے بڑھا دیتے ہیں ایک اپنا ایک یار کا۔ عجب بے ساختگی کی یکتائی ہے۔ ایسی یکتائی جس میں ساقی کا بھی جسم وجودی نشانی میں آنا تھا۔ ساقی جو غیب میں ہے۔ اس کا بھی ہاتھ آنا تھا۔ یہ ایسی اکائی ہے کہ نہ اپنے ہاتھ کی خبر ہے نہ تیرے کی۔ دونوں ہی اپنے، دونوں ہی تیرے۔

یا پھر دُعا میں ہاتھ کچھ اس کیفیت میں اُٹھائے جیسے رحمت کے لئے کچھ احساس ہو۔ اعلیٰ اقدار کی طرف قدم ہو، تو بس ہاتھ آگے بڑھنے لگتے ہیں۔ مظلوم انسانیت کے لئے ایک سہارا بن جانے کا انداز ہے۔ شکریہ شانِ وجود اس رنگ میں ہے کہ قدوسیت عالم امکان میں نشر کی جا رہی ہے۔ ۔ایک ایریل کی طرح اُنگلیاں عالم امکان پر پھیلی ہوئی ہیں۔ انوارِ تجلیات، رحمانی، رحیمی، رحمتً لِلعالمینی نشر ہو رہے ہیں۔ بے اختیار عمل کی نشانی میں دونوں ہاتھ اُٹھے ہوئے ہیں۔ سیدھا ہاتھ دین، بایاں دُنیا۔ دین و دُنیا کو توازن میں کئے رجوع الی اللہ۔ میدانِ عمل کائنات میں کُھلا ہوا۔ پھیلا ہوا، زمین سے آسمان تک۔

ان ہاتھوں کے پیچھے، قلب، کی ہیجانی، جذباتی کیفیات ہیں۔ رُوح امرِ رَبی کی تڑپ ہے، مرضیء الٰہی سے ہم آہنگی ہے۔ گویا سب وجود کو ایک توحیدی رُخ ملا ہے۔ اِنّیْ وَجَّھْتُ کا انداز ہے۔ آمنا سامنا، حضوری، مگر بے حجابی کی گستاخی کی مجال کہاں۔ دونوں ہاتھوں سے، آنکھوں کو ادب سے ڈھانکے۔ دُعا بھی ہو گئی اور حضوری بھی نصیب ہوئی۔

من مورا بھیا تن پیتم کا

اب شغل میں نور کپور بھیو

اس انداز کی دُعا مقبولیت لئے ہوتی ہے۔ اس کے ذریعہ بند راستے کھلتے ہیں، قسمت کی آئینہ داری اور رُونمائی ہوتی ہے۔ دُعا سے نظامِ کائنات میں فرق نہیں پڑتا۔ جیسے کمپیوٹر میں اگر کوئی غلطی ہو جاتی ہے تو اس کو خود درُست کر لیتا ہے۔ اسی طرح کائنات کی مقرر سرکٹ میں ہم دوسری جو اس پر عائد کرتے ہیں، تو خود بخود درستگی اور توازن ہو جاتا ہے اور نظام میں فرق نہیں پڑتا۔ ایسی دُعا تو عین رحمت ہوتی ہے۔ رحمت کے سمندر میں ارتعاش لانے کا ذریعہ بنتی ہے۔ جیسے ابر رحمت منڈلا رہے ہوتے ہیں مگر جب تک دُعا کے ذریعہ ان کا سینہ شق نہیں ہوتا، بارش نہیں ہوتی۔ خواہ یہ دُعا تپتی زمین،

یا درختوں کے جھنڈ' یا کسی کے سینے سے نکلی ہو۔ یہ بھی حسن ازلی' رحمت تمامی' کی شانِ حیاء اور خود پردہ میں رہ کر ایک واسطے' ایک رابطے کو ذریعہء رحمت بناتے ہیں۔

؎ خود بھیک دیں اور کہیں منگتے کا بھلا ہو۔ بات یہ بھی تو ہے کہ تجریدی

رنگ لیے اس پیکر وجود کے غیب میں بھی خود وہی تو ہیں اور کوئی دُوئی بھی نہیں۔ فِیْ اَنْفُسِکُمْ کا نقشہ جما ہے۔ اسی لئے فرمایا۔ اپنے اندر دیکھو' ہم شہِ رگ کے قریب ہیں۔

فقیروں کا کہنا ہے کہ عَرَفَ نَفْسَہٗ کے معنی جان کی سیر کے ہیں۔ شروع میں عَرَفَ نَفْسَہٗ اپنا جائزہ لینے تک کی بات ہوتی ہے۔ کہ یہ برائیاں ہیں' یہ خوبیاں ہیں۔ مگر یہ جائزہ تو آپ کی برائیوں یا خوبیوں کا ہوا' ذات کا تو نہ ہوا عَرَفَ نَفْسَہٗ تو اس وقت ہوا جب جان کی سیر کی' ذات تک پہنچے۔ عشق چور دروازہ ہے' ذات کا۔ فقراء میں بھی سرنگ کا تصور ہے۔ جیسے پاک پتن' سہون شریف' منگھو پیر ہوتے ہوئے لاھُوتِ لامکان کی سیر کر آتے ہیں۔ ان ظاہری نشانیوں کے پس پردہ ان ہی چور دروازوں کی بات ہے جن سے ذات تک پہنچنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ حضرت عزیز مکیؒ کی بابت مشہور ہے کہ صحابہ میں سے ہیں۔ کئی جگہ ظہور فرما چکے ہیں۔ پھر کئی سو سال بعد کسی اور مقام سے ظہور کر لیتے ہیں۔ آخری بار پاکپتن شریف میں آرام فرما ہیں۔ جہاں مزار ہے تو یہ بھی کچھ سرنگ کی ہی بات ہے۔ رحمتً لِّلعالمین تک رسائی کی بات ہے۔

کائناتِ باطن اور چور دروازے

یوں سائنسدان کہتے ہیں کہ ہماری کائنات کے علاوہ ایک بالائی کائنات بھی ہے۔ اپنی کائنات میں ایسے فاصلوں سے سابقہ ہے جو روشنی کے سالوں میں ہی شمار کئے جاسکتے ہیں۔ بے حد و بے پایاں فاصلے۔ لیکن اپنی کائنات سے بالائی کائنات میں روشنی کی رفتار سے تیز رفتار پر سفر کر کے فاصلوں کا شمار ختم ہو جاتا ہے۔ ہماری کائنات اور بالائی کائنات کے درمیان سوراخ ہیں۔ روشنی کی حد فاصل توڑ کر اس سوراخ میں داخل ہوئے تو اس بالائی کائنات سے آن واحد میں گذر کر اپنی کائنات کے دوسرے حصے میں آنِ واحد میں پہنچ سکیں گے۔ یوں یہ سفر دس روشنی کے

سطح مل جاتی ہے' جس کی حدیں معمولی نہیں ہوتی۔ اسی جمعی انداز میں دیوارِ چین بھی بنائی گئی' تاج محل بھی' بابل کے ستون بھی اور مصر کے احرام بھی۔ اسی جمعی زندگی میں زمینوں کی آبادی بھی ہوئی' شہر بھی اُبھرے' فلک بوس عمارتیں بھی بنیں' راکٹ اور مصنوعی سیارے ایجاد ہوئے' چاند کا سفر بھی ہوا۔

مسلمان کو توحید ملت کا بھی سبق دیا گیا تھا۔ وہ زندگی کے اس جمعی پہلو کو چھوڑ کر ضلالت اور خواری کی راہ میں پڑ گئے' حالانکہ یہ قوم تو صاحب امر تھی۔ اب صاحب امر کا تصور ہی اس کے لئے خواب و خیال بن کر رہ گیا ہے۔ مسلمان نے وہ عشق کی منزل بھی چھوڑ دی جس میں ایک فرد کی سطح تک بھی' ایک جذبہ عشق والا' ایسے ایسے کام کر جاتا ہے کہ عقل حیران رہ جاتی ہے۔ عشق وہ جذبہ ہے جس میں شدّتِ عمل آتی ہے۔ اور جتنی رکاوٹیں ہوں' اتنی ہی شدّت اپنے اندر آتی ہے۔ عاشق کا سب کچھ محبوب کے لئے ہوتا ہے۔ اس کا جذبہء عشق عالم بن کر پھیلتا ہے۔ لہٰذا عاشق کی دعا فدا ہو

جانے کا جذبہ ہے' سر قربان کر دینے کا۔ اسی لئے شدّت کی بھی انتہا ہے۔ مسلمان کو یہی عشق رسولؐ سکھایا گیا تھا' جس کے تحت اس نے فدا ہو جان لیا تھا' اور دنیا سے اس کا سیلاب تھمتا نہ تھا۔ وجہ یہ ہے کہ عاشق خود سراپا دُعا بن چکا ہوتا ہے۔ اس عشق کی منزل تو خود ذاتِ باری سے یکتائی میں ہے۔ اس کے ہاتھوں جو نہ ہو وہ بھی ہوتا ہے۔ اور کچھ اس انداز یکتائی میں کہ اپنی خواہش کو اس میں دخل نہیں ہوتا۔ مرضیءِ الٰہی سے سازگار ہو کر مرضیءِ الٰہی کے نشر کا یہی ذریعہ بنا ہوتا ہے۔ نور علیٰ نور بنا' یہ خود دُعا قبول کرنے کی منزل میں ہوتا ہے۔ اس نور کو دیکھنا ہو تو اس کی آنکھوں میں جھانکو۔ ان میں سے کون جھانک رہا ہوتا ہے' اس کا محبوبؐ۔ اس کے زور بازو' اسکے یدِ الٰہی کو دیکھو' کون اس کے اندر سے عمل پذیر ہو رہا ہوتا ہے۔ اس کے قلب کو دیکھو' کون اس میں بسا ہوتا ہے۔ کس کی بادشاہت ہوتی ہے۔ اس کی رُوح کو دیکھو' کس کا امر بنی ہوتی ہے' کس کا حکم چل رہا ہوتا ہے۔ لِمَن۔ اَلْمُلْکُ اَلْیَوم (آج کے دن کس کی بادشاہت ہے) کا یہی مصداق ہوتا

ہے۔ پھر بھی ہر عاشق عاجز ہوتا ہے۔ ایک ٹوٹا ہوا دل بھی عاجز ہوتا ہے۔ عجز کے معنی مٹانا' صفر کرنا ہے۔ عاجز کے قلب و رُوح سے بھی جو دُعا کی لہریں اُٹھ رہی ہوتی ہیں وہ توانائیاں بن کر عالم میں پھیلتی ہیں اور دوسرے قلوب پر بجلی گرا کر ذریعہءِ رحمت بنتی ہیں۔

عاجزی' انتہائے عبُودیّت

عاجزی کو انتہائے عبُودیّت کہا گیا ہے۔ جب اپنی ساری قدرتوں اپنے سارے بھروسے ٹوٹنے کے بعد' یہاں تک کہ دل ٹوٹنے کے بعد' جب ایک لگاؤ ہی رہ گیا تھا' وہ بھی ٹوٹ جائے تب لَا اِلٰہَ ہوا۔ سب طرف سے ٹوٹ پھوٹ کر اپنے میں سمٹ آیا۔ نہ سہارے کی طلب رہی نہ تمنا۔ تو رحمت حق خود جوش میں آتی ہے۔ اپنے باطن میں حَیُّ وقَیُّوم ہی رہ جاتا ہے۔ اسی لئے کہتے ہیں کہ عاجز ہو جانا معمولی بات نہیں۔ یہ انسان کے وجود کے ستر ہزار پردے' یہ بھروسوں' سہاروں' عقل کی ترکیبوں کے ستر ہزار بُت جب ٹوٹیں' تب بھی اپنی "مَیں' اپنی 'انا' کا ٹوٹنا مشکل ہے۔ جب یہ اپنی جھوٹی اَنا بھی ٹوٹ گئی تب کہیں حق کی اَنا جو اپنا باطن در باطن ہے رُونما ہوئی۔ یہ اپنے جسم و جان کی جھوٹی قوت' یہ ذہن رسا' یہ عقل و دانشوری کا گھمنڈ' جو ٹوٹے تب عاجز ہو کر اپنے مالک حقیقی کی سمت لوٹتا ہے۔ جب اپنے اندر سمٹے' اس کی عاجزی میں سوائے اس کے عجز کے اور کوئی ساتھی نہ رہے' سب کچھ فنا ہو جائے ۔تب کہیں بقا نصیب ہو اور اپنی بقا تک رسائی ہو' راضی بہ رضائے الٰہی ہو کر شاکر و صابر کا مقام پائے۔

یا ایسا بھی ہوتا ہے کہ کسی ستم رسیدہ عاجز کی پکار اپنے ہی اندر کی ان باطنی توانائیوں کو مُرتعش کر گئی جو رحمت بن کر اس عاجز کے لئے رحمت کی بارش کا سبب بن جاتی ہیں۔ جیسے اپنے اندر سے بخارات آبی اُٹھے' اور بادل بن کر اپنے ہی گِرد برس گئے اور بجلی وہاں جا گری جہاں ظلم و عدوان تھا' یعنی جیسے ظالم۔ اسی رُوپ کی بجلی قہر الٰہی بن کر ان پر جا گری۔ کہیں ایک لشکر جرار ان کے مقابل لا کھڑا کیا' کہیں قحط و وبا کی ابتلاء میں ڈال دیا' کہیں کرکٹ اور بجلی اور زلزلے سے ان کی تباہی ہوئی اور کہیں ابرہہ کے ہاتھیوں پر ابابیل کا لشکر چڑھ آیا کہ ہاتھیوں اور فوج کو دُھنکی ہوئی رُوئی کی طرح کر ڈالا۔

یہ سب توانائیاں انسانوں کے باطن وجود میں تھیں۔ شدّتِ جذبات یا شدّتِ عاجزی میں ایک توحیدی اندازِ فکر جمعیت میں آیا۔ خانہ کعبہ کی تقدیس، خانہ کعبہ والے خُدا کی تقدیس اور کعبہ کے محافظوں کی تقدیس، ایک ہی وحدت میں آئی۔ ایمان نے شدت پکڑی کہ کعبہ مٹ نہیں سکتا۔ اپنے اندر کے جذبات اور عاجزی نے ایک ہی اندازِ شدّت لیا۔ ان توانائیوں کے اظہار کی مادی صورت بھی لازماً آنی تھی کیوں کہ مادی وجودوں، لشکر ابرہہ پر اس کا اطلاق ہونا تھا۔ ابابیلوں کا لشکر وجود میں آیا۔ چونکہ انسان وجود میں ہے اس لئے اس کی اپنی توانائیوں کو بھی کوئی جسمانی روپ ملنا تھا۔ ان ہی پوشیدہ توانائیوں کے روپ فرشتے، شہدا اور اجنّاہیں، جن کے ذریعہ لشکر اسلام کو یہ امدادِ غیبی ملتی رہی۔ یہ غیبی امدادیں اپنے ہی اندر سے نکلتی ہیں۔ قوم میں اپنے جوشِ ایمان سے مثبت انداز آیا جو اللہ کے نام پر لڑنے میں آنا چاہیے تھا تو اس جذبہء خود اعتمادی، جذبہء ایثار میں یہ اپنی باطنی توانائیاں، یہ لطافتیں، یہ مجردات ایک وجودی شکل ضرور لیتے ہیں۔ چونکہ ان توانائیوں کا ہم سے تعلق تھا اس لئے ہمارے ذریعہ یہ شانِ عساکرِ اسلام کفار پر رُعب بن کر چھائی۔ کفاروں کو مسلمانوں کی جماعت کا یہ عزم، یہ حوصلہ، یہ ایمان، ایک مادی ثبوت کے طور پر ایک جم غفیر کی صورت میں نظر آیا۔

مرضیءالٰہی کا انشراح

یہی بات ذاتِ الٰہی کی ہے کہ اپنے اندر ذات سے نسبت ہو جائے، تو الٰہی صفات کا اظہار وجودی پیرائے میں ہمارے وجودوں سے ہونا لابدی سا اَمر ہے۔ مرضیٔ الٰہی کے انشراح کے لئے یہی وجودی پہلو ایک ذریعہ بن جاتا ہے۔ تاکہ مادی اور اجسامی دنیا میں جسم کی شکل میں ہی انوارِ الٰہی کی تابانی ہو۔ اور کوئی دُوری یا دُوئی خالق اور مخلوق میں نہ رہے۔ توحید تخلیق کا کچھ یہی انداز ہے کہ نفس، قلب، رُوح، مادّہ، جسم، توانائیاں، مجردات، لطافتیں، سب ایک ہی وحدت میں ہوتے ہیں۔ اور ان سب کی اکائی میں وحدت کا اظہار ہوتا ہے۔ اس وحدت کو پانے کے لئے یہ جاننا ہے کہ ہم صفاتِ الٰہی میں اُلجھے رہے تو ذات سے فصل ہوتا جائے گا۔ جب ذات جز و بدن ہو جائے تب کہیں غیریت ختم ہوتی ہے۔ اسلئے جب تک دُوئی کا تخیل رہے گا نہ قلب مطمئنہ حاصل ہو گا، نہ فصل دُور ہو گا۔ یوں چاہے اکائی اور اللہ ایک یا توحید کا جتنا سوچو یا زبان سے کہتے رہو بات نہ بنے گی۔ پھر جب وحدت الوجود میں آ گئے تو اپنے لئے دُعا کی کیا ضرورت باقی رہتی ہے۔ اس حالت میں ہاتھ اُٹھانا بھی غیریت بن جاتا ہے۔ گو عجز کے اظہار کا اس ہاتھ اٹھانے سے بہتر کوئی دوسرا ذریعہ بھی نہیں ہے۔ کیسا پیارا تعلق ہے کہ دُعا کے ذریعہ ہماری عزتِ نفس برقرار رکھی گئی ہے۔ وگرنہ ہوتا وہی ہے جو اس کی مرضی۔ اس لئے کہا ہے۔

گر تُجھ کو ہے یقین اِجابت، دُعا نہ مانگ

یعنی بغیر اِک دِلِ بے مُدعّا نہ مانگ

شاکر و صابر کی دُعا

اب تم اگر شاکر اور صابر ہو تو دُعا یا طلب منہ سے یا دل سے بھی کہنا ناشکری ہے۔ جو ہے اس کا شکر کرو تو رحمت کے دروازے کھل جاتے ہیں۔ اِرشاد ہے جو شکر کرتے ہیں ان کو زیادہ دیتا ہوں۔ یہ شکر کر کے دیکھو عجب نسخہ ہے۔ پتہ نہیں بزرگوں نے کیوں نہیں بتایا۔ مگر ہے یہ ایک مرد کا

کام۔ کہ کسی حالت میں ہاتھ نہ اُٹھے اپنے لئے۔ اِرشادِ باری تعالیٰ ہے "جب مَیں انسان پر اِنعام کرتا ہوں تو وہ کروٹ بدل لیتا اور جب اسے پکڑ لیتا ہوں تو لمبی لمبی دُعائیں کرتا ہے۔"

یہ لمبے لمبے ہاتھ اُٹھانا بھی فطری جذبہ ہے۔ ارتقاء انسانی میں ذہن کی ترقی میں ہاتھ کے اِستعمال سے ہی ذہن بڑھا۔ اور طبی اعتبار سے خاص اعتبار سے خاص رگوں کا خاتمہ اُنگلیوں میں ہے۔ اسی لئے ہاتھ سے کام کر کے اِرتقائے انسانی ہوا ہے۔ قوتِ حس' اتنی لطیف چیز ہے کہ اندھے تک اُنگلیوں کے ذریعہ سے رنگ پہچان لیتے ہیں۔ دیکھا جائے تو زندگی کے اجراء میں انسان ہاتھوں ہی کا ممنون ہے اور نفسیاتی لحاظ سے اسی ممنونیت میں ہاتھ دُعا کے لئے اُٹھتے ہیں۔ یا کسی تکلیف میں اور بے قراری میں ہاتھ آسمان کی طرف اُٹھتے ہیں تو نفسیاتی لحاظ سے یہ بھی صحت کی ممنونیت میں ہوتا ہے۔ اور جو صبر کرتے ہیں' مرضی پر شاکر رہتے ہیں' وہ اپنے ایمان کا ثبوت دیتے ہیں' اپنے ممنون ہونے کی تصدیق کرتے ہیں۔ صبر کے یہ معنی نہیں کہ تکلیف کا شعور ہو اور صبر کرے۔ یہ تو مجبوری کا نام صبر ہوا۔ لیکن جب ایسی حالت ہو کہ تکلیف ہو اور شعور بھی نہ ہو تب ہے صابر۔ تب ہے صحیح معنوں میں ممنون' دُعا کی عملی صورت یہی ممنون ہونا ہے۔ اپنی تکلیف میں' اپنی حاجت سے ماوراء ہو جائے' صرف محبوبؐ رہ جائے تب کہیں دُعا ہے۔ جیسے قصیدہ بردہ شریف یا نعت امام زین العابدینؒ۔ کیونکہ ایسی حالت میں دُعا صرف درود شریف اور نعت رسولؐ ہے۔ یہ ہی منتہا ہے' انفرادی دُعا کی۔ نہ اس کے آگے کچھ' نہ پیچھے' ایک صابر کے لئے۔

جس نعت پر مہر لگ گئی وہ ہے بَلَغَ العلیٰ۔ یہ ایک برزخ ہے اور رابطہ ہے صفات اور ذات کے درمیان' درودِ تاج تقریباً سورۃ رحمن جیسا ہے اور اسم ذات جو ہے اسی میں درُود شریف ہے' وحدت میں نورِ محمدیؐ کی تجلی میں۔ یوں جو صفات میں اُلجھے رہیں ان کے لئے الفاظ ہیں نعت کے اور جنہوں نے مشکیں زلفوں میں سر چھپا لیا ان میں سے یٰسین کی خوشبو مہک اُٹھتی ہے۔ ان کے لئے نہ کہنا ہے نہ سننا ہے با آواز پڑھیں یا خاموشی سے پڑھیں' اپنے آپ کو ہی سناتے ہیں کیونکہ ظاہر پر فرض ہے کہ باطن کا اَدب کرے۔ اور ظاہر و باطن کی کوئی دُوئی بھی نہیں۔

جمعی دُعا کا انداز

اِسلام کا اِحسان ہے کہ جمعی انداز میں دُعا کرنے کا طریقہ بتایا' تاکہ اس انفرادیت کے شرک سے بچیں کہ ہم ہیں۔ اپنے ظاہری وجود کو ایک علیحدہ چیز جان کر' خود کو بحرِ حقیقت سے جُدا سمجھ کر شرک کرتے رہتے ہیں۔ پھر شاکی ہوتے ہیں کہ دُعا قبول نہیں ہو رہی۔ ارشادِ باری ہے کافر کی دُعا سوائے ضلالت اور گمراہی کے کچھ نہیں' اس دُوئی میں ہم وحدت سے اور دُور ہوتے چلے جاتے ہیں۔ مگر جب ہم اپنی انفرادیت کو جمعیت میں گم کر کے اجتماعی حیثیت' عالمی حیثیت میں آجاتے ہیں تو ہمارے لئے مکان زمان ایک ہی توحید ذاتی میں ہو جاتے ہیں۔ اب ایسی جمات کی دُعا' جمعی انداز میں وحدت سے ہم آہنگ ہوتی ہے۔ اور اس کی توانائیوں کی قوت کے اثرات کو تائید غیبی کہا جا سکتا ہے۔ ایسی دُعا بنیادِ وجود سے ہم آہنگ ہوتی ہے اور عین فطرت سے ساز گار ہوتی ہے۔ یہ اثرات جمعیّت کے اندر ہی اثر پذیر ہوتے ہیں وگرنہ ہماری امداد کو نہ آسمان سے فرشتے اُترتے ہیں نہ قبروں سے شہداء اٹھتے ہیں۔ یہ زندہ حقیقتیں ہمارے اپنے وجود کے اندر ہی ہوتی ہیں۔ یہ اندر باہر کا لفظ بھی بے معنی ہے۔ یوں کہنا چاہیے کہ ان زندہ حقیقتوں اور ہماری اپنی حقیقت کے درمیان کوئی دُوئی نہیں ہوتی۔ کیونکہ ایک ہی بحرِ حقیقت کی موج ہم بھی ہیں۔ بحرِ حقیقت میں جمعی انداز میں تلاطم یا اِرتعاش لایا جا سکتا ہے'

جیسے ایک کنکری ساکن پانی میں لہریں بنانے کا ذریعہ بن جاتی ہے۔ اِحسان ہے کہ جمعی انداز میں اپنے نفس' اپنی ذاتی خواہشات کے حجابات حائل نہیں ہوتے۔ اپنی غرض' اپنے نفع نقصان' کے وسوسوں سے راہ کھوٹی نہیں ہوتی۔ اس لئے جمعی انداز میں 'مَیں' اور 'تو' کی دُوئی کا پردہ ہٹ کر' اپنے اندر والی غیبی طاقتوں کے اظہار کی صورت بن جاتی ہے۔ جمعیّت کی برکت یہ بھی ہے کہ جمعیت کے لئے جو بھی دُعا ہو گی وہ جذبہء ہمدردی' خلوص' اور اخوت کے رنگ میں ہو گی اس لئے باطن میں بھی مقبولیت سے زیادہ قریب ہو گی۔

اسی خلوص سے یا پھر جیسا ذکر ہو چکا عجز سے ہی بحر رحمت میں تلاطم لایا جاسکتا ہے۔ مخلص یا عاجز کی ہی اللہ سنتا ہے۔ خلوص یا عجز کے علاوہ کوئی دوسرا ذریعہ رحمت لانے کا نہیں ہو سکتا۔ یہ درود و وظائف پڑھنا پڑھانا صرف اسی صورت میں کچھ اثر کر سکتے ہیں جب خلوص یا عاجزی کا رنگ رکھتے ہوں۔ اور اپنے لئے کبھی خلوص یوں نہیں ہو سکتا کہ اس میں خود غرضی، خود طلبی لگی ہوتی ہے۔ خلوص صرف دوسرے کے لئے ہوتا ہے۔ احسان ہے کہ مسلمان کو جمعیت کی زندگی میں زندگی گذارنے کا سبق ملا ہے۔ نفس اور لطیفہء نفس کی سطح پر اجتماعی زندگی اور حقوق العباد ہیں۔ قلب کی سطح پر جذبہء عشق رسولؐ اسلام ہے جو پوشیدہ صلاحیتوں کو اُبھارتا ہے۔ اپنی توانائیوں کو شدّتِ عمل میں بروئے کار لاتا ہے اور رُوح کی سطح امر رَبی ہے جو اسے ملا ہے۔

اپنی توحید کو پا کر جب ذات کو سَمو کر' خدائی میں اپنے کو لپیٹا تو اس خدائی انعام و کرام کا دوسرا کوئی مقابلہ کر سکتا ہے۔ یہ کام آمرانِ حق کا ہے۔ جو اَنَا، دَھَرَ اَنَا اُمّتی کیفیت میں زندگی گذار رہے ہوتے ہیں۔ اُمّت کے پینل گلینڈ یہی ہیں۔ ان کے باطن وجود سے اٹھی ہوئی لہریں بحر حقیقت میں اِرتعاش لاتی ہیں۔ یہ کوئی اپنے سے باہر کی بات نہیں' نہ اپنے اختیار اور عقل کی بات ہے۔ عقل تو اس تمام گتھی کو سلجھانے سے عاجز ہے۔ یہ نور تو آمر کو وَدِیعت ہوا ہے۔ یہ اُمتّی رابطہ وسیلہ ہے' رحمت للعالمینی شان کا اظہار ہے۔ اسے خود رحمت عالم کے رنگ میں رنگ کر عالم انسانیت کا کام کرنا ہے۔ اس طرح کہ یہی خلیفۃ اللہ کا مقام ہے' یہی سلطان النصیر کا حامل ہے' اور اِلاّ بسُلطان کی صفت کا مظہر۔ اسی حقیقت کے بیان کی وہ بات تھی جو جنگ حنین کے موقع پر فرمایا کہ یہ مٹی تم نے نہیں پھینکی' ہم نے پھینکی ہے۔ گویا وجود اپنا' امر اس کا' انوار اس کے۔ وحدت الوجود میں یہ امر ساری سطحاتِ نفس' قلب' روح پر چل رہا ہے۔ یعنی جسمانی' ذہنی' اخلاقی' روحانی سطحوں پر اور ایک ہی اِکائی میں۔ اس وحدت الوجود کو بیان کرنا ممکن نہیں' ایک کیف ہی سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔

توحید کے اس انداز میں دُعا بھی اجتماعی اور عالمی حیثیت سے ہی' یعنی وحدتِ وجود میں ہی اثر پذیر ہو سکتی ہے۔ ایسی اِکائی ہے جس میں زمان مکان دونوں شامل ہیں اور یہ دُعا ایسے اثرات رکھے گی جسے جمعیت کے لئے امدادِ غیبی کہیں۔ اس دُعا کا وجودی اثر یہ ہو گا کہ اس امر کے تحت ذہن اور قلوب اثر پذیر ہو کر' یک رُخی اور توحید فکر میں آجاتے ہیں یعنی ایک ہوا سی چلتی ہے جو سب کو ایک ہی کیف میں لے آتی ہے۔ اس قسم کی دعا کے لئے نہ الفاظ کی ضرورت ہے' نہ درُود و وظائف کی۔ یہ تو قلوب مومنین ہی میں ایک روشنی سی ڈال دینے کی بات ہے۔ جیسے ایک چنگاری سی سب میں لگا دیتی ہے۔ پھر ان ہی میں سے انوار بھڑک اُٹھتے ہیں اور ان ہی سے یہ انوارِ عجب عجب اعمال کی صورت میں رونما ہوتے ہیں۔ پھر ان خواص کے ذریعہ وہ جمعیت ظہور میں آجاتی ہے' جس کے افراد کی مادی یا باطنی صلاحیتیں بروئے کار ہو کر مشیت کے دست و بازو بن جاتے ہیں۔ اس کی مادی مثال ایسی ہے

کہ جیسے آتش بازی کا انار ہو' اس کے اندر آتش گیر مادہ ہوتا ہے اور مختلف دھاتوں کے ذرّات کوٹ کوٹ کر بھر دیئے جاتے ہیں۔ یہی کچھ شفقت شیخ کا انداز ہے کہ چند قلوب منتخب کر کے عشق ملت ان میں بھر دیا جاتا ہے اور جب سب کچھ تیار ہوتا ہے تو ایک بتی لگانے کی ضرورت ہوتی ہے یہ بتی لگانے والا ہاتھ قطب عالم ہوتا ہے۔ آگ لگانے میں اس کے اپنے ارادے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ نور علیٰ نُور کی بات ہے۔ اسی لئے اچھے اچھے فقراء اولیاء بے بس ہوتے ہیں۔ کہتے ہیں یہ آرڈر غارِ حرا سے چلتے ہیں۔ یا پھر اس مرکز باطن سے کوئی لہر اُٹھ کر وہی کام کرتی ہے جو ایک کنکری ایک ساکن سمندر میں۔ یہ آگ لگانے والا ہاتھ اس وقت عمل پیرا ہوتا ہے جب کوئی نازک وقت خلقت یا اُمت محمدیہؐ پر آئے اور جیسے کہ انار میں چنگاری لگنے سے آتش گیر مادہ آگ پکڑ لیتا ہے اور مختلف دھاتوں سے رنگارنگ پھولوں کی چاروں طرف بارش ہونے لگتی ہے' اسی طرح جمعیت کے قلوب میں تَنَزَّلُ الْمَلَائِکَۃُ وَالرُّوحُ فِیْھَا جیسا انداز آنے لگتا ہے۔ یہ تنزیل ملائک اور روح اپنے ہی اندر کی باتیں ہیں بلکہ اندر باہر کی تفریق اس کیفیت توحید میں معنی ہے۔ اسے یوں بیان کیا جاسکتا ہے کہ بس ایک ہی اِکائی ہے' یا' ہے' کی واردات ہے۔ اب پچاس یا سو انار رکھ دیجئے تو ایک ہی پر پڑی ہوئی بتی اس انار کو آتش بار کرتی ہے۔

اور پھر اسی سے سارے انار آتش بار ہو کر جگمگا اُٹھتے ہیں۔ وہ ہوتے ہیں جو سدا سہاگن ہوں' بہار ہی بہار' ہلدی میں رنگے ہوئے۔ یہی لوگ اَنَاذھر کے کیف اور اَنَا اُمتّی کے مقام پر ہوتے ہیں۔ نہ ان کے ڈھونڈنے کی ضرورت ہے نہ تلاش کی' کیونکہ کسی کی ذاتی اغراض پورے ہونے کا ان کے ذریعہ امکان ہی نہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کے لئے غوثِ اعظمؒ نے فرمایا یا فقیر وہ نہیں جس کے پاس کچھ نہ ہو بلکہ یہ کہ کُن کہے تو ہو جائے۔۔ اس مقام کی دُعا لوح محفوظ کی تحریر سے علیحدہ کی بات ہے۔ جو آمر وقت ہوتا ہے۔ اس کے نسلی خون DNA 'جین میں کسی کی نظر یا تصرف سے تبدیلی آچکی ہوتی ہے۔ یہ اَنَا اُمتّی رنگ میں توحید حاصل کر چکا ہوتا ہے۔ اس لئے ساری اُمّت کی قسمت اس کے ذریعہ بدل جاتی ہے۔ اس کا لائحہء عمل کچھ ایسا ہوتا ہے جیسے کہ مقناطیس لوہے کے ذرّات کو ترتیب دے دیتا ہے۔ اس طرح کائنات میں توازن بھی برقرار رہتا ہے اور واقعات کا رخ بھی پھر جاتا ہے۔ یہ دل سے چاہنے کی بات ہے۔ باطنی توانائیاں اور شدّتیں' لطافتوں اور مجردات کی صورتوں میں ظہور پذیر ہونے لگتی ہیں۔ اور مادّی پہلوئوں میں ان کا اظہار کچھ لاابدی سا ہو جاتا ہے۔ یہ دل کی چاہ' ارادے کی پختگی' عزم اور ایمان کی بات ہے۔ جب ایک جماعت کے باطن میں یہ اضطراب' یہ ہیجان' یک رُخی اختیار کرلے تو اس کی وجودی شکل کسی نہ کسی مادی انداز میں رُونما ہوگی۔ اور قدرت کے نظامِ توازن میں کوئی فرق بھی نہ آئے گا۔

دُعا کی مقبولیت کی صورتیں

قصہء مختصر' دُعا کی مقبولیت کی صورتیں یہ ہوئیں کہ مخلص یا عاجز' راضی بہ رضا ہو کر ایک توحیدی کیفیت میں ہوتا ہے۔ مرکز وجود ہو کر اس کے قلب سے جو لہریں اُٹھ رہی ہوتی ہیں وہ توانائیاں ایک توحیدی انداز میں عالم وجود میں پھیلتی ہیں۔ یہ توانائیاں اس کے اپنے اندر اور اپنے ارد گرد کے ماحول کو متاثر کئے بغیر رہ نہیں سکتیں کیونکہ ایک توحیدی انداز انہیں نصیب ہے۔ یہ دُعائیں اپنے خلوص' تقویٰ اور عجز کی نسبت سے قبولیت کی وجودی صورت لے کر ذریعہء رحمت بن جاتی ہیں اور جو شدّت اس مخلص عاجز کے اپنے اندر ہے اس کی نسبت سے اثر پذیرِ عالم ہوتی ہے۔

دوسری سطح عاشق کی دُعا ہے۔ عاشق خود دُعا بن کر کارزار عمل میں عمل پیرا ہوتا ہے۔ عاشق عاجز ہوتا ہے۔ وہ ایسی باطنی شدّتوں میں ہوتا ہے کہ اس کے لئے ناممکن کے کوئی معنی نہیں۔ یہ مومن کی دُعا ہوئی۔ اسی توحید کی یک رخی میں وہ ماحول کو متاثر کرتا ہے کائنات اس کی ہم ساز و دم ساز ہو جاتی ہے۔ اور اس کے ہی رنگ میں ماحول کو رنگتی چلی جاتی ہے۔

تیسری سطح آمر کی دُعا ہے۔ آمر خود مُراد بن کر عالم میں عمل پیرا ہوتا ہے۔ اس نے عجز اور عبودیت کی چادر اوڑھ رکھی ہوتی ہے۔ اسی لئے حق کے نشر کا یہی ذریعہ بنتا ہے۔ یہ محبوبیت کی چادر اوڑھ رکھی ہوتی ہے۔ اسی لئے حق کے نشر کا یہی ذریعہ بنتا ہے۔ یہ محبوبیت کی دعا ہو گی۔ اندر بھی محبوبیت ہے باہر بھی۔ نہ نفس کی خود غرضیاں ہیں نہ عشق کا اضطرار' ایک سکون دائم حاصل ہے' جیسا کہ ساکن سمندر۔ اندر باہر ایک ہی کیف ہے۔ اس سکون میں ایک معمولی اِرتعاش بھی ساری سطح سمندر کو مرتعش کر دیتا ہے۔ اس مقام کی دُعا کی مقبولیت سے پہلے ہی ماحول میں مقبولیت ہے۔ اسی لئے تاریخ کا رُخ بدل جاتا ہے۔ یوں لگتا ہے کہ بغیر وجودوں کے اس عالم امکان میں کام نہیں بنتا۔ رُخ دے کر کسی جماعت میں توحید خیال اور پھر اس پر عمل پیرا ہوئے بغیر راستہ نہیں کھلتا۔ یہ اس لئے کہ اللہ کی مرضی کو وجودوں کے ذریعہ ہی عمل پیرا ہونا ہے۔ اور تخلیق کائنات اسی وجودی پیرائے میں ہوئی ہے۔

اسلام کا اب یہی دور کچھ اُوپر کی سطح سے چلا ہے۔ اسلام کا یہ نازک دور ہے۔ عالم اسلام میں ہیجان ہے' آمر کے نکتہ باطن وجود سے ایک لہر اُٹھ کر موجِ بحر بن کر پھیل رہی ہے۔ ایک ہوا سی چل رہی ہے جو زمانے کی تاریخ کا رخ جلد ہی بدل دے گی۔ اس طرح تاریخ انسانی اپنی شاہراہ اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیہِ رَاجِعُونْ پر گامزن ہو گی۔

الغرض تمام دعائوں کی بات شدّتوں کی ہے۔ یوں سمجھیں کہ جب بھی اپنے باطن میں کسی نازک وقت میں شدّتیں کسی طرح آتی ہیں تو اس حالت میں دُعا کے ساتھ اپنے باطن کی بے پناہ قوتیں عمل پیرا ہونے لگتی ہیں۔ قبول کرنے والا اپنے سے دور نہیں۔ اس کے اور ہمارے درمیان برزخ وجودی' وہی تیسری آنکھ' پینل گلینڈ ہے جو نفس' قلب' روح میں ارتعاش لاتا ہے۔ اور شدتیں عطا کرتا ہے۔ ان شدّتوں کی وجودی شکلیں مختلف پیرائیوں میں ظہور پذیر ہوتی ہیں۔ کبھی اپنے وجود تک ہی ان کا تعلق رہتا ہے' اور کبھی ماحول اور زمانے تک کو اثر انداز کر جاتی ہیں۔ جیسی شدّت ویسا مقام ہوتا ہے۔ ان ظہور کی شکلوں کی بھی انتہا نہیں۔ جو جو طریقے بھی دُعا کی مقبولیت کے انسانی فہم میں آسکتے ہیں ان سے بھی بالاتر باتیں ظہور میں آتی ہیں کیونکہ اس بحر وحدت میں اسی حق کی عمل پیرائی ہے جو ہمارے وہم' خیال' گمان سے بالاتر ہے۔ البتہ دُعا کی مقبولیت کا ظہور وجودی صورت میں ہی ہوتا ہے۔ کیونکہ یہاں وجود' دُعا کی مقبولیت ایک ہی توحید میں ہیں۔ اور کائنات کے توازن میں بھی اس نئی ترتیب سے کوئی فرق نہیں آتا اَلآن کَمَا کَانَ (حق تو جیسا تھا' ویسا ہی ہے ظہور کے بعد بھی) تو دعا اور مقبولیت کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ بشرطیکہ دُعا کا مستحق ہو' دعا بے لوث ہو' خلوص کے ساتھ ہو' عشق کا شدتوں میں ہو' آمر کے مقام سے ہو' عجز کے پیرایہ میں ہو' نکتہ باطن وجود اور عبودیت کے مقام سے ہو۔ پھر جو چاہا وہ ہوا۔ ایک عبد عاجز کے سجدہ سے کائنات میں ارتعاش آیا۔ لہٰذا اُدْعُونِیْ اَسْتَجِبْ لَکُمْ (مجھے پکارو قبول کرونگا) کا یہ مقام تو ہو کہ دینے والا بھی اس مانگنے پر فدا ہو جائے اور سب کچھ ہی دے دے۔

اَللّٰھُمَّ مَا مَنَنتَ بِہٖ عَلَیَّ فَاَتْمِمْہُ

اے اللہ تو نے جو احسان مجھ پر کیا ہے اس کو کامل کر

وَمَا اَنْعَمْتَ بِہٖ عَلَیَّ وَلَا تَسْلُبْہُ

اور جو انعام تو نے مجھ پر کیا ہے اس کو سلب نہ کر

مَا سَتَرْتَہٗ فَلَا تَھْتِکْہُ

اور جو پردہ ڈھانپا اس کا اظہار نہ کر

وَمَا عَلِمْتَہٗ فَاغْفِرْہُ

میرے متعلق جو تیرے علم میں ہے، پس اس کو بخش دے۔

(غوثِ پاکؒ کی دُعا)